NUST

افتتاحی شمارہ

نسٹیئن

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلہ

نسٹیئن

افتتاحی شمارہ

2010ء -2011ء

نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی کا ادبی مجلّہ

سرپرست

انجینئر محمد اصغر

ریکٹر

مجلسِ مشاورت

انجینئر محمد مشتاق

پرو ریکٹر

ڈاکٹر آصف رضا

پرو ریکٹر

ڈاکٹر صفدر علی شاہ

ڈائریکٹر ایکیڈیمکس

ایڈیٹر

ممتاز اقبال ملک

سٹوڈنٹ اسسٹنٹ ایڈیٹرز: اُسامہ حسن - محمد حسیب لطیف - نوید انجم

گرافکس: خالد بن مجید کمپوزنگ: قاری عطاء الرحمٰن

پبلشر: **نسٹ پبلی کیشنز آفس** پرنٹر: **نسٹ پریس**

پڑھنے/ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے: www.nust.edu.pk/pages/downloads.aspx [Then click THE NUSTIAN]

ترتیب

گوشۂ رحمت

مثالی زندگی	رملہ کریم قریشی	SCEE	11
ہدیۂ عقیدت	تنویر جعفری		13
خواتین پر اسلام کے احسانات	سمیرا بتول ٹوانہ	College of E&ME	17
غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کا برتاؤ	قمر علی	PNEC	23

گوشۂ آزادی

خونِ صد ہزار انجم	نسرین کوثر		31
کشمیر: نامکمل ایجنڈا	حُر رضا	College of E&ME	40

گوشۂ قیادت

روحِ قائدؒ سے مکالمہ			47
یہ ہیں قائدِ اعظمؒ	حمیرا گُل محسود	IESE	58
ملّت کا اقبالؒ	اُسامہ حسن	SCME	67
سرسیّد احمد خانؒ	حسیب لطیف	SEECS	73

گوشۂ وطن

پرچمِ ستارہ و ہلال			81

ہماری وادیاں، ہمارے پہاڑ	سید عثمان حیدر	MCS	86
نشانِ عزت	سید محمود احمد		173
گوشۂ ادب			
ادب کیا ہے؟			97
غالب اور قبولِ عام	حسیب لطیف	SEECS	101
آتی ہے اُردو زباں آتے آتے			106
گوشۂ علم			
انتخاب			113
گلوبل وارمنگ	ابرار حسین	SCEE	119
چین کی قدیم حکایات	اُسامہ حسن	SCME	124
گوشۂ تحقیق			
عالمی معاشی بحران	عبداللہ مسعود	NBS	131
نوبل پرائز	بابر مشتاق	MCS	136
ٹکٹ کہانی	سفیان ناصر خان	PNEC	139
متفرقات			145
گوشۂ خیال			
نوعِ انسانی کا فکری ارتقاء	نوید انجم	College of E&ME	153
کاغذی کارروائی	حامد افتخار	SCME	157

کتنا قیمتی ہُوں مَیں	خُرم مراد	MCS	160
گوشۂ داستاں			
جلاوطن	عثمان خاور	SEECS	165
پہچان	فرح اسلم	MCS	169
مولا شُکر ہے تیرا	اختر جمال	College of E&ME	174
ماں	ابیہا مسعود	NBS	180
گوشۂ ظرافت			
مشاعرہ آن لائن	قندیل رحمٰن	SEECS	185
بجلی سے ملاقات	امجد انصاری	PNEC	193
بہن بھائیوں کی باتیں	مدیحہ بشیر	MCS	195
انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اہلِ دل	گُل بہادر یوسفزئی		198
گوشۂ نسٹیات			
نسٹیئن پول			203
نسٹیئن قاعدہ	عون سید	SCME	209
نسٹیئن بیاض			210
نسٹیئن میل			212
نسٹینی آرٹ اور اقبالؔ و غالبؔ	قندیل رحمٰن	SEECS	214
نسٹائی لکیریں	جویریہ نصیر	SEECS	216

ہمارے اِدارے

کالج آف الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ	College of E&ME
ملٹری کالج آف انجینئرنگ	MCE
ملٹری کالج آف سگنلز	MCS
پاکستان نیوی انجینئرنگ کالج	PNEC
آرمی میڈیکل کالج	AM College
کالج آف ایرونا ٹیکل انجینئرنگ	CAE
سکول آف سِول اینڈ انوائرمنٹل انجینئرنگ	SCEE
سکول آف الیکٹریکل انجینئرنگ اینڈ کمپیوٹر سائنس	SEECS
سکول آف کیمیکل اینڈ مٹیریلز انجینئرنگ	SCME
سکول آف میکینکل اینڈ مینوفیکچرنگ انجینئرنگ	SMME
نَسٹ بزنس سکول	NBS
نَسٹ سینٹر آف وائرولوجی اینڈ ایمیونولوجی	NCVI
ریسرچ سینٹر فار ماڈلنگ اینڈ سیمولیشن	RCMS
سینٹر فار اپلائیڈ میتھے میٹکس اینڈ فزکس	CAMP
پروفیشنل ڈیویلپمنٹ سینٹر	PDC
ٹیکنالوجی انکیوبیشن سنٹر	TIC
نسٹ انسٹیٹیوٹ آف پیس اینڈ کانفلکٹ سٹڈیز	NIPCONS
سکول آف آرٹ، ڈیزائن اینڈ آرکی ٹیکچر	SADA

''دی نسٹین'' میں اشاعت کے لئے اساتذہ اور موجودہ و فارغ التحصیل طلبہ اپنی تخلیقات براہِ راست اس پتے پر بھیج سکتے ہیں:

ایڈیٹر دی نسٹین

سٹوڈنٹ سینٹر، نیشنل یونیورسٹی آف سائنسز اینڈ ٹیکنالوجی، H-12 اسلام آباد

فون : 051-90851363 فیکس : 051-90851362

موبائل : 0321-5851363 ای میل : nustian@nust.edu.pk

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان اور پاکستانی ایک بار پھر آزمائش در آزمائش سے دوچار ہیں۔اس سے بھی زیادہ سنگین آزمائشیں قیامِ پاکستان کے بعد ہی سے ہمارا امتحان لیتی آ رہی ہیں‘اس لئے یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔

حادثات‘ خطرات‘ ارضی و سماوی آفات‘ امتحان‘ نقصان‘ شورشیں اور اندرونی و بیرونی سازشیں دنیاوی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ہر قوم کو کسی نہ کسی صورت میں کبھی نہ کبھی ان کا سامنا رہتا ہے‘ لیکن ربِّ کریم نے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قوتِ مدافعت‘ استعدادِ مزاحمت اور گر کر‘ اُٹھ کر پھر سے رواں دواں ہونے کا جو جذبہ پاکستان کو عطا کیا ہے‘ اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔

پہاڑ‘ گلیشیئرز‘ میدان‘ جنگل‘ صحرا‘ دریا‘ سمندر‘ آبِ حیات‘ زیرِ زمیں و برسرِ زمیں ہمہ نوع معدنیات اور وسائلِ توانائی بلکہ سورۃ الرحمٰن میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے کون سی ایسی نعمت ہے جو پاکستان میں نہیں اور دنیا کا کون سا ملک ہے جس میں یہ سب کچھ موجود ہے۔اس کا محلِ وقوع دنیا کی آنکھوں سے اوجھل ہی نہیں سکتا۔ غیر معمولی اہمیت کا حامل اور اس کی سلامتی کا ضامن۔وسطی ایشیا کا دروازہ اور مشرقِ وسطیٰ و مشرقِ بعید کا محور!

اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو بہترین تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال بشری توانائی سے نوازا ہے۔ پاکستان کے بیٹے اور بیٹیاں اپنی لیاقت کے بل پر دنیا کے ہر کونے میں علم کے ہر آسمان پر پاکستان کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی عالمی درسگاہیں اور اَسرار کُشا لیبارٹریاں پاکستانی اساتذہ‘ طلبہ اور صاحبانِ ایجاد کے بغیر ادھوری اور بے معنی ہیں۔ایک لمحے کے لئے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے باب پر رُکتے ہیں: ناقابلِ یقیں رکاوٹوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان زندگی کی چونسٹھ منزلیں طے کر چکا ہے۔یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ سمیت تمام ترقی یافتہ ممالک نے چونسٹھ برس میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر وہ عبور حاصل نہیں کیا اور نہ اس مقام پر چونسٹھ برس میں پہنچے جہاں ماشاءاللہ آج پاکستان کھڑا ہے۔اللہ تعالیٰ کی مدد سے جدید ترین سائنسی مہارت رکھنے والے پاکستانیوں کی حیران کُن محنت اور اہلِ اختیار کی مضبوط قوتِ ارادی کی بدولت پاکستان چند برس ہی میں ایٹمی طاقت بن کر اُبھرا۔

کوئی کہاں سے ہمسر لائے گا پاکستان کا!

یہ اعزاز اور اَن گنت کامرانیاں دشمنوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہیں۔ فتنے، فساد، نت نئی افواہوں، بدگوئیوں کا سلسلہ اور وحشت و دہشت کا روز افزوں دھندا اہلِ پاکستان کو اضطراب اور دباؤ میں مبتلا کر کے ترقی و خوشحالی کا سفر روکنے ہی کا سامان تو ہے۔ ان حالات میں ہمیں — خاص طور پر نوجوانوں کو — چوکنّا اور ہشیار رہنا ہے، مایوس ہرگز نہیں ہونا۔ قرآنِ مجید نے شیطانوں کے سردار کو ابلیس کا لقب دیا ہے اور ابلیس کے معنی ہیں مایوسی کا عَلَم بردار۔ پاکستانی ٹیلنٹ نے دنیا کی آنکھیں چُندھیا دیں اور دشمن کو خوفزدہ کر رکھا ہے۔ دشمن کا نشانہ یہی ٹیلنٹڈ نوجوان ہیں۔ انہیں اپنے وطن اور ان کے مستقبل سے مایوس کرنے کا کاروبار ہر ذریعے سے جاری ہے۔ ربِ کریم کے کرم پر کامل بھروسے اور پاکستان پر رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ عنایت کے ناقابلِ تردید ثبوت کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک زیرِ تعلیم پاکستانی طلبا و طالبات سے یہ بات دعوے سے کہی جا رہی ہے کہ جتنے مواقع اُن کے لیے پاکستان میں میسر ہیں اور ان شاء اللہ تعالیٰ بہت تھوڑے عرصے میں مزید پیدا ہونے والے ہیں، دنیا بھر کے کسی ملک میں اِن کے لیے بلکہ خود اُن ممالک کے اپنے نوجوانوں اور طلبا کے لیے نہیں ہیں، اس لئے وہ اپنی توجہ کا مرکز پیارے پاکستان ہی کو قرار دیں۔

ہم جو کچھ ہیں اور جہاں بھی ہیں، اپنا فرض پوری ذمہ داری اور کامل دیانتداری سے ادا کریں اور نوجوان، بطورِ خاص طلبہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی نصیحت ''کام، کام اور کام'' کی روشن عملی تصویر اور کھلی تفسیر بن کر خود کو ندرتِ فکر و عمل کے اقبالی جوہر سے لَیس کر لیں، تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مشکلیں دُور اور منزلیں قریب آ جائیں گی۔ اور یہ ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ حکیم الامت علامہ اقبالؒ ہی ہمیں بتا رہے ہیں:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب!
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملّت کا شباب!

ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب!

گوشۂ رحمت

مثالی زندگی

رملہ کریم قریشی

حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ بدر کے لئے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کے پاس سواری کے جانور بہت کم تھے۔ ہر تین آدمیوں کے پاس ایک اونٹ تھا۔لوگ باری باری اس پرسوار ہوتے۔رسول اکرمؐ بھی اپنی باری سے اونٹ پرسوار ہوتے اور پھر اُتر کر پیدل چلنے والوں کے ساتھ شریک ہو جاتے۔ صحابہؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہؐ آپ اونٹ پرتشریف رکھیں' پیدل چلنے کی تکلیف گوارانہ فرمائیں۔'' آپؐ نے فرمایا:''میں تم سے کم پیدل نہیں چل سکتا اور نہ تم سے کم ثواب کامحتاج ہوں۔''(طبقات ابنِ سعد)

ہجرت کے بعد پہلے مسجدِ قباءاور پھر مسجدِ نبوی(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تعمیر ہوئی تو آپؐ نے ان کی تعمیر میں عام لوگوں کی طرح حصہ لیا۔آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر گارا اٹھاتے اور دیواریں بناتے تھے۔صحابہ کرامؓ عرض کرتے کہ یارسول اللہؐ آپ رہنے دیجئے ہم خود یہ کام کرلیں گے' لیکن آپؐ فرماتے' نہیں میں تمہارے شانہ بشانہ اس کام میں حصہ لوں گا۔اسی طرح جنگِ خندق کے موقع پر آپؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ مل کر خندق کھودتے تھے۔جسمِ اطہر گرد وغبار سے اَٹ جاتا اور تھکن سے چُور چُور ہو جاتے' لیکن اس حال میں بھی کام جاری رکھتے' حالانکہ اردگرد سینکڑوں جانثار موجود ہوتے جو آپؐ سے بار بار کام چھوڑنے کی استدعا کرتے۔(مسلم)

ایک مرتبہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر میں تھے' جوتوں کا تسمہ ٹوٹ گیا۔آپؐ اُسے درست کرنے لگے تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا:''یا رسولَ اللہ لائیے میں ٹانک دوں۔'' آپؐ نے مسکرا کر فرمایا:''نہیں تشخص پسندی مجھے محبوب نہیں ہے۔'' چنانچہ آپؐ نے خود تسمہ ٹانکا۔(ابنِ عساکر)

ایک مرتبہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے۔راستے میں ایک مقام پر بکری ذبح کرنے اور پکانے کی تجویز ہوئی۔صحابہ کرامؓ نے آپس میں کام بانٹ لئے۔ ایک صحابیؓ نے کہا' میں اسے ذبح کروں گا' دوسرے نے کہا میں اس کا گوشت بناؤں گا'

تیسرے نے کہا میں اسے پکاؤں گا۔ رسولِ پاکؐ نے فرمایا میں جنگل سے لکڑیاں لاؤں گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان' آپ تشریف رکھئے' ہم سب کام کرلیں گے۔'' آپؐ نے فرمایا:'' مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز کروں۔'' (زرقانی)

ایک دفعہ حضرت خبابؓ بن الاَرت مدینے سے دُور ایک جنگی معرکے پر تشریف لے گئے۔ ان کے گھر میں کوئی اور مرد نہیں تھا اور عورتیں دودھ دوہنا نہیں جانتی تھیں۔ آپؐ کو معلوم ہوا تو بنفسِ نفیس ہر روز حضرت خبابؓ کے گھر تشریف لے جاتے اور ان کے جانوروں کا دودھ دوہ دیا کرتے۔ (ابنِ سعد)

ایک دفعہ ایک بدو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وقت آپؐ موٹے کنارے کی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اس نے چادر کے گوشے کو پکڑ کر اس زور سے کھینچا کہ چادر کا کنارہ آپؐ کی گردن مبارک میں کُھب گیا اور اس میں نشان پڑ گئے۔ پھر اس نے کہا:'' محمد میرے یہ دو اونٹ ہیں' ان پر لادنے کے لئے مجھے سامان دو' کیونکہ تیرے پاس جو مال ہے وہ نہ تیرا ہے' نہ تیرے باپ کا ہے۔'' آپؐ نے تحمل سے فرمایا:'' مال تو اللہ کا ہے اور میں اس کا بندہ ہوں۔'' پھر آپؐ نے پوچھا:'' تم نے جو سلوک میرے ساتھ کیا ہے' کیا تم اس پر ڈرتے نہیں ہو؟'' بدو نے کہا: ''نہیں۔'' رسولِ پاکؐ نے فرمایا:'' کیوں؟'' اُس نے کہا: '' مجھے یقین ہے کہ تم بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے۔'' حضورؐ متبسم ہو گئے اور اس کے ایک اُونٹ پر کھجوریں اور دوسرے پر جَو لدوا دیئے۔ (ابوداؤد)

ایک دفعہ ایک بدو بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہوا اور نبیِ کریمؐ سے کچھ مانگا' آپؐ نے عطا فرمایا اور پوچھا:'' اب خوش ہو۔'' وہ درشتی سے بولا:'' نہیں تم نے میرے ساتھ کچھ بھی سلوک نہیں کیا۔'' حضرت عمر فاروقؓ اس کے لہجے پر تڑپ اٹھے' قریب تھا کہ اسے قتل کر دیتے' لیکن اللہ کے رسولؐ نے اشارے سے منع فرما دیا اور پھر گھر سے کچھ لا کر اسے دیا۔ اب وہ خوش ہو گیا اور دعائیں دینے لگا۔ آپؐ نے نہایت محبت سے فرمایا:'' تیرا پہلا کام میرے ساتھیوں کو بُرا معلوم ہوا۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ ان کے ساتھ بھی یہی کلمات ادا کروں جو اَب کہہ رہے ہو۔ اس طرح ان کے دل بھی تیری طرف سے صاف ہو جائیں گے۔'' اس نے کہا' میں کہہ دوں گا۔ دوسرے دن آپؐ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے اس سے سوال کیا کہ اب تو تم مجھ سے خوش ہو؟ اس نے کہا' بے شک اور پھر دعا دی۔ آپؐ نے فرمایا:'' ایک شخص کی اونٹنی بھاگ گئی۔ لوگ اس کے پیچھے بھاگتے تھے اور وہ آگے آگے بھاگتی تھی۔ مالک نے دوسرے لوگوں سے کہا' تم سب رُک جاؤ۔ یہ میری اونٹنی ہے اور میں ہی اسے سمجھتا ہوں۔ لوگ ہٹ گئے۔ اونٹنی ایک جگہ رُک کر گھاس چرنے لگی۔ مالک نے اسے پکڑ کر کاٹھی ڈال دی۔ اُس بدو کی مثال ایسی ہی تھی' تم اسے قتل کر ڈالتے' تو بے چارہ جہنم میں جاتا۔'' (کتاب الشفاء۔ قاضی عیاض)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی لختِ جگر حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بے حد محبت تھی۔ وہ آتیں تو حضورؐ کھڑے ہوکر ان کی پیشانی کو چوم لیتے، لیکن ان کا یہ حال تھا کہ تنگ دستی کی وجہ سے چکی پیستی تھیں، یہاں تک کہ ہاتھوں پر چھالے پڑ جاتے۔ خود ہی پانی بھرتیں اور گھر کے دوسرے کام کاج بھی انجام دیتیں۔ ایک دن وہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے ہمراہ حضورِ اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور ان کی معرفت عرض کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں، اُن سے ایک کنیز مجھے عنایت ہو۔ حضورِ اقدسؐ نے فرمایا: ''ابھی تک اصحابِ صفہ کا کوئی انتظام نہیں ہوا، وہ بیچارے مصیبت میں ہیں۔ جب تک ان کا انتظام نہ ہو جائے تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔'' (سننِ ابوداؤد)

حضرت زید بن سعنہ پہلے یہودی تھے۔ ایک مرتبہ رسولِ اکرمؐ نے ایک قحط زدہ گاؤں کے لوگوں کی مدد کے لئے اُن سے کچھ رقم قرض لی اور ایک خاص مدت کے بعد کھجوروں کی صورت میں اس کی واپسی کا وعدہ کیا۔ زید یومِ وعدہ سے تین دن پہلے آ گئے اور قرض کی واپسی کے لئے شدید تقاضا کیا، یہاں تک کہ آپؐ کی چادر مبارک جسمِ اطہر سے کھینچ لی اور گستاخانہ جملے بولے۔ اس وقت حضرت عمر فاروقؓ بھی وہاں موجود تھے۔ زید کی گستاخی پر غصے سے بے تاب ہو گئے اور تلوار کھینچ کر زید سے کہنے لگے: ''او دشمنِ رب، تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟'' رسولِ اکرمؐ نے متبسم ہوکر فرمایا: ''عمر تمہیں لازم تھا کہ اسے جھڑکنے کے بجائے محبت سے سمجھاتے کہ نرمی سے کام لے اور مجھ سے اس کا قرض ادا کرنے کے لئے کہتے۔'' پھر آپؐ نے زید سے فرمایا کہ ابھی وعدے میں تین دن باقی ہیں، لیکن خیر میں تمہارا قرض ادا کئے دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اس کا

مصطفیٰؐ ، مجتبیٰؐ حضورؐ کا نام
مظہرِ کبریا حضورؐ کا نام

کہیں یٰسین کہہ کے ذکر کیا
کہیں طٰہٰ ہُوا حضور کا نام

میری سب مشکلیں ہوئیں آساں
میں نے جب بھی لیا حضورؐ کا نام

دستِ قدرت نے لوحِ ہستی پر
سب سے پہلے لکھا حضورؐ کا نام

لب پہ جاری ہُوا درود و سلام
جب بھی میں نے لیا حضورؐ کا نام

ہر زمانے کی ظلمتوں کے لئے
روشنی بن گیا حضورؐ کا نام

مُشک آگیں ہُوا مشامِ جاں
ذہن میں آگیا حضورؐ کا نام

میرے لب پر کھلے درود کے پھول
جب بھی میں نے سنا حضورؐ کا نام

کاش تنویر روزِ محشر بھی
ہو وظیفہ میرا حضورؐ کا نام

— تنویر جعفری

قرض ابھی ادا کردو اور بیس صاع کھجوریں زیادہ بھی دینا' کیونکہ تم نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلم وتحمل نے زید کو اسلام کی طرف مائل کردیا اور وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ (مستدرک حاکم)

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر خیال تھا کہ اس میں اپنے بیگانے' غیر مسلم یا مسلم' چھوٹے یا بڑے کسی میں تخصیص نہیں فرماتے تھے۔ کسی کی بیماری یا موت کی خبر سنتے تو دل بھر آتا اور فوراً اس کی عیادت یا تعزیت کے لئے تنہا یا صحابہ کرامؓ کے ہمراہ تشریف لے جاتے۔ ایک یہودی لڑکا آپؐ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بیمار پڑا تو آپؐ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھ گئے۔ اسے تسلی دی اور فرمایا: ''بیٹے اسلام قبول کرلے۔'' وہ باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ باپ یہودی تھا' لیکن حضورؐ کے حُسنِ اخلاق سے متاثر ہوکر کہنے لگا: ''بیٹے ابوالقاسم کی بات مان لے۔'' چنانچہ لڑکا اسی وقت کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوگیا۔ حضورِ اقدسؐ نے فرمایا: ''اس اللہ کی حمد جس نے اسے آتشِ جہنم سے بچالیا۔'' پھر وہاں سے تشریف لے آئے۔ اس کے والد نے بھی رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔ (مستدرک حاکم)

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر چند چھوٹے چھوٹے حجروں پر مشتمل تھا۔ انہی میں ازواجِ مطہراتؓ رہتی تھیں۔ ہر حجرے کی وسعت تین سے ساڑھے تین گز کے قریب تھی۔ ان کی اونچائی اتنی تھی کہ آدمی کھڑا ہوکر ہاتھ بلند کرتا' تو چھت کو چھو جاتا۔ حجروں کی دیواریں مٹی کی تھیں اور ان پر کھجور کے پتوں اور ٹہنیوں کی چھت تھی۔ ان حجروں کے ساتھ نہ کوئی صحن تھا اور نہ دالان۔ مٹی کی دیواروں میں بعض اوقات شگاف پڑ جاتے تھے جن سے دھوپ اندر آتی تھی۔ بارش میں حجروں کے گرد کمبل لپیٹنے پڑتے تھے تاکہ پانی اندر نہ آئے۔ ہر حجرے کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ یا ایک پٹ کا دروازہ تھا۔ ان حجروں کے علاوہ ایک معمولی سا بالاخانہ تھا جس کی کُل کائنات یہ تھی: ایک بستر' ایک تکیہ جس میں چھال بھری ہوئی تھی' ایک چارپائی' ایک چٹائی' ایک یا دو مشکیزے' دو مٹکے' ایک گھڑا اور ایک پیالہ۔ (صحیح بخاری)

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر بھیڑ کی کھال کے بنے ہوئے موٹے کپڑے پہنتے۔ ایک دفعہ کسی نے ریشم کا شلوکہ نذر کیا' آپؐ نے (تحفہ دینے والے کی دلداری کی خاطر) پہن لیا اور نماز ادا فرمائی' پھر اتار دیا اور فرمایا: ''پرہیزگاروں کے لئے یہ لباس مناسب نہیں۔'' (بخاری)

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی کپڑا کبھی تہہ کرکے نہیں رکھا گیا۔ یعنی آپؐ کے پاس کپڑوں کا صرف ایک جوڑا تھا' دوسرا نہیں تھا جو تہہ کرکے رکھا جاتا۔ (ابنِ ماجہ)

ایک دفعہ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بوریئے پر سو رہے تھے' اُٹھے تو جسمِ اطہر پر بوریئے کے نشان پڑ گئے تھے۔

صحابہؓ نے عرض کیا' یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو ہم گدا بنوا کر پیش کریں۔ حضورؐ نے فرمایا: ''مجھے دنیا سے کیا کام؟ میرا تو دنیا سے صرف اتنا تعلق ہے جیسے کوئی سوار تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جائے اور پھر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔'' (جامع ترمذی)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو آپؐ کی سواری کا کجاوہ چار درہم سے زیادہ کا نہ تھا۔ (ابنِ سعد) ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر آپؐ جو چادر اوڑھے ہوئے تھے اس کی قیمت چار درہم تھی۔ آپؐ کے خادم حضرتِ انسؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ بالعموم جَو کی روٹی کھاتے تھے۔ یہ روٹی ایسے موٹے آٹے کی ہوتی تھی کہ پانی کے گھونٹ کے بغیر حلق سے نیچے نہ اترتی تھی۔ آپؐ کے لئے کبھی پتلی چپاتی نہ پکائی گئی۔ (ترمذی۔ابنِ ماجہ)

جب عرب' یمن' بحرین وغیرہ مسخّر ہو چکے تو اموالِ غنیمت اور محاصل کی بھرمار تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ حضورِ پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ سیدالعرب والعجمؐ کے جسم پر صرف ایک تہبند ہے۔ سخت بان سے بُنی ہوئی چارپائی ہے۔ سرہانے ایک تکیہ پڑا ہے جس میں خرمے کی چھال بھری ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے ہیں۔ کھونٹی پر مشکیزہ کی کھالیں لٹک رہی ہیں اور جسم مبارک پر چارپائی کے بان کی بدھیاں پڑ گئی ہیں۔ حضورؐ کی یہ حالت دیکھ کر حضرت عمر فاروقؓ اشکبار ہو گئے۔ آپؐ نے سبب پوچھا تو عرض کی: ''یارسول اللہ' یہ آپ کا گھر ہے اور یہ اس کا سامان' قیصر و کسریٰ تو دنیا کے مزے لوٹیں اور اللہ کے برگزیدہ رسولؐ کے گھر کا یہ حال ہو۔'' حضورؐ نے فرمایا: ''اے ابنِ خطاب! کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ دنیا لیں اور ہم آخرت۔'' (صحیح مسلم)

ایک رات مدینہ والوں کو کچھ خوف پیدا ہوا اور لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے کہ دیکھیں کیا ہے۔ وہاں دیکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن سے پہلے اس مقام پر موجود تھے جہاں خطرے کا امکان تھا۔ آپؐ ابوطلحہؓ کے گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار تھے اور تلوار کندھے پر لٹک رہی تھی اور آپؐ یہ فرما کر لوگوں کو تسلی دینے لگے: ''مت گھبراؤ' مت گھبراؤ''۔ (زرقانی)

حضرت ابوہریرہؓ بتاتے ہیں کہ میں حضورِ اکرمؐ کے ساتھ

جنگِ بدر کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ انہیں ایک ایک مجاہد کی اشد ضرورت تھی۔ حذیفہ بن الیمانؓ اور ابو حسیلؓ دو صحابی رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہم مکہ سے آرہے ہیں۔ کفار نے ہمیں گرفتار کر لیا تھا اور اس شرط پر رہا کیا ہے کہ ہم لڑائی میں آپؐ کا ساتھ نہ دیں گے' لیکن یہ مجبوری کا عہد تھا' ہم کفارِ مکہ کے خلاف لڑیں گے۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ تم اپنا وعدہ پورا کرو اور میدانِ جنگ میں واپس چلے جاؤ۔ ہم (مسلمان) ہر حال میں وعدہ پورا کرنے والے ہیں۔ ہمیں صرف اللہ کی مدد کی ضرورت ہے''۔ (صحیح مسلم)

بازار آیا۔ حضورؐ نے ایک پاجامہ چار درہم میں خریدا۔ حضورؐ نے وزن کرنے والے سے فرمایا کہ اپنے مال کو خوب خوب کھینچ کر تولو (یعنی وزن میں کم یا برابر نہ لو بلکہ زیادہ لو۔ غالباً اس وقت کپڑا تول کر فروخت ہوتا تھا) وزن کرنے والا حیران ہوکر بولا کہ مَیں نے کسی کو قیمت کی ادائیگی میں ایسا کہتے نہیں سنا۔ اس پر ابو ہریرہؓ نے کہا افسوس ہے تجھ پر کہ تو نبی کریمؐ کو نہیں پہچانتا۔ وہ شخص ترازو کو چھوڑ کر کھڑا ہوگیا اور حضورِ اقدسؐ کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا۔ آپؐ نے اپنا دستِ مبارک کھینچ کر فرمایا: ''یہ عجمیوں کا دستور ہے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور سربراہوں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں، میں بادشاہ نہیں ہوں۔'' اس کے بعد حضورِ اقدسؐ نے پاجامہ اٹھالیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آگے بڑھ کر ارادہ کیا کہ پاجامہ اٹھالوں، مگر آپؐ نے فرمایا کہ سامان کے مالک ہی کا فرض ہے کہ وہ اپنے سامان کو اٹھائے، مگر وہ شخص جو کمزور ہے اور اٹھا نہ سکے تو مسلمان کو اپنے اس بھائی کی مدد کرنا چاہئے۔ (مدارج النبوۃ)

ایک دفعہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے۔ اتفاق سے رسولِ اکرمؐ موقع پر تشریف لائے۔ آپؐ نے رنجیدہ ہوکر فرمایا: ''ابو مسعودؓ! اس غلام پر تمہیں جس قدر اختیار ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ اختیار ہے۔'' حضرت ابو مسعودؓ حضورِ پاکؐ کا ارشاد مبارک سن کر تھرا اُٹھے اور عرض کیا: ''یارسولؐ اللہ! اس غلام کو اللہ کی راہ میں آزاد کرتا ہوں''۔ حضورِ اقدسؐ نے فرمایا: ''اگر تم ایسا نہ کرتے تو دوزخ کی آگ تمہیں بھون ڈالتی۔'' (ابوداؤد)

میاں محمد تھے خاں 1871ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ صلوٰۃ وسلامؑ عبادت اور ریاضت کی وجہ سے حُبِ نبیؐ سے اندر باہر مہک اُٹھا۔ تھے خاں بمبئی پہنچے جہاں سے حاجی سفرِ حج کیلئے روانہ ہوتے تھے۔ جدّہ تک سفر بحری جہاز سے کیا، وہاں سے پیدل مکہ مکرمہ پہنچے۔ حج کے بعد غارِ حرا میں 40 دن بسر کیے۔ اُنہی دنوں بارش برسی، پہاڑی پر نچلی جگہوں پر پانی جمع ہوگیا۔ میاں تھے خاں اُس سے وضو کرتے اور پیاس بجھاتے۔ اندرونی روشنی کے بعد جو چلّہ سے نصیب ہوئی، دیارِ حبیبؐ کی جانب روانہ ہوئے۔ اُن دنوں قافلے بیئرِ علیؓ پر جو مدینہ منورہ سے 9 میل کے فاصلے پر ہے، رُک جاتے، ادب کے پیشِ نظر پیدل آگے بڑھتے۔ محمد تھے خاں بھی وہاں سے پیدل چلتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے۔ ایک گلی کے نکڑ پر اپنا سامان رکھا اور ٹھکانے کی تلاش میں نکلے۔ تھکے ہوئے تھے، ایک مکان کی سیڑھیوں پر ستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ یہ ایک تُرک کا مکان تھا جو اس طرح تعمیر کیا گیا تھا کہ ہر کمرے سے گنبدِ خضریٰ نظر آتا۔ تُرک باہر آیا، میاں تھے خاں کا حال احوال پوچھا اور یک دم کہا: کیا آپ یہ مکان خریدنے کے لیے تیار ہیں؟ تھے خاں حیران رہ گئے۔ جیب میں جو چند سکّے تھے، وہ دکھا کر پوچھا کہ ان چند سکوں سے بھلا یہ مکان خریدا جا سکتا ہے؟ تُرک میاں صاحب کو دفترِ بیع لے گیا اور مکان ان کے نام ہبّہ (تحفۃً پیش) کر دیا۔ میاں تھے خاں ایک شب حضورِ اکرمؐ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ آپؐ نے ایک خط عطا کیا اور فرمایا اسے ملک عبدالعزیز (بادشاہِ سعودی عرب) کو پہنچا دو۔ آنکھ کھلی تو ہاتھ میں ایک سفید ورق تھا۔ اسے تہہ کر کے جیب میں رکھا اور صبح دم مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ چند منزلیں طے کی تھیں کہ سامنے سے بادشاہ کا قافلہ آتا دکھائی دیا۔ ایک سوار نے آ کر پوچھا: کیا تم میں محمد نام کا کوئی شخص ہے؟ محمد تھے خاں آگے بڑھے، سوار انہیں بادشاہ کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے اُن سے کہا کہ رسولِ اکرمؐ نے تمہیں جو خط دیا ہے، مجھے دو۔ بادشاہ نے خط مبارک وصول کرنے کے بعد کہا کہ آپ مدینہ منورہ واپس چلے جائیں اور شہر میں بجلی کی تنصیب و ترسیل کا کام شروع کر دیں، عملہ اور بجلی کا سامان بھیجا جا رہا ہے۔ یوں دیارِ حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گلیوں میں روشنی کا کام ان کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ بادشاہ نے معقول ماہانہ مقرر کر دیا۔ گھر پہلے مل چکا تھا، ضروری اخراجات کا بندوبست بھی ہوگیا۔ باقی ماندہ زندگی گنبدِ خضریٰ کے سائے میں بسر کی اور جنت البقیع میں دفن ہونے کی سعادت پائی۔ میاں عبدالرشید: نورِ بصیرت، نوائے وقت، لاہور)

خواتین پر اسلام کے احسانات

سمیرا بتول ٹوانہ

ظہورِ اسلام سے پہلے ہر تہذیب اور ہر معاشرے نے عورت کو اس کے جائز تمدنی' اخلاقی' معاشرتی اور معاشی حقوق سے محروم رکھا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں جو حالت تھی' اس کا نقشہ قرآن مجید نے سورۃ نحل کی آیات 58' 59 میں اس طرح کھینچا ہے:

''جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے' تو اس کا منہ سرخ ہو جاتا اور وہ غصے میں بھر جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لیے رہے یا مٹی میں دبا دے۔''

اسلام نے بیٹی کی پیدائش کو رحمت و برکت کا ذریعہ قرار دیا اور ان تمام تصوّرات اور جاہلانہ خیالات کی جڑیں اُکھیڑ دیں' جن کے تحت عورت کی ذات اور اس کی شخصیت کو ذلت وخواری کا منبع قرار دیا جاتا تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ جب کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاں فرشتے بھیجتا ہے جو کہتے ہیں کہ اے گھر والو! تم پر سلامتی ہو۔ وہ لڑکی کو اپنے پروں کے سائے میں لے لیتے ہیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ناتواں جان ہے جو ایک ناتواں جان سے پیدا ہوئی ہے۔ جو اس بچی کی پرورش کرے گا' اللہ تعالیٰ کی مدد قیامت تک اس کے شاملِ حال رہے گی۔ (طبرانی)

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک عورت کچھ مانگنے کے لئے آئی۔ اس کے ساتھ دو بچیاں تھیں۔ اس وقت میرے پاس ایک کھجور کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہی میں نے اسے دے دی۔ اس نے یہ کھجور اپنی دونوں بچیوں میں تقسیم کر دی' خود کچھ نہ کھایا اور اُٹھ کر چلی گئی۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر تشریف لائے تو میں نے اس عورت کا واقعہ بیان کیا کہ باوجود بھوکی ہونے کے اس نے خود پر بچیوں کو ترجیح دی۔ یہ سن کر آپؐ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ جو کوئی لڑکیوں کے بارے میں آزمایا جائے' یعنی اس کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوں اور پھر وہ ان سے اچھا سلوک کرے' تو یہ لڑکیاں اس کے لئے دوزخ کی آگ سے ڈھال

بن جائیں گی۔(بخاری)

جس طرح ایک بچی کی پیدائش رحمتِ خدا وندی کی بشارت لے کر آتی ہے اور اس کی خوش دلی سے پرورش والدین کے دوزخ کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بن جاتی ہے اس کی حسبِ مقدور تعلیم وتربیت بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی خوش خبری لے کر آتی ہے اور ایک بچی کے والدین کو اطمینان دلاتی ہے کہ بچی کی پرورش، دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ان کی تمام محنتیں اور مشقتیں بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئیں۔ اس کی قربانی اور اس کا ایثار اس کے لئے فلاح اور کامرانی کا ضامن بن گیا۔حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی اس طرح روایت کرتے ہیں:

''جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی اور انہیں تعلیم وتربیت دی اور ان کے ساتھ رحمت و شفقت کا سلوک کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں بے نیاز کردے (وہ گھر بار والی ہوجائیں) تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لیے جنت واجب کردی۔اس پر کسی نے کہا کہ اگر دو ہی لڑکیاں یا بہنیں ہوں تو؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دو کی سرپرستی پر بھی یہی اجر ہے۔''(مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ لوگ ایک بیٹی کے بارے میں پوچھتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بیٹی کے بارے میں بھی یہی فرماتے۔(بخاری)

اور اب ایک اور پہلو کا تذکرہ:

بحیثیت ماں

ماں علامت ہے خلوص وایثار، بے لوثی و بے غرضی کی۔ عالمِ انسانیت کی یہ تمام رونقیں، بہن بھائیوں کی باہمی محبت، رشتوں کی یگانگت اور طبیعتوں کی نرمی وملائمت سب نتیجہ ہیں ماں کی پُرخلوص اور پُر جوش محبت کا۔ ماں کا دل ہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے نفرت اور عداوت کی تپش سے جھلسے ہوئے دلوں اور ذہنوں کو پیار اور محبت کا زمزم نصیب ہوسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ماں کو بلند مرتبہ عطا کیا ہے۔اس کے قدموں کو سعادت وکامرانی کا خزینہ اور اس کے ہونٹوں سے نکلی دعاؤں کو فلاح وکامیابی کی ضمانت قرار دیا ہے۔

ماں کی فضیلت کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص اپنے والدین کو روتا ہوا چھوڑ کر ہجرت اور جہاد کی بیعت کی غرض سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔آپؐ نے فرمایا:''جا! والدین کو اسی طرح خوش کر جس طرح کہ اُن کو رُلا کر آیا ہے۔''(مسلم)

نسائی اور بیہقی میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:'' جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔''

بحیثیت بہن

عورت کی ایک حیثیت بہن کی ہے۔کتنا پیارا رشتہ ہے بہن بھائی کا، کتنی محبت ہوتی ہے ہر بہن کو اپنے بھائی سے اور کیا کچھ

کرگزرنے کو جی نہیں چاہتا اچھے بھائی کا اپنی بہنوں کے لئے! اس کے باوجود اسلام نے اپنی بہن کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید کرنا ضروری سمجھا۔

حضرت مکیب بن منفعہؓ سے روایت ہے کہ میرے دادا نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ میں کس کس کے ساتھ حسنِ سلوک کروں، تو نبی کریمؐ نے فرمایا: ''اپنی والدہ، اپنی بہن، اپنے بھائی، اپنے خادم اور پھر اُن کے ساتھ جو قریب سے قریب تر ہیں۔'' (بخاری)

معروف سیرت نگار طالب الہاشمی اپنی مشہور تصنیف ''حسنت جمیع خصالہٗ'' میں ایک واقعہ یوں نقل کرتے ہیں:

''جعرانہ میں ایک دن ایک بوڑھی خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ حنین اور طاس کی لڑائیوں میں مسلمانوں نے دشمن کے چھ ہزار نفوس کو قیدی بنایا تھا، یہ خاتون انہی قیدیوں میں شامل تھیں اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں کے سردار (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دودھ شریک بہن ہیں۔ مسلمان ان سے واقف نہ تھے، انہوں نے ان کو حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچایا، تو انہوں نے بتایا: ''مَیں آپ کی رضاعی بہن ہوں؟'' حضورؐ نے مُسکرا کر فرمایا: ''کوئی ثبوت؟'' انہوں نے عرض کیا بچپن میں ایک دن میں آپ کو کھیلا رہی تھی تو آپ نے میری کلائی پر ضرب لگا دی تھی، اس کا نشان ابھی تک موجود ہے۔ نبی کریمؐ کو یقین ہو گیا کہ وہ واقعی آپؐ کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہؓ کی بیٹی شیما ہیں جو بچپن میں آپؐ کو کھیلایا کرتی تھیں۔ حضورِ پاکؐ کھڑے ہو گئے۔ نہایت محبت اور احترام کے ساتھ اپنی چادر مبارک ان کے لئے بچھا دی، بیٹھنے کو کہا اور احوال پوچھے۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے بارے میں پوچھا۔ پھر اُن سے فرمایا: ''اگر آپ میرے پاس رہنا چاہیں تو عزت و احترام کے ساتھ رہ سکتی ہیں اور اگر اپنے قبیلے میں واپس جانا ہے، تو اس کا بھی انتظام کئے دیتے ہیں۔'' انہوں نے عرض کیا کہ مجھے میرے قبیلے میں واپس بھیج دیں۔ آپؐ نے انہیں اونٹ، بکریاں اور ایک ملازمہ دے کر رخصت کرنے کو کہا، تو بی بی شیماؓ نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے وطن روانہ ہو گئیں۔

> اسلامی معاشرے میں آج بھی عزت دار اور لائقِ احترام گھرانوں کا تعین دیگر باتوں کے علاوہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ وہاں خواتین کو کیا مقام دیا جاتا ہے، ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے؟ خواتین سے مردوں کا اچھا سلوک ان گھرانوں کے رہن سہن، لین دین، تعلق داری، مہمان نوازی اور خاندانی شرف کی شکل میں معمولی سوجھ بوجھ والے مرد اور عورت کو بھی نظر آتا رہتا ہے اور برعکس صورت میں بھی چُھپا نہیں رہتا۔
>
> (جسٹس پیر کرم شاہ: ضیاء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

بحیثیت بیوی

خاندان کے قیام و بنیاد اور تسلسل کے لئے اسلام نے نکاح کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جس کے ذریعے ایک مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ باہمی محبت، ادب اور احترام کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ یہ فطری مطالبہ بھی ہے اور معاشرے کا تقاضا بھی۔ انسانی فطرت اور انسانی معاشرے کے تقاضے اسی صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جب نکاح کے بندھن میں بندھنے والے مرد و زن باہمی خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات سے سرشار ہوں۔ ایک دوسرے کے لئے مَسرت و سکون کا ذریعہ ہوں۔ اس رشتے کی لطافتوں اور نزاکتوں کو قرآن مجید نے سورۃ البقرۃ کی آیت 186 میں یوں بیان فرمایا ہے: ''عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔'' اس ارشادِ باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ مرد اپنی بیویوں کے لئے باعثِ تحفظ ہیں اور عورتیں ان کے لئے باعثِ سکون و راحت۔ اگر مرد بیویوں کی تکمیل کا ذریعہ ہیں، تو عورتیں بھی خاوند کی روحانی اور اخلاقی تکمیل کا وسیلہ ہیں۔ مرد اپنے بیوی بچوں کی جائز ضروریات کے لئے رزقِ حلال کمانے میں خون پسینہ ایک کئے رکھتے ہیں، تو بیویاں بھی گھر کو خاوند کے لئے جنت بنانے، بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔

بیوی کی حیثیت سے عورت کو اسلام نے جس عزو شرف سے ہمکنار کیا، اس کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے:

بیوی بحیثیت انسان اپنے انسانی اور معاشرتی حقوق میں اپنے شوہر کے برابر ہے کیونکہ جس طرح شوہر نوعِ انسانی کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے عزت کا مستحق ہے، اسی طرح بیوی بھی اسی نوعِ انسانی کا ایک جزو ہونے کے سبب اسی عزت کی حقدار ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور بیویوں کا حق دستور کے مطابق شوہروں پر ایسا ہی ہے جیسے شوہروں کا بیویوں پر اور مردوں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔'' (سورۃ البقرہ۔ آیت 227)

اللہ تعالیٰ نے مرد کو فضیلت اس لئے دی ہے کہ وہ بیوی کی حفاظت اور ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا ذمہ دار ہے۔

عورت اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی صلاحیتوں اور خاصیتوں سے نوازا ہے۔ مرد کو اگر قوت، سختی، مضبوطی، تحمل، شدائد اور جفاکشی کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں تو عورت کو نرمی، ملائمت، نزاکت و لطافت اور شرم و حیا کی صفات سے آراستہ کیا گیا ہے۔ یہ اختلاف و تضاد انسانی تمدن کی بقاء اور استحکام کے لئے نہایت مفید اور سودمند ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے بیوی پر وہ ذمہ داریاں عائد نہیں کیں جو اس کی قوتِ برداشت سے باہر ہوں اور نہ اس کے لئے وہ میدانِ کار مقرر کیا جو اس کی فطری خوبیوں کو پروان چڑھانے کے بجائے انہیں تباہ و برباد اور مجروح کر کے رکھ دے۔

بیوی اپنے شوہر کے گھر کی ملازمہ یا نوکرانی نہیں، اس گھر کی مالکہ بلکہ ملکہ ہے۔ اس کے لئے یہ اعزاز اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی گود نئی نسل کا گہوارہ اور مکتب ہے۔ اگر یہ گود ہی عزت و احترام اور شرف و وقار کی نعمت سے محروم رہے،

تو اس میں پرورش اور تربیت پانے والی نئی نسل بلند ہمتی، وقار، عالی ظرفی، بلند حوصلگی اور خود اعتمادی جیسے اوصاف کے زیور سے کیسے آراستہ ہوسکتی ہے؟ ہم سب کے ہر روز دیکھنے سننے کی بات ہے کہ احترام وعزت سے محروم گودوں میں پرورش پانے والی نسل اخلاق وانسانیت کے اعلیٰ جوہر سے محروم رہتی ہے۔

اسی لئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا رکھوالا ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت باز پرس ہوگی۔ مرد اپنے بیوی بچوں کا رکھوالا ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔ بیوی اپنے شوہر کے گھر کی ملکہ ہے، اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔'' (بخاری)

شوہر پر اس کی بیوی کا یہ بھی حق ہے کہ وہ اس کے تمام جائز اور ضروری اخراجات کی پوری ذمہ داری اٹھائے۔ اسلام نے روزی کمانے اور معاش حاصل کرنے کے لئے بھاگ دوڑ کرنے کا بوجھ بیوی پر نہیں، بلکہ شوہر پر ڈالا ہے کیونکہ اپنی جسمانی قوت اور طاقت کی بنا پر وہی اس کا اہل ہے۔ بیوی کے اس حق کو قرآن مجید نے سورۃ النساء کی آیت 34 میں اس طرح بیان کیا ہے:

''مرد عورتوں کے نگران ہیں، اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے (عورت) پر فضیلت دی ہے اور اس لئے کہ انہوں نے (عورتوں کو ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے پر) اپنا مال خرچ کیا۔''

اسی حق کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جب شوہر خود کھائے تو بیوی کو بھی کھلائے۔ جب خود پہنے تو بیوی کو بھی پہنائے۔ اس کے منہ پر ہاتھ نہ اٹھائے، نہ اس کو برا بھلا کہے، نہ ڈانٹ ڈپٹ کرے (خاص طور پر اوروں کے سامنے، خواہ وہ بال بچے اور اپنے یا بیوی کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں) اور نہ سزا کے طور پر اسے گھر سے نکالے۔'' (ابنِ ماجہ)

جب سے پھوٹی ہے چراغِ مصطفیؐ کی روشنی
اِس جہاں سے جاہلیّت کا اندھیرا جا چکا
چودہ صدیوں سے مبارک ہیں مُقدّس بیٹیاں
ان کو زندہ دفن کرنے کا زمانہ جا چکا

آمنہؓ و عائشہؓ وفاطمہؓ کی ہیں کنیز
دیدہ ودل کے تقدّس میں یہ حوروں کے قریب
مرتبہ اسلام نے عورت کو بخشا ہے عجیب
کوئی اندیشہ نہیں، اب اس کے شانوں کی صلیب

پاسبانِ عصمت و ناموس بھی تھیں بے گماں
جو رِجز خوان وشرر آہنگ بھی ہوتی رہیں
ہیں مِری تاریخ میں ان بیٹیوں کے نام بھی
جو سَرِ میداں، شریکِ جنگ بھی ہوتی رہیں

دخترانِ پاک بھی اُن بیٹیوں کا عکس ہیں
کیوں نہ ہوں پھر تابشِ عِلم وہُنر سے سرفراز
پیارے پاکستان میں ہے ایسی حوروں کا وجود
جن کے آنچل پر فرشتے پڑھ سکیں آ کر نماز

—صہبا اختر

نیک، صالح اور سلیقہ مند بیوی گھر کو پیارا گھر بلکہ جنت کا نمونہ بنا دیتی ہے اس لئے اسلام نے اس کی اس خوبی کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مرتبے اور مقام کو عزت کے بلند ترین درجے پر پہنچا دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے: ''تقویٰ کے بعد نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔'' (ابنِ ماجہ)

یہ نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواتین پر خاص کرم فرمائی ہے کہ بیوی کے وقار، اس کے احترام اور قدر و منزلت کو عروج تک پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ حُسنِ سلوک، مروت و احسان اور اس کی دلجوئی و خبر گیری کو ایک شوہر کی خوبی اور اس کی شرافت کا معیار قرار دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: ''تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے اچھے ہیں۔'' (ابنِ ماجہ)

خصوصی فضیلت

اسلام نے عورت کا دائرہ کار وہی مقرر کیا جو اس کی جسمانی ساخت اور اس کی فطری صلاحیتوں سے ہم آہنگ تھا۔ مغرب نے عورت کو ''مساوات'' یا ''شانہ بشانہ'' اور ''آزادی'' کے سبز باغ دکھا کر ان سختیوں، مشقتوں، جھمیلوں اور تصادموں کے طوفان میں جا دھکیلا ہے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے فطرت نے اسے تیار ہی نہیں کیا۔

اسلام سے پہلے عورت انسانیت کے ان طبقوں میں سے تھی جو افسوسناک حد تک پس ماندہ تھے، اس لئے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اس دنیا کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقوں کے لئے خاص طور پر سراپا رحمت بن کر تشریف لائے، عورت کو پستی سے اٹھانے اور اسے اس کا اصل مقام دلانے پر خصوصی توجہ فرمائی، اس کی محرومیوں اور اس کی حق تلفیوں کے ازالے کے لئے آپؐ نے اپنے دامنِ کرم و رحمت کو مقابلتاً زیادہ کشادہ اور فراخ کیا۔ اس کی پیدائش کو باعثِ رحمت بتایا، پاکباز اور سلیقہ مند بیوی کی حیثیت سے اسے ایمان کے بعد دنیا کی سب سے بڑی نعمت قرار دیا۔ ماں کی صورت میں اس کے قدموں میں جنت کی سدا بہار نعمتوں کی نشاندہی کی۔ اس طرح روحانی، اخلاقی اور انسانی لحاظ سے مرتبے اور فضیلت میں عورت اپنی جنسِ مخالف یعنی مرد پر کئی گُنا سبقت لے گئی۔

- جو نصیحت نہیں سنتا، وہ ملامت سننے کا شوق رکھتا ہے
- بدکار سخت بزدل اور بہت بڑا سازشی ہوتا ہے
- ضرورتوں کو محدود کر لینا بہت بڑی دولت مندی ہے
- کمزوروں پر رحم نہ کھانے والا طاقتوروں سے مار کھاتا ہے
- جو زیادہ پوچھتا ہے، وہ زیادہ سیکھتا ہے
- پرانا دوست سب سے بہتر آئینہ ہے
- سادگی میں سے وقار چھلکتا ہے
- صرف نیک ہی نہ بنو، کسی کے ساتھ نیکی بھی کرو
- غصّہ حماقت سے شروع اور ندامت پر ختم ہوتا ہے
- ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے
- برائی کو بھلائی کا ذریعہ نہ بناؤ
- ہر نیک کام خود جگہ بنا لیتا ہے

— شیخ سعدیؒ

غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کا برتاؤ

قمر علی

اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب بہت حیران کُن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لئے جبر کی اجازت ہرگز نہیں دی۔ پیغمبر کا کام ہے تبلیغ و وعظ' اس کے بعد نتیجہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دورِ خلافتِ راشدہ کے بارے میں حتمی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کو جبر کے ساتھ کبھی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ غیر مسلموں کے ساتھ سلوک کے حوالے سے قرآن مجید میں اصول ملتا ہے کہ ہر مذہبی اکائی/گروہ کو کامل داخلی خودمختاری دی جائے حتیٰ کہ نہ صرف عقائد کی آزادی ہو بلکہ اپنی عبادات وہ اپنی طرز پر کر سکیں۔ کامل داخلی خودمختاری کا قرآنِ مجید کی کئی آیتوں میں ذکر ہے جن میں ایک آیت بہت ہی واضح ہے وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ (47:5) یعنی انجیل والوں کو چاہئے کہ اس چیز کے مطابق احکام دیا کریں جو اللہ نے انجیل میں نازل کی ہے۔ ان احکام کے تحت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں آبادی کے ہر گروہ کو قومی خودمختاری مل گئی تھی۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے۔ مسلمانوں پر جنگ فرض کی جاتی ہے اور غیر مسلم رعایا کو اس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے' کیونکہ اگر مسلمان دین کی خاطر جنگ کریں تو غیر مسلموں کو اسلام کی خاطر جنگ کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ مسلمان جنگ کر کے اسلامی مملکت' ریاست اور اس کی حدود کی حفاظت کرتا ہے جس کے باعث وہاں رہنے والی غیر مسلم رعایا کو امن و امان کی ضمانت ملتی ہے جبکہ مسلمان اپنے ملک کی حفاظت کے لئے سر کٹاتے ہیں' لہٰذا فوجی ضرورت کے تحت غیر مسلم رعایا پر ایک ٹیکس عائد کیا جاتا ہے جو جزیہ کہلاتا ہے ۔ یہ جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے۔ اسلام سے پہلے ایران وغیرہ میں بھی جو لوگ فوجی خدمت انجام نہیں دیتے تھے' انہیں ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ یہ چیز اسلام میں بھی آئی۔ غیر مسلم بہت ہی معمولی ٹیکس دے کر' جو سال میں دس دن کی غذا کے برابر تھا' اسلامی سلطنت کی پوری حفاظتی قوتوں اور پولیس وغیرہ کی خدمات سے

مستفید ہوتے رہتے اور جس وقت مسلمان اپنا سر کٹاتے' یہ اپنی تجارت اور کاروبار میں لگے ہوئے دولت کماتے۔ اس کے علاوہ یہ چیز غیر مسلموں کے متعلق نظر آتی ہے کہ محض مذہب کی بنا پر ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ سن دو ہجری میں جب غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو مکے والوں نے ایک وفد دوبارہ حبشہ بھیجا اور چاہا کہ وہاں جو مسلمان مہاجرین مقیم ہیں' ان کو شاہ نجاشی سے کسی طرح واپس حاصل کر لیں اور ان کو تکالیف دیں۔ جب اس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوئی تو آپؐ نے عمرو بن امیہ الضمری کو اپنا سفیر بنا کر نجاشی کے پاس بھیجا تا کہ وہ مسلمانوں کی سفارش کرے اور ان کی حفاظت کے لئے بادشاہ کو آمادہ کرے' حالانکہ عمرو بن امیہ الضمری اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔

اسی طرح ہمیں اس کا بھی پتا چلتا ہے کہ آپؐ کے ہمسائے میں کوئی بھی بیمار ہوتا تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لئے اس کے گھر جایا کرتے۔ بنی عریض نامی یہودی قبیلہ مدینے میں رہتا تھا۔ ان کی کسی بات سے خوش ہو کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے کچھ سالانہ معاش مقرر فرمائی۔ یہ حیران کُن چیزیں ہیں جو غیر مسلموں سے برتاؤ کے سلسلے میں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح جب مسلمان ہی کا نہیں' یہودیوں کا جنازہ بھی شہر کی گلیوں سے گزرتا اور اتفاق سے آپؐ وہاں کسی جگہ بیٹھے ہوتے تو جنازے کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے تا کہ ان کے ساتھ ایک طرح سے اپنی ہمدردی کا مظاہرہ کریں۔ غرض مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر مسلم رعایا کے ساتھ اس قدر رواداری کا تھا کہ اس کی مثال ہمیں تاریخِ عالم میں کم کم ملتی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ مسلمانوں میں حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے میں خانہ جنگی ہوئی۔ پھر اس کے بعد بار ہا خانہ جنگیاں ہوتی رہیں' مسلمانوں کی کسی بھی باہمی خانہ جنگی کے زمانے میں غیر مسلم رعایا نے کبھی بغاوت نہیں کی۔ وہ خانہ جنگی میں کسی فریق کا ساتھ نہ دیتے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمان حکومت سے غداری یا بغاوت کا خیال ان میں کبھی پیدا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت علی المرتضیٰؓ کے زمانے میں جب قیصرِ روم نے اسلامی ممالک کی عیسائی رعایا سے کہا کہ موقع ہے تم بغاوت کرو' مَیں بھی اسی وقت مسلمانوں پر حملہ کروں گا اس طرح ان مشترکہ دشمنوں سے نجات پائیں گے۔ اس زمانے سے لے کر صلیبی جنگوں تک جب کبھی ایسے مطالبے کسی پوپ نے یا کسی عیسائی حکمران نے کئے تو مسلمانوں کی عیسائی رعایا کا جواب یہ ہوتا کہ ہم ان حکمرانوں (مسلمانوں) کو تم پر ترجیح دیتے ہیں' کیونکہ ہمارے ساتھ ان کا سلوک بے مثال ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کبھی غیر مسلموں پر اسلام لانے لئے جبر نہیں کرتے تھے اور ان کو مذہبی اور قومی معاملات میں پوری آزادی و خود مختاری دیتے تھے' حتیٰ کہ ان کے مذہبی اداروں کی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ

کے زمانے کی ایک معتبر شہادت موجود ہے جس کی اصل دستاویز بھی آج تک محفوظ ہے۔ایک عیسائی اپنے بعض ہم مذہبوں کو جو دوسرے شہر کے تھے' یہ خوشخبری پہنچاتا ہے کہ آج کل ایک نئی قوم ہماری حاکم بن گئی ہے' لیکن وہ ہم پر ظلم نہیں کرتی' اس کے برخلاف وہ ہمارے گرجا گھروں اور ہمارے راہب خانوں کی مالی مدد کرتی ہے۔ مختلف شعبوں میں حُسنِ سلوک کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے:

حفاظتِ جان

اسلامی مملکت میں غیر مسلم شہریوں (اہل الذمہ یا ذمی) کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر رکھی ہے۔اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کرے گا تو اس کا قصاص اسی طرح لیا جائے گا جس طرح مسلمان کو قتل کرنے کی صورت میں لیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کیا تو آپؐ نے اس کے قتل کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ اپنے ذمی کا دفاع کرنے کا سب سے زیادہ حق دار مَیں ہوں (روایت: ابن عمرؓ)

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا۔اس پر حضرت فاروقؓ اعظم نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے حوالہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ مقتول کے وارثوں کو دے دیا گیا اور انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: ''انہوں (غیر مسلموں) نے ذمی بننا قبول ہی اسی لئے کیا ہے کہ ان کے

> حضرت علی المرتضٰیؓ کے زمانے میں ایک مسلمان کو ایک غیر مسلم کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا' ثبوت مکمل ہونے کے بعد حضرت علی المرتضٰیؓ نے قصاص کا حکم دے دیا۔مقتول کے بھائی نے آکر عرض کیا کہ میں نے خون معاف کیا' مگر آپؓ مطمئن نہ ہوئے اور فرمایا کہ شاید ان لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے۔اس نے جواب دیا کہ نہیں' خون بہا مجھے مل چکا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قتل سے میرا بھائی واپس نہیں آئے گا۔تب حضرت علیؓ نے قاتل کو رہا کیا اور فرمایا کہ جو کوئی ہمارا ذمی ہو' اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔ (مواہب الرحمٰن)

مال ہمارے مال کی طرح اور ان کا خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں۔اس بنا پر اگر مسلمان کسی ذمی کو ناجائز قتل کرے تو اس کی دیت بھی وہی ہوگی جو مسلمان کو قتل کرنے سے لازم آتی ہے (درالمختار)

فوجداری قانون

تعزیرات کا قانون ذمی اور مسلمان کے لیے یکساں ہے اور اس میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ جرائم کی جو سزا مسلمان کو دی جائے گی' وہی ذمی کو بھی دی جائے گی۔ ذمی کا مال مسلمان چُرا لے یا مسلمان کا ذمی چُرا لے' دونوں صورتوں میں سزا ملے گی۔ ذمی کسی مرد یا عورت پر بدکاری کی تہمت لگائے یا مسلمان ایسا کرے' دونوں صورتوں میں ایک ہی حدِ قذف جاری ہوگی۔اسی طرح بدکاری کی سزا بھی ذمی اور مسلمان کے

لیے یکساں ہے۔

دیوانی قانون

دیوانی قانون بھی ذمی اور مسلمان کے لیے یکساں ہے اور دونوں کے درمیان کامل مساوات ہے۔ حضرت علی المرتضیٰؓ کے ارشاد اموالھم کاموالنا کے معنی ہی یہی ہیں کہ ان کے مال کی ویسی حفاظت کی جائے گی جیسی مسلمان کے اپنے مال کی ہوتی ہے اور دیوانی حقوق ہمارے اور ان کے برابر ہوں گے۔ اس مساوات کا طبعی لازمہ یہ ہے کہ دیوانی قانون کی رُو سے جتنی پابندیاں مسلمان پر عائد ہوتی ہیں، وہی سب ذمی پر بھی عائد ہوں گی۔ تجارت کے جو طریقے ہمارے لئے ممنوع ہیں، وہی ان کے لئے بھی ہیں۔ سود جس طرح ہمارے لئے حرام ہے، ان کے لیے بھی حرام ہے۔ البتہ ذمیوں کے لیے صرف شراب اور سؤر کی چھوٹ ہے۔ وہ شراب بنانے، پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں سؤر پالنے، کھانے اور فروخت کرنے کے بھی حقوق حاصل ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ذمی کی شراب یا سؤر کو تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔

تحفظِ عزت

ذمی کو زبان یا ہاتھ پاؤں سے تکلیف پہنچانا، اس کو گالی دینا، مارنا، پیٹنا یا اس کی غیبت کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح مسلمان کے حق میں یہ افعال ناجائز ہیں۔ درالمختار میں ہے: ''اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلمان کی غیبت حرام ہے۔''
(درالمختار)

شخصی معاملات

ذمیوں کے شخصی معاملات ان کی اپنی ملت کے قانون (یعنی پرسنل لاء) کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اسلامی قانون ان پر نافذ نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے لئے شخصی معاملات میں جو کچھ ناجائز ہے، وہ اگر ان کے مذہبی و قومی قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت ان کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔ مثلاً بغیر گواہوں کے نکاح یا بغیر مہر کے نکاح یا زمانۂ عدت کے اندر نکاح ثانی یا محرمات کے ساتھ نکاح اگر وہ جائز رکھتے ہوں، تو ان کے لئے یہ سب افعال جائز رکھے جائیں گے۔

کسی مقدمہ میں فریقین اسلامی عدالت سے درخواست کریں کہ ان کا فیصلہ شریعتِ اسلام کے عین مطابق کیا جائے، تو عدالت ان پر شریعت نافذ کرے گی۔ نیز اگر شخصی قانون سے تعلق رکھنے والے کسی معاملہ میں ایک فریق مسلمان ہو تو فیصلہ اسلامی شریعت کے مطابق ہوگا۔ مثلاً کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان کے نکاح میں تھی اور اس کا شوہر مر گیا، تو اس عورت کو شریعت کے مطابق پوری عدتِ وفات گزارنا ہوگی۔ عدت کے اندر وہ نکاح کرے گی، تو ایسا نکاح غیر قانونی ہوگا۔

مذہبی رسوم

مذہبی رسوم اور قومی شعائر کو کھلم کھلا اعلان و اظہار کے ساتھ ادا

کرنے کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ ذمی اپنی بستیوں میں تو ان کو پوری آزادی کے ساتھ کرسکیں گے البتہ خالص اسلامی آبادیوں میں حکومت کو اختیار ہوگا کہ انہیں اس کی آزادی دے یا ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کردے۔ خالص اسلامی آبادیوں سے مرادوہ مقامات ہیں جو شریعت کی اصطلاح میں ''امصار المسلمین'' کہلاتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق صرف ان مقامات پر ہوتا ہے جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو اور جن کو مسلمانوں نے اظہارِ شعائرِ اسلام کے لئے مخصوص کرلیا ہو (بدائع۔ جلد 7۔ صفحہ 113)

تعلیم

انہیں نظامِ تعلیم تو وہی قبول کرنا ہوگا جو مملکت پورے ملک کے لئے بنائے گی' لیکن جہاں تک اسلام کی مذہبی تعلیم کا تعلق ہے' اس کے پڑھنے پر وہ مجبور نہ کئے جائیں گے۔ انہیں پورا پورا حق ہوگا کہ ملکی درس گاہوں میں یا خود اپنی مخصوص درسگاہوں میں اپنے مذہب کی تعلیم کا مستقل انتظام کریں۔

ملازمتیں

چند مخصوص مناصب کے سوا' وہ تمام ملازمتیں حاصل کرنے کے حقدار ہوں گے اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ کوئی تعصب نہ برتا جائے گا۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے لئے اہلیت کا ایک ہی معیار ہوگا اور اہل آدمیوں کا بلا امتیاز انتخاب کیا جائے گا۔ مخصوص مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو

- سوچ سمجھ کر کام کرنا کامیابی کی کنجی ہے
- آگے بڑھنے کے لیے چلنا ضروری ہے
- وقت سے پہلے اور مقدّر سے زیادہ نہیں ملتا
- ظالم کے مرنے پر غمگین ہونا ظلم میں شامل ہونا ہے
- جو حرام کھاتا ہے' اس کے تمام اعضاء گناہ میں پڑ جاتے ہیں
- تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے
- سب سے زیادہ مالدار وہ ہے جو نہ مانگے' نہ خوشامد کرے

—امام محمد غزالیؒ

اسلام کے اوّلیں نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مناصب کی فہرست کافی غور وخوض کے بعد ماہرین کی ایک جماعت بنا سکتی ہے۔ ہم ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہے' وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں کو دی جاسکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں۔ ان خدمات کے عہدوں پر بھی ذمی اپنی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کئے جاسکتے ہیں۔

کاروبار اور پیشے

صنعت وحرفت' تجارت' زراعت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے غیر مسلموں کے لئے بالکل کھلے رہیں گے۔ ان میں مسلمانوں کو کوئی ایسی رعایت حاصل نہ ہوگی جو غیر مسلموں کو

حاصل نہ ہواور غیر مسلموں پر کوئی ایسی پابندی عائد نہ کی جا سکے گی جو مسلمانوں کے لئے نہ ہو۔ ہر شہری کو خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، معاشی میدان میں جِدّوجُہد کا مساویانہ حق ہوگا۔

علمائے اسلام کی حمایت

یہ ہیں اس قانون کی چند تفصیلات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں غیر مسلم رعایا کے حقوق وفرائض سے متعلق بنایا گیا۔ خلفائے راشدینؓ کے دور کے بعد بھی جب کبھی ذمیوں کے ساتھ بے انصافی کی گئی، تو وہ فقہائے اسلام ہی کا گروہ تھا جو آگے بڑھ کر ان کی حمایت کے لئے کھڑا ہو گیا اور متفق ہو کر ان کا پشت پناہ بنا۔ تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ ولید بن عبدالملک نے دمشق کے کلیسا یوحنا کو زبردستی عیسائیوں سے چھین کر مسجد میں شامل کر لیا تھا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ بنے اور عیسائیوں نے ان سے ظلم کی شکایت کی تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عامل کو حکم دیا کہ مسجد کا جتنا حصہ کلیسا کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے، اسے منہدم کر کے عیسائیوں کے حوالہ کرو۔ (فتوح البلدان۔ صفحہ 132)

بے مثال رویّہ

جنگِ یرموک میں جب رومیوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں ایک زبردست فوج جمع کی تو مسلمانوں کو شام کے تمام مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر اپنی طاقت ایک مرکز پر سمیٹنا پڑی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے امراء کو لکھا کہ جو کچھ جزیہ وخراج تم نے ذمیوں سے وصول کیا ہے، انہیں واپس کر دو اور ان سے کہو کہ اب ہم تمہاری حفاظت سے قاصر ہیں، اس لئے ہم نے جو مال تمہاری حفاظت کے معاوضہ میں وصول کیا تھا، اسے واپس کرتے ہیں۔ اس حکم کے مطابق تمام امرائے فوج نے جمع شدہ رقوم واپس کر دیں۔ بلاذری اس موقع پر غیر مسلم رعایا کے جذبات کا حال یوں لکھتا ہے:

> ''جب مسلمانوں نے حمص میں جزیہ کی رقم واپس کی تو وہاں کے باشندوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ تمہاری حکومت اور انصاف پسندی ہمیں اس ظلم وستم سے زیادہ محبوب ہے جس میں ہم مبتلا تھے۔ اب ہم ہرقل کے عامل کو اپنے شہر میں ہرگز گھسنے نہ دیں گے تاوقتیکہ لڑ کر مغلوب نہ ہو جائیں۔'' (فتوح البلدان۔ صفحہ 137)

ولید بن یزید نے رومی حملہ کے خوف سے قبرص کے ذمی باشندوں کو لا کر شام میں آباد کیا تو فقہائے اسلام اور عام مسلمان اس پر سخت ناراض ہوئے۔ ولید بن یزید نے انہیں دوبارہ قبرص میں لے جا کر آباد کر دیا تو اس کی عام طور پر تحسین کی گئی اور کہا گیا کہ یہی انصاف کا تقاضا ہے۔

ایسی ہی بے شمار مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے اسلام نے ہمیشہ اہلِ ذمہ کے حقوق کی حمایت کی ہے اور کبھی امیر یا بادشاہ نے ان پر جبر وظلم کیا، تو اس کھل کر اور ڈٹ کر غیر مسلموں کی حمایت میں نکل آئے اور جابر حکمرانوں کو اپنے غیر اسلامی فیصلے واپس لینا پڑے۔

گوشۂ آزادی

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

قیامِ پاکستان کے دوران جان و مال کے اتلاف کے علاوہ یہ مصیبت بھی جھیلنی پڑی کہ بھائی بچھڑ گیا' اقربا ایک دوسرے سے سینکڑوں میل دُور جا پڑے۔ان تمام اتلافات اور نقصانات کا صحیح اندازہ لگانا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔تاہم احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کیمپوں میں قتل ہونے اور سفر کے مصائب سے مرنے والوں اور پاکستان پہنچ کر دو ماہ کے اندر اندر مرنے والوں کی تعداد سولہ سے بیس لاکھ تک تھی' ان عورتوں و بچوں اور مردوں کی تعداد جو ہندو یا سکھ بنا لئے گئے' ایک لاکھ تھی۔ باقی ماندہ کی خانہ بربادی اس پر مستزاد۔سارے ہندوستان میں ایک کروڑ سے زائد مسلمان اس قیامتِ صغریٰ کی لپیٹ میں آئے۔تب کہیں آزاد مسلمان ریاستِ پاکستان کی شکل دیکھنا نصیب ہوئی۔(مرتضیٰ احمد خان میکش: اخراجِ اسلام از ہند) ترتیب:نسرین کوثر

چودہ اگست 1947ء کو میجر پورن سنگھ مجسٹریٹ دفعہ تیس شریف پورہ کے کیمپ میں آئے۔صوفی غلام محمد ترک نے جب وحشیوں کے انسانیت سوز مظالم کا ذکر کیا تو وہ اپنے ہمراہیوں سمیت جائے واردات تک چلنے پر آمادہ ہوگئے۔ صوفی غلام محمد ترک' میجر پورن سنگھ' دو فوجی سپاہیوں اور میجر صاحب کے عملے پر مشتمل ایک پارٹی شہر میں گئی۔جا بجا لاشیں پڑی پائیں۔راستہ خون سے رنگیں دیکھا۔مکانات کھنڈر بنے ہوئے' بھیانک تباہی کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔یہ دردناک منظر کچھ کم نہ تھا کہ وہ مسجد رنگریزاں میں پہنچے جہاں گیارہ نوجوان لڑکیوں کی لاشیں اپنی مظلومیت کا اظہار کر رہی تھیں۔ ان کے زخموں سے خون جاری تھا اور پیٹ چاک تھے۔

(فرخ امرتسری:خون کی ہولی)

1946ء میں جب مَیں صوبائی مسلم لیگ کا صدر تھا' ہم نے دہلی میں احتجاجی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔یہ عظیم الشان جلوس جامع مسجد سے نکالا گیا اور اس نے نئے سیکریٹریٹ تک مارچ کیا۔اس غیر قانونی جلوس کو نہ تو پولیس نے منتشر کیا اور نہ کوئی گرفتاری ہوئی۔جلوس بھی پُر امن رہا اور ہم اطمینان سے اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔رات گئے پولیس نے گرفتاریاں شروع کر دیں اور چالیس پچاس افراد کو جو مسلم لیگ کی کمیٹی کے رکن تھے' گرفتار کر لیا۔سنٹرل جیل میں ان مسلم لیگی کارکنوں کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ایک دن جب کہ مقدمے کی سماعت جاری تھی' میرے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا جس کے بدن سے عجیب سی بُو نے مجھے چونکا دیا۔ عدالت برخاست ہوئی تو میں نے معلوم کیا کہ بظاہر صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس اس نوجوان سے بُو کیوں آ رہی ہے۔ میرے اصرار پر اس نے اپنے سینے سے کپڑا اٹھایا تو مجھے یہ دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی کہ اس کی پسلیوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور زخموں سے بُو اُٹھ رہی تھی۔پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جلوس نکلنے سے چند دن قبل اس کا آپریشن ہوا تھا۔وہ ہسپتال میں تھا کہ

تھوڑی ہی دیر بعد کسی طرح جب اسے مسلم لیگ کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے اپنے زخموں کی پروا کئے بغیر ایک جذبۂ والہانہ کے ساتھ ہسپتال سے باہر آ کر جلوس میں شرکت کی اور اس جرم میں گرفتار ہو گیا۔ آج تک کسی کو اپنی تکلیف سے آگاہ نہیں کیا اور مردانہ وار قید کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔

(جسٹس قدیر الدین احمد: آزادی)

ظلم کی کوئی انتہا نہ رہی۔ باپ کو بیٹے کے روبرو ذبح کیا گیا۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے بچوں کو پیشاب تک پلایا گیا۔ کئی ایک نے بلا پانی کے جان دے دی۔ چشم دید گواہوں سے ایسے بدتہذیب، بداخلاق اور حیاء سوز واقعات ثابت ہو رہے تھے جن کے تحریر میں لانے سے شرم محسوس ہوتی ہے۔ کچھ قاتل ایسے بھی تھے جو ایک ایک عضو کاٹ کر ''شکار'' کے تڑپنے سے لطف اندوز ہوتے تھے اور بعد میں سرتن سے جدا کرتے تھے۔ بچوں کو بنوکِ کرپان قتل کرتے، پاؤں تلے روندتے، ابھار کر بلم کی نوک پر دبوچتے اور کہتے: ''یہ ہے تمہارا پاکستان۔'' (خلیفہ امام دین: محشرستانِ کپورتھلہ)

رات کے دو بجے گاڑی ایک دم جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ خبریں آ چکی تھیں کہ گاڑیاں کٹ رہی ہیں۔ بچے بلکنے لگے، عورتیں چیخنے لگیں۔ مرد انہیں خاموش کرانے کے لیے ان دونوں سے زیادہ چیخنے لگے۔ کھٹا کھٹ ساری کھڑکیاں چڑھ گئیں اور ان کے آگے سامان چُنا جانے لگا۔ باہر سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ حبس اور گرمی سے یہ حال ہو گیا کہ چوٹی کا پسینہ ایڑی میں آنے لگا۔ باہر موت ناچ رہی تھی اور ہم ہر گھڑی یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہماری باری آتی ہے۔ ایک گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ حملہ آوروں نے آدھی ریل لُوٹ لی اور مسافروں کو مار ڈالا۔ پندرہ منٹ اور انہیں مل جاتے تو ہمارا ڈبہ بھی صاف ہو جاتا۔ زندگی تھی، بچ گئے۔

(شاہد احمد دہلوی: آپ بیتی)

تین ستمبر 1947ء کو دہلی میں مسلمانوں کے قتلِ عام کا آغاز ہو گیا۔ جامع مسجد دہلی کے امام سعید احمد بخاری، دہلی میونسپل کارپوریشن کے صدر خان بہادر حبیب الرحمان خان کے علاوہ سینکڑوں بے گناہ مسلمانوں حتیٰ کہ ریلوے اسٹیشن کے درجنوں مسلمان قلیوں کو بھی کلمہ گوئی کی پاداش میں بیدردی سے شہید کر دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک فرانسیسی صحافی مسٹر میکس دہلی کے مشہور تجارتی مرکز کناٹ سرکس میں پہنچا۔ اس نے دیکھا ہندوؤں کا ایک مسلح ہجوم مسلمانوں کی دکانیں لُوٹ رہا ہے اور ان کے مالکوں کو قتل کر رہا ہے۔ یہ حملے اکالی کمانڈوز کے لئے ایک اشارہ تھے، انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی۔ پرانی دہلی کی غلہ منڈی جہاں ہزاروں مسلمان پھل اور سبزی فروش رہتے تھے، نذرِ آتش کر دی گئی۔ نئی دہلی میں ہمایوں کے مقبرے کے قریب واقع لودھی کالونی پر غنڈوں نے حملہ کر دیا اور چُن چُن کر مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ شاید ہی کسی گھر سے کوئی فرد بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکا ہو۔ دوپہر ہونے تک جابجا لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ گلیاں، بازار اور مکانات

مسلمانوں کے خون سے رنگیں تھے۔ قاتلوں نے اعلان کر دیا کہ مسلمانوں کو پناہ دینے والوں کے گھر جلا دیں گے۔ چنانچہ تمام غیر مسلموں نے اپنے مسلمان ملازموں کو گھر سے نکال کر فسادیوں کے رحم کرم پر چھوڑ دیا۔ گردونواح سے ہزاروں مسلمانوں نے یہاں آ کر پناہ لی تھی' مگر یہاں دوسرے تمام شہروں سے زیادہ خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یہ آخری پناہ گاہ تھی جواَب محفوظ نہ رہی تھی اور 4 ستمبر کو شام تک ہزاروں مسلمان مرد' عورتیں' بچے قتل کئے جا چکے تھے۔ (خواجہ افتخار: جب امرتسر جل رہا تھا)

لوگ جائے واردات پر گئے' تو ان کی نظریں مکان کے پر نالے پر پڑیں جس سے انسانی خون بہہ رہا تھا۔ لوگ اس مکان پر چڑھے تو وہاں ایک مسلمان عورت مری پڑی تھی' اس کے قریب اس کا نومود بچہ خاک وخون میں لتھڑا ہوا تھا۔ معصوم جسم پر گولیوں اور برچھیوں کے ان گنت نشانات وحشیوں کی درندگی کا ثبوت دے رہے تھے۔ کوچہ رنگریزاں کی مسجد کے کنوئیں میں جن غیرت مند دوشیزاؤں نے چھلانگیں لگائیں' ان کی نعشیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ اسی محلے کے ایک جلے ہوئے مکان کی بالائی چھت کے درمیان نصب شدہ آہنی سلاخوں کے چھجے سے ایک مسلمان عورت کی جلی ہوئی ٹانگیں لٹک رہی تھیں اور خون قطروں کی صورت میں نیچے صحن میں ٹپک رہا تھا۔ ایک نوعمر بچے کی آنکھوں میں دو خنجر گڑے ہوئے تھے' شاید اس لئے کہ اس معصوم کی آنکھیں آزادی کے سورج کو طلوع ہوتا نہ دیکھ سکیں۔ (صوفی غلام مصطفیٰ تبسم: داستانِ ترک)

گیارہ ستمبر 1947ء کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ سہ پہر کے وقت مسلمان پناہ گزینوں سے بھری ٹرین روانہ ہوئی۔ اس ٹرین کے ہمراہ سٹیٹ فورس سکارٹ تھا۔ ٹینک بھی ساتھ ساتھ حرکت میں آ گئے۔ جب یہ ٹرین ریاست کپورتھلہ کی سرحد کے قریب پہنچی تو جنک سنگھ نے دیکھا کہ ٹرین کا اگلا ڈبہ پٹری سے اتر گیا ہے' وہ پیچھے مڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ دو ہزار کے قریب سکھوں نے ٹرین پر حملہ کر دیا ہے۔ جنک سنگھ نے حملہ آوروں پر فوراً یورش کی اور مار بھگایا' لیکن اس دوران غنڈے بے شمار مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے۔ لاتعداد زخمی ہوئے اور حملہ آور دو سو کے قریب عورتوں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس واقعہ کے فوراً بعد جنک سنگھ کی جگہ لیفٹیننٹ وجاہت حسین نے لے لی۔ سی آئی ایچ کے جوتیس جوان ان کے ہمراہ تھے' وہ اس بدقسمت ٹرین کے مسافروں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اندھیرا بڑھنے لگا' چاروں طرف سے زخمیوں کی کراہیں اور چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے عزیزوں کو تلاش کر رہے تھے۔ تمام رات سخت بے چینی رہی اور خوف و ہراس چھایا رہا۔ غنڈے جا چکے تھے۔ جب صبح ہوئی تو کچھ فاصلے پر ایک عورت کی جوتی ملی۔ اس سے آگے ایک میل کے فاصلے پر جھاڑیوں میں تقریباً ایک سو عورتیں ملیں۔ ان میں سے ابھی کچھ زندہ تھیں اور بیشتر عورتوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ بچے قتل کر دیئے گئے تھے۔ بیس کے قریب بچے رینگ رہے تھے اور اپنی ماؤں کو تلاش کر رہے تھے۔ سینکڑوں اکالی گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ حملہ کیا۔ ان بچے کھچے پناہ گزینوں کی

زندگیاں سخت خطرے میں تھیں۔ لیفٹیننٹ وجاہت حسین اور سی آئی ایچ کی مختصر پارٹی نے ٹینکوں کی مدد سے حملہ آوروں کا بھرپور مقابلہ کیا اور پناہ گزینوں کو قتلِ عام سے بچالیا۔

(بریگیڈئر آر سی بوسٹو: دی میموریز آف برٹش ایمپائر)

ہندوستان کا یومِ آزادی پنجاب کے لیے تباہی کا دن تھا۔ اس روز طلوع ہونے والا آزادی کا سورج بنفشی اور سنہری نہیں بلکہ تشدد کے ان گنت واقعات اور خونریزی کی بناء پر خوں رنگ ہو چکا تھا۔ آزادی کے بعد امرتسر میں نئے حکام اپنے اختیارات سنبھال چکے تھے، مگر شہر میں امن و امان کی صورتِ حال بدستور مخدوش تھی۔ شہر کے اندر سکھ مسلمان ہمسایوں کا بے دریغ خون بہار ہے تھے۔ مردوں کو بے رحمی سے قتل اور عورتوں کو اغواء کیا جاتا۔ ان کی آبروریزی ہوتی۔ خوف وتشدد سے کانپتی ان عورتوں کو شہر بھر میں پھرا کر گولڈن ٹمپل تک لایا جاتا اور پھر بہت سی عورتوں کی گردنیں اُڑادی جاتیں۔ پٹیالہ کی سکھ ریاست پر دوندر سنگھ اپنے تمام تر جاہ وجلال کے ساتھ حکمرانی کرتا تھا۔ ریاستی حکمرانوں کے جتھے ان بے گناہ نہتے مسلمانوں پر حملے کررہے تھے جو سرحد پار کر کے پاکستان جارہے تھے۔ مہاراجہ کے بھائی بلند راسنگھ نے سکھوں کے ایک جتھے کو روکا جو بڑی بڑی کرپانوں سے مسلح تھا۔ اس نے انہیں گاؤں واپس چلنے اور فصلوں کی کٹائی کی تلقین کی تو اس جتھے کے سردار صاحب نے جواب دیا کہ ''ایک اور فصل بھی تو ہے جس کا کاٹنا بہت ضروری ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کرپانیں لہراتے ہوئے مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ مسلمانوں کا قتلِ عام، لوٹ مار اور آتشزدگی کی وارداتیں نہ صرف روز کا معمول بن گئی تھیں، ہر لمحے تشدد کا کوئی نہ کوئی واقعہ رونما ہوجاتا۔ ہندو، سکھ اپنی اکثریت اور طاقت کے بل پر مسلمان اقلیت پر دھاوا بولتے اور پل بھر میں بے بس زندگیاں موت کی ویرانیوں میں گم ہوجاتیں۔ بھارتی دارالحکومت نئی دہلی کی اورنگ زیب روڈ، پرانی دہلی کے چاندنی چوک، امرتسر کے محلوں، ریلوے لائنوں اور سٹیشنوں غرض ہر جگہ افراتفری کا عالم تھا۔ انسانیت کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا، ہندو اور سکھ وحشی درندوں کا روپ دھار چکے تھے۔ یہ سرحدی جنگ نہیں تھی، خانہ جنگی بھی نہیں تھی، نہ ہی اسے گوریلا جنگ کا نام دیا جاسکتا تھا، بس ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ وحشت کی ایک لہر تھی۔ بموں کے دھماکوں سے تو عمارتیں تباہ ہوتی ہیں، مگر یہاں پنجاب کی معاشرت تباہ ہورہی تھی۔ تہذیب وتمدن کی بلند وبالا دیواریں آپس میں ٹکرا کر زمیں بوس ہورہی تھیں۔ مسلمان ہر جگہ خوف اور دہشت کی گرفت میں تھے۔ ان فسادات نے کتنی ہی دردناک کہانیوں کو جنم دیا۔ وحشت اور ظلمت کے ایسے نقوش ثبت ہوئے جو انسان دشمنی کا منہ بولتا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

(لاری کولنز اور ڈینک لاپیری: فریڈم ایٹ مڈنائٹ)

دہلی کے پرانے قلعے سے ٹرین کی روانگی سے قبل ڈوگرہ فوجیوں نے تمام مسافروں کی تلاشی لے کر انہیں ایک چھوٹے سے چاقو تک سے بھی محروم کردیا۔ حد تو یہ ہے کہ مزدور پیشہ لوگوں کے بچے کھچے اوزار بھی چھین لئے گئے۔ تمام مسافروں کو بوگیوں میں بھیڑ بکریوں کی مانند بھرا گیا تھا جس کی وجہ سے گرمی اور گھٹن میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں

عورتوں اور بچوں کا گرمی سے برا حال تھا۔ گھٹے ہوئے ماحول پر طاری پُر اسرار اور انجانے خوف سے مرعوب ہوکر مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو ہر ممکن طریقہ سے خاموش کرانے لگیں۔ یہ ٹرین دو دن کے سفر کے بعد جب کسی مسلم آبادی والے ریلوے سٹیشن پر رکی تو مقامی لوگوں کی امدادی پارٹیوں نے ہماری ٹرین کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ روٹی، سالن، پکے ہوئے چاول، سبزی اور فروٹ وغیرہ مسافروں میں کثرت سے تقسیم کر رہے تھے۔ پانی کے بے شمار چھوٹے بڑے برتنوں کا انتظام تھا۔ یہیں امدادی پارٹیوں نے حملوں کی خبر دی اور مستقبل کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ کچھ ہندوؤں اور سکھوں نے اس گاڑی کو بیاس کے سٹیشن پر حملہ کر کے بالکل صاف کر دینے کا خوفناک منصوبہ تیار کیا ہوا ہے، اس لئے آپ لوگوں کو چاہئے کہ اپنے کمپارٹمنٹس کے دروازے اور کھڑکیاں اچھی طرح بند رکھیں۔ شام کا دھندلکا تھا جب ہماری ٹرین آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ماحول انتہائی سوگوار تھا، کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ سڑے ہوئے انسانی گوشت کی بدبو اندر پھیل جاتی تھی۔ باہر جھانکنے پر جگہ جگہ انسانی لاشیں بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر پڑی نظر آتیں۔ ایک جگہ تو معصوم بچوں کی لاشیں اس حالت میں نظر آئیں کہ پتھر دل انسان بھی موم ہوجائے۔ یہی وہ رقت آمیز مناظر تھے جنہیں دیکھ کر پوری گاڑی میں توبہ استغفار کا ورد جاری ہوگیا۔ سب کے چہروں پر خوف و ہراس نے اپنا رنگ جما لیا تھا۔ اگرچہ ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا، پھر بھی ہر شخص کو ایک ایک لمحہ انتہائی وحشت ناک اور کربناک محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی ہماری ٹرین بیاس کے سٹیشن میں داخل ہوکر آہستہ آہستہ رک رہی تھی کہ اچانک کہیں قریب سے رائفل کی گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد مزید گولیاں چلیں اور خاموشی چھا گئی، لیکن اس اثناء میں توبہ استغفار کا ورد تیز ہوگیا۔ کچھ لوگوں نے دیکھا کہ سٹیشن کے پُل کے اوپر سے چند سکھوں کا گروہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق کارروائی کے لئے تیار تھا۔ گاڑی کے ساتھ چلنے والی ڈوگرہ فوج نے فائرنگ صرف اشارہ دینے کے لیے کی تھی لیکن غلط فہمی کی بنا پر حملہ آور یہ سمجھ بیٹھے کہ فوجیوں نے ہم پر گولی چلائی ہے، اس لئے وہ سب چھپ گئے۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد کچھ آدمیوں کو بات چیت کرنے کے لیے فوجیوں کے پاس بھیج دیا اور پھر دوسرے لمحے نیزوں، بھالوں، بلموں، تلواروں اور کرپانوں سے مسلح حملہ آوروں کا وہی گروہ فوجیوں کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہوکر مخصوص اشارے سے اپنے مزید ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ آناً فاناً سکھوں اور ہندوؤں کی جنونی ٹولیاں نہتے مسافروں پر ٹوٹ پڑیں۔ ٹرین کے بیشتر ڈبوں کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے کی وجہ سے انہیں کچھ دقت ہوئی لیکن باہر سے بڑے بڑے پتھروں اور کلہاڑیوں کی مسلسل چوٹیں پڑنے سے ٹرین کے بوسیدہ تختے کب تک محفوظ رہ سکتے تھے۔ آخر کار تھوڑے ہی وقت میں ہر کمپارٹمنٹ کسی قصاب کی دکان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ حملہ آور اندر گھس کر مسلسل وار کر رہے تھے۔ کچھ حملہ آور

زخموں سے چُور مسافروں کو کھینچ کھینچ کر بوگی سے باہر نکال رہے تھے۔ بوگی کے سامنے بہت سے حملہ آور موجود تھے جو باہر گرنے والے مردوں اور عورتوں کے جسم نہایت بے دردی سے کاٹ کاٹ کر پرے پھینک رہے تھے۔

(ڈاکٹر زاہد امجد علی: جب امرتسر جل رہا تھا)

امرتسر سے لاہور تک پینتیس میل لمبی سڑک کے دونوں کناروں پر جا بجا لاشوں کے ڈھیر تھے۔ یوں لگتا تھا یہ سارا علاقہ ایک طویل و عریض مقتل میں تبدیل ہوگیا ہے۔ ہر طرف گلی سڑی لاشوں کی سڑانڈ پھیلی ہوئی تھی' راستے میں ایک ایک گز پر کوئی نہ کوئی لاش پڑی تھی۔ کسی شخص کی گردن کٹی ہوئی تھی۔ کوئی بدنصیب بھوک سے مرا تھا۔ سڑک کے کنارے پڑی ان لاشوں پر جا بجا گدھ منڈلا رہے تھے اور کتے ان کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔ مسلمان مہاجرین کے قافلے میں ایک بوڑھا تھا جو صرف ایک بکری ساتھ لا سکا تھا۔ راہ چلتے ہوئے بکری قافلے سے الگ ہوگئی۔ بوڑھا اسے پکڑنے کے لئے دوڑ رہا تھا۔ اچانک گنے کے کھیت میں سے ایک سکھ ہاتھ میں ننگی تلوار لے کر نکلا' بوڑھے آدمی کا سر تن سے جدا کر دیا اور بکری اُٹھا کر کھیت میں غائب ہوگیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔

(کیپٹن اینکنس: تاثرات)

تھوڑی دیر بعد قافلہ پھر روانہ ہوا۔ بہت سے بلوائی سڑک کے کنارے اُگی جھاڑیوں' لمبی گھاس اور تھوہر کے پودوں کے نیچے چھپے بیٹھے تھے۔ ایک آدمی پُل پر کھڑا ہوگیا اور برین گن سے ہوائی فائرنگ کرنے لگا۔ یہ گویا جتھوں کے لئے حملے کا اشارہ تھا۔ فوراً ہی چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ حملہ آور ٹرکوں پر چڑھ گئے اور جی بھر کر خون کی ہولی کھیلی۔ میں سب سے اگلے ٹرک میں بیٹھا ہوا تھا۔ حملہ پچھلی طرف سے شروع ہوا' حملہ آور بتدریج آگے بڑھ رہے تھے۔ جن بے چاروں نے بھاگنے کی کوشش کی' وہ بھارتی فوج کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہمارا ٹرک بھی گھیرے میں آ گیا۔ چند سکھ میری دو خالہ زاد بہنوں کو بالوں سے پکڑ کر زبردستی ساتھ لے گئے۔ خالہ نے انہیں پکڑنے کی کوشش کی' تو انہیں بھالے مار کر شہید کر دیا گیا۔ میرے چچا اور ان کی آٹھ سالہ بیٹی بھی شہید کر دیئے گئے۔ میرے بائیں کندھے اور پشت پر بھالوں کے چھ گہرے زخم آئے۔ میں ابھی ٹرک میں ہی تھا۔ جب باہر نکلنے کی کوشش کی' تو کلہاڑی کی ایک کند ضرب میرے سر پر پڑی اور میں بے ہوش ہو کر منہ کے بل نیچے سڑک پر گر پڑا۔ ہوش آیا تو دیکھا کہ سڑک اور نہر کا کنارہ کوئی ایک ہزار عورتوں اور بچوں کی لاشوں اور زخمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ میرے قریب ہی کنبے کے بارہ لوگ دوسرے افراد کی لاشوں کے درمیان مردہ پڑے تھے۔ میں بڑی دیر تک نیم بے ہوشی کی حالت میں وہیں سڑک پر پڑا رہا۔ حملہ آوروں نے میری تلاشی لی اور بٹوا اور دوسری چیزیں نکال کر لے گئے۔ جب ذرا حواس درست ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ڈوگرہ فوجی اور سکھ جتھے دار سب بڑھ بڑھ کر ٹرکوں میں لدا سامان لُوٹ

رہے تھے۔ یہ ہنگامہ ذرا سرد ہوا' تو سپاہیوں نے زخمیوں اور چھپے ہوئے مسلمانوں کو گھیر گھار کر ایک جگہ اکٹھا کیا اور انہیں ٹرکوں پر سوار کرانے لگے۔ میں اپنے کنبے کے زندہ بچ نکلنے والے افراد کے ساتھ بڑی مشکل سے ایک ٹرک میں سوار ہوا۔ میرے ایک چچا اور بہن جو شدید زخمی تھے' کسی طرح بھی ٹرک میں سوار نہ کرائے جا سکے۔ انہیں مجبوراً وہیں سڑک پر مرنے کے لئے چھوڑ دینا پڑا تاہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔

(محمد حمزہ: داستانِ آزادی)

بھرو کی ضلع امرتسر سے لُٹے پٹے مسلمانوں کا ایک قافلہ پاکستان کے لئے روانہ ہوا۔ اس قافلے میں اٹھارہ ہزار کے لگ بھگ افراد تھے۔ بھارتی فوج حفاظت کے لئے اس قافلے کے ساتھ تھی۔ انہوں نے قافلے کو قصداً امرتسر شہر کے بیچوں بیچ گزارا۔ جب یہ قافلہ عین شہر کے وسط میں پہنچا تو فوج پیچھے ہٹ گئی۔ اب مہاجرین عجیب کشمکش میں گرفتار تھے۔ پیچھے فوج' سامنے مسلح پولیس۔ چھتوں پر سے بپھرے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں نے ان پر جلتا ہوا تیل' اینٹیں اور پتھر پھینکنے شروع کر دیئے۔ یہ جان بچانے کے لئے آگے بڑھتے تو پولیس فائرنگ شروع کر دیتی' پیچھے ہٹتے تو فوج۔ وحشت ناک ڈرامہ اس وقت تک کھیلا جاتا رہا جب تک اس قافلے میں ایک مسلمان بھی زندہ نظر آتا رہا۔ کئی نہتے مسلمانوں نے لاشوں کے انبار تلے چھپ کر جان بچائی۔ میرے ماموں زندہ بچ نکلنے والے گنتی کے چند افراد میں شامل تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ''ولیا'' جو کہ سارے علاقے میں شہ زوری اور ڈانگ چلانے کے لئے مشہور تھا' اس کا پیٹ چرا ہوا تھا۔ آنتیں باہر نکل آئی تھیں اور جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ ماموں کو دیکھا تو بولا: ''شاہ جی! میرا یہ کھونڈا ہی پاکستان لے جائیں' یہی پاکستان کی زیارت کر لے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے زندگی کی آخری سانس لی۔

(پروفیسر ذوالفقار علی شاہ: سفرِ آزادی)

دہلی میں میرے خالو اور ان کا پورا خاندان قتل ہو گیا۔ ایک بچی زخمی حالت میں لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے ملی۔ ایک لڑکا نہ جانے کس طرح بچ نکلا۔ میں مراد آباد میں تھا۔ اس وقت مراد آباد اور لکھنؤ دونوں اس آگ سے محفوظ رہے مگر میرے چاروں طرف ہولناک خبروں کے انگارے بچھے ہوئے تھے۔ میرے بزرگ' میرے دوست مجھ سے پوچھتے تھے: ''تمہاری متحدہ قومیت کہاں ہے' تم تو کہتے تھے ہندو مسلمان کے دشمن نہیں ہیں' تم تو کانگریس کی دریا دلی اور فیاضی کے قائل تھے۔'' میرے چاروں طرف آگ تھی۔ میں اوپر والے کمروں میں پڑا گھنٹوں سوچتا رہتا اور کوئی جواب نہ پاتا۔ جو کچھ سوچتا' سمجھتا اور کہتا رہا تھا' وہ غلط ثابت ہو گیا۔

(ڈاکٹر محمد حسن ایم اے: آپ بیتی)

ریاست نابھہ کے گاؤں دھنولہ کے دس ہزار مسلمانوں کا ایک قافلہ پاکستان کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے میرِ کارواں میرے والد صاحب کے سگے ماموں مولانا محمد نذیر عرشی تھے۔ مولانا عرشی ایک جیّد عالم اور علم دوست ہستی تھے۔ قافلہ کوچ کرنے ہی والا تھا کہ سکھوں کا ایک گروہ آیا۔ انہوں نے

ریاستی پولیس سے کچھ بات چیت کی۔ یہ سب لوگ مسلح تھے۔ گروہ نے مولانا عرشی کے فرزند مرزا یعقوب کو قافلہ سے کھینچ لیا۔ ہزاروں افراد نے انہیں خود سے بچھڑتے دیکھا۔ ان درندوں نے مرزا یعقوب کی ناک کو کرپانوں کی نوک سے چھید کر اس میں نکیل ڈال دی اور یہ کہہ کر گھسیٹنے لگے: ''دے کے رہیں گے پاکستان۔'' وہ مرزا یعقوب کو اسی حالت میں گھسیٹتے رہے۔ ان کے جسم کو بلموں' بھالوں اور کرپانوں سے کچوکے دیتے رہے۔ مرزا یعقوب کے بدن سے خون کے فوارے پھوٹتے رہے مگر آفرین ہے' نہ وہ چیخے نہ وہ چلّائے' حتیٰ کہ ان کا جسم ٹھنڈا ہوگیا۔ مرزا یعقوب کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مسلم لیگی تھے' قیامِ پاکستان کے حامی تھے اور پُر جوش نعرے لگواتے تھے: ''لے کے رہیں گے پاکستان''۔ وہ دھنولا سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جن لوگوں نے اُن کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا' ان میں سے بیشتر اُن کے شاگرد تھے۔

(محمد ظفیر ندوی: واقعۂ ہجرت)

انڈین آرمی کی تقسیم کے بعد مجھے دس اگست 1947ء کو دیناپور (بہار) سے راولپنڈی تبدیل کر دیا گیا۔ جب واپسی پر میں انبالہ سے آگے بڑھا تو مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے ماحول میں سخت کشیدگی پائی جاتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ ان فسادات میں مسلمانوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور وہ خوفزدہ ہو کر اپنے گاؤں چھوڑ کر مہاجر کیمپوں میں پناہ لے رہے ہیں۔ کیمپوں کو جاتے ہوئے قافلوں پر بھی حملے کئے گئے۔ یہاں تک کہ مہاجر کیمپ بھی حملوں سے محفوظ نہیں تھے۔ میں مختلف ریلوے سٹیشنوں پر اترا اور اس سلسلے میں ضروری اطلاعات جمع کرتا چلا گیا۔ ان اطلاعات میں اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ بعض ہندو ریاستوں کی باقاعدہ فوج بھی اس قتل وغارت میں حصہ لے رہی ہے۔ پنجاب باؤنڈری فورس کو جو مسلمانوں پر مشتمل تھی' ختم کر دیا گیا۔ بھارت کے مہاجر کیمپوں سے آنے والے زیادہ تر قافلے پیدل آرہے تھے' جو راستے میں محفوظ نہ تھے۔ بیمار' نڈھال اور بوڑھے لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔ یہ بہت ہی دردناک منظر تھا۔ مجھے جب بھی وقت ملتا' ان لوگوں سے ملاقات کرتا۔ ان المناک مناظر کو دیکھ کر انسان کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہ تھا۔ لاہور ایریا میں ایک اہم مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ہمیں مختلف کاموں کی انجام دہی کے لیے مناسب تعداد میں مسلمان فوجی دستے درکار تھے۔ جو چند یونٹ ہمارے پاس تھے' وہ دن رات کام کرتے تھے۔ ان کا بیشتر وقت قافلوں کے ساتھ چلنے میں گزرتا' رات کو ان کی حفاظت کے لیے پہرے پر کھڑے ہوجاتے۔ اپنا راشن نیم فاقہ زدہ مہاجروں میں بانٹ کر کھاتے جن میں بہت سے ملیریا' ہیضہ اور اسہال کا شکار تھے۔ ان بے لوث افسروں اور جوانوں نے ان لوگوں کی خدمت اور حفاظت کر کے عزم و ہمت کا ایک ولولہ انگیز نمونہ پیش کیا۔ ان کے تعاون کے بغیر ہمارے لئے ان بے شمار لوگوں کو بحفاظت پاکستان لانا قطعی طور پر ناممکن تھا۔ ہمارا ایک قافلہ ایک لاکھ افراد پر مشتمل تھا اس میں چار ہزار پانچ سو

کے قریب بیل گاڑیاں تھیں۔ اس قافلے کا آخری حصہ ابھی امرتسر ہی میں تھا کہ اس کا ہراول حصہ واہگہ پہنچ گیا۔ یہ قافلہ تیس میل سے زیادہ لمبا تھا۔ قافلے کو ایک ایسے علاقے سے گزرنا تھا جہاں حد درجہ حفاظتی و احتیاطی اقدامات کی ضرورت تھی لیکن ہمارے پاس صرف ایک بٹالین تھی اور اس کی نفری بھی اتنی نہ تھی کہ مہاجروں کی حفاظت کر سکتی۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے اس بٹالین کو مزید گاڑیاں فراہم کر دی تھیں جس سے ان کے لیے کام کرنا آسان ہوگیا تھا۔ بھارت کے سخت اعتراض کے باوجود قافلے کے اوپر وقتاً فوقتاً طیاروں کی پرواز کا اہتمام کیا گیا' تاکہ قافلے اور حفاظت میں لانے والے فوجی دستے کے ساتھ دشمنانہ کاروائی نہ ہونے پائے۔ ان انتظامات سے یہ قافلہ صحیح سلامت پاکستان میں داخل ہوگیا۔

(پاک فوج کے سابق کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ کے مشاہدات)

قیامِ پاکستان کے وقت میں کراچی میں تھا۔ یوں تو قائدِاعظمؒ سے بارہا شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور ان کے ارشادات سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملا' مگر قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں ہندو مسلم فسادات اور پاکستان کے مختلف علاقوں میں ہونے والے پریشان کُن واقعات سے ہر شخص پریشان تھا۔ ان ایام میں خبروں سے زیادہ افواہوں کا زور تھا اور ہر روز کوئی نہ کوئی افواہ سننے کو ملتی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں آنے لگیں۔ سب دوست ان خبروں سے گھبرائے ہوئے تھے۔ دِلی سے آنے والی ٹرینوں کو بطورِ خاص روکا جارہا تھا اور مسلمانوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی' تو راجہ صاحب فون سننے چلے گئے۔ واپسی پر انہوں نے بتایا کہ لاہور سے بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں قتل و غارت کے بڑھتے ہوئے واقعات کی روک تھام کے لئے سردار شوکت حیات مسلح دستہ لے کر جارہے ہیں تاکہ مسلمانوں کا تحفظ کیا جاسکے۔ حالات کی خرابی کا اس سے اندازہ کریں کہ اس خبر سے بجائے پریشان ہونے کے سکون کا سانس لیا اور سمجھا کہ اس طرح شاید حالات پر قابو پانے میں مدد ملے۔

(میاں ارشد حسین: قیامِ پاکستان)

پاکستان بننے کے بعد عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موقع پر عوام میں بڑا جوش و جذبہ تھا۔ افواجِ پاکستان کے دستے بازاروں سے گزر رہے تھے۔ میں بھی جلوس دیکھنے کے لئے ایک جگہ کھڑا ہوگیا۔ میرے پاس ہی ایک سفید ریش بزرگ پھٹے پرانے کپڑے پہنے کھڑے تھے۔ جیسے ہی فوج کا دستہ ''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند کرتا ہوا گزرا' بزرگ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایک نوجوان بولا: ''بزرگو! یہ تو خوشی کا موقع ہے' آپ روتے کیوں ہیں۔'' بزرگ نے امڈے آنسوؤں کے سیلاب میں بہتے ہوئے جواب دیا: ''عزیزِ من خوشی کے آنسو ہیں' رنج کے نہیں۔ اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد یہ روح پرور منظر دیکھ رہا ہوں۔ بخدا میں اپنے آپ کو خسارے میں نہیں پاتا۔''

(نواب مشتاق احمد خان: کاروانِ حیات)

کشمیر: نامکمل ایجنڈا

حُر رضا

اِدھر پاکستان بن رہا تھا' اُدھر پاکستان کو کمزور کرنے کے منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ گورداسپور مسلمانوں کا اکثریتی ضلع تھا' اس کو پاکستان کا حصہ بننا چاہئے تھا مگر ریڈکلف ایوارڈ کے تحت وہ بھارت کو دے دیا گیا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخلے کا راستہ مل گیا۔ اگر گورداسپور بھارت کو نہ ملتا تو پورا کشمیر اپنے جغرافیائی عوامل کی وجہ سے خود بخود پاکستان کا حصّہ بن جاتا' اس طرح پاکستان اپنی سرحدیں مکمل کرتا اور تقسیمِ ہند کا ایجنڈا تکمیل کو پہنچ جاتا۔

23 مارچ 1940ء کو مسلمانانِ ہند نے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت میں جس اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور کی' اس میں کشمیری رہنما مولوی غلام حیدر جھنڈالوی نے تقریر کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند کے تاریخ ساز فیصلے کا خیر مقدم کیا اور یقین دلایا کہ جموں وکشمیر' جو کہ مسلم اکثریتی ریاست ہے' کے مسلمان اس قرارداد کو اپنی جدّوجُہد آزادی کی منزل بنا کر اس کے حصول کے لئے مسلمانانِ ہند کے دوش بدوش کسی قربانی سے گریز نہیں کریں گے۔ 1940ء میں سری نگر کے طلبہ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اسی سال اپریل میں فیڈریشن نے قراردادِ پاکستان کا خیر مقدم کرتے ہوئے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کو کشمیری طلبہ کی طرف سے یقین دلایا کہ وہ بھارت کے مسلمانوں کے قدم سے قدم ملا کر ملی نصب العین یعنی آزادی کے حصول کے لئے جدّوجُہد کریں گے۔

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ 17 جون 1944ء کو سری نگر پہنچے۔ مسلمانوں کی طرف سے ان کا والہانہ استقبال اس بات کا بھرپور اظہار تھا کہ مسلمانانِ کشمیر قائدِاعظمؒ کی قیادت میں برِّصغیر کے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی جدّوجُہد سے مکمل ہم آہنگی رکھتے تھے۔

14 اگست 1947ء کو پاکستان کے قیام کا تصور حقیقت بن کر اُبھرا تو یہ لمحہ جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے لئے انتہائی مسرت افزا تھا۔ سری نگر میں جنرل پوسٹ آفس اور کچھ دوسرے مقامات پر پاکستان کا پرچم لہرایا گیا۔ 19 جولائی 1947ء کو آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے کنونشن میں متفقہ طور پر منظور کی گئی قرارداد میں قیامِ پاکستان پر مسلمانانِ کشمیر نے

اپنے اطمینان اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے قائدِاعظمؒ کو مبارک باد پیش کی اور اعلان کیا کہ ریاست کی آبادی کا اسّی فیصد حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور ریاست کے عوام پاکستان کے عوام کے ساتھ مذہبی' ثقافتی اور اقتصادی رشتوں میں مضبوطی سے بندھے ہوئے ہیں' اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کا الحاق پاکستان سے کرایا جائے۔

پاکستان بننے کے وقت ریاست جموں وکشمیر میں تحریکِ پاکستان کے نام پر پورے پندرہ ماہ مسلح جِدّ وجُہد جاری رہی جس کے نتیجہ میں 32 ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا علاقہ آزاد ہوا۔ اس علاقے کو آزاد کشمیر' گلگت اور بلتستان کہتے ہیں۔ یہ 62 سال سے پاکستان کے زیرِ انتظام ہے۔

یہ بات کچھ غیر اہم نہیں کہ کشمیریوں کی تحریک کا محور کبھی بھی کوئی علاقائی یا اقتصادی مسئلہ نہیں رہا۔ بنیادی نکتہ ہمیشہ یہ رہا کہ کشمیریوں نے بھارت کو مسترد کیا اور پاکستان کو اپنا ملک سمجھا۔ باوجود اس کے کہ ہندو کشمیر میں بھارت کی جڑوں کو مضبوطی بخشتے رہے' مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور کشمیر کو بھارت کے قومی دھارے میں شامل کرنے کے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ومشغول رہے۔ لہٰذا بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر کشمیر کے مسئلے کو اس کے تاریخی پس منظر سے ہٹایا گیا تو اس کی اصل شناخت ختم ہوجائے گی۔

قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے 14 دسمبر 1947ء کو فرمایا:

کشمیر کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظرانداز نہیں کرسکتا کہ کشمیر تمدنی' ثقافتی' جغرافیائی' معاشرتی اور سیاسی طور پر پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ جب بھی اور جس نقطۂ نظر سے بھی نقشہ پر نظر ڈالی جائے گی' یہ حقیقت واضح ہوتی جائے گی کہ کشمیر سیاسی اور دفاعی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ یہ جذباتی نعرہ یا شاعرانہ ترکیب واستعارہ نہیں۔ کوئی ملک اور قوم برداشت نہیں کرسکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے دے دے۔ کشمیر پاکستان کا ایک حصہ ہے جسے پاکستان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ مجھے یہ کہتے

> 1947ء کے بعد سے اب تک کسی ایک ایسی قابلِ لحاظ تحریک کا تو کیا' مجھے کسی ایسے ایک بھی عوامی مظاہرے کا حوالہ نہیں ملا جس سے یہ ظاہر ہو کہ آزاد علاقے کے لوگوں نے پاکستان کے خلاف کوئی آواز اُٹھائی ہو' جبکہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان 1947ء کے بعد سے مسلسل سراپا احتجاج ہیں۔ اُن کی یہ جِدّ وجُہد اس بات کی گواہ ہے کہ ان کی وابستگی پاکستان کے ساتھ ہے اور وہ بھارت کے قومی دھارے میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں۔ مُوئے مقدّس کی چوری جیسا دینی معاملہ ہو' اسرائیلیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بے حُرمتی کا واقعہ' یا کشمیر کے کسی کالج میں انتظامیہ کے خلاف طلبہ کی شکایتوں جیسا مقامی مسئلہ' جو بھی مظاہرے ہوئے' کشمیری مسلمانوں نے بھارت مردہ باد' پاکستان زندہ باد اور اسلام زندہ باد کے نعرے بلند کئے۔ یہی صورت میں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان کھیلے جانے والے کرکٹ میچوں کے درمیان اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سُنی ...
>
> (ٹونی کلفٹن: کشمیر کے زمینی حقائق۔ 'نیوز ویک' یکم جون 2009ء)

ہوئے قطعاً ہچکچاہٹ نہیں کہ ریڈ کلف ایوارڈ میں مسلمانوں کے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے۔ گورداسپور کے ایک ایسے حصے کو جو آبادی کے لحاظ سے مسلم اکثیرت کا علاقہ تھا' محض اس لئے بھارت کے حوالے کر دیا گیا کہ بھارت کو کشمیر کے معاملات میں مداخلت کی آزادی مل سکے۔ پاکستان نے ریڈ کلف ایوارڈ کو دیانتداری سے تسلیم کیا تھا' لیکن بھارت کی نیت میں شروع سے ہی فتور تھا' اس فتور کا ثبوت کشمیر پر بھارت کا غاصبانہ قبضہ ہے۔ ہم اپنے اس حق سے کبھی بھی دست بردار نہ ہوں گے۔

قائدِ اعظمؒ کا یہ بیان جیسا کہ انہوں نے خود کہا' کوئی جذباتی نعرہ نہیں۔ تاریخی' جغرافیائی' سیاسی' اقتصادی' دینی' قانونی' اخلاقی' دفاعی غرض ہر لحاظ سے کشمیر پاکستانی کی شہ رگ ہے۔

1947ء میں تقسیمِ برِّصغیر کے وقت جن اصولوں کی بنیاد پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا' ان کی رُو سے 85 فیصد غالب مسلم اکثریت کی ریاست جموں وکشمیر کو بہر صورت پاکستان میں شامل ہونا چاہئے' ورنہ نظریۂ پاکستان بھی نامکمل رہے گا اور خود پاکستان بھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے خود بھارت کے انصاف پسند دانشور بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مشہور دانشور ڈی۔ ایف کڑاکا کی کتاب BETRAYAL IN INDIA کا حسبِ ذیل اقتباس:

اگر اس نظریے میں جس کے مطابق ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی تھی' یعنی یہ کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے' کوئی جواز اور صداقت موجود ہے تو کشمیر لازماً پاکستان ہی کا حصہ ہے اور اگر کشمیر پاکستان میں شامل نہیں ہوتا تو ہم اس نظریے کی بنیاد ہی ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جس پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا' پس جہاں بھارت کشمیر کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے' وہاں کشمیر کے بغیر پاکستان کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کشمیر میں استصواب رائے سے متعلق اقوامِ متحدہ کے کمیشن کے چیئرمین مسٹر جوزف کاربل اس حقیقت کو اپنی کتاب DANGER IN KASHMIR میں بیان کرتے ہیں:

اگر کشمیر کی جنگ کسی علاقے کو حاصل کرنے یا قومی وسائل اور اہم مقامات پر قبضہ کرنے کی جنگ ہوتی یا اس کا مقصد وہ فوائد حاصل کرنا ہوتا جن کی خاطر قومیں ہمیشہ آپس میں لڑتی چلی آئی ہیں' تو یہ مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا لیکن ان ساری صورتوں میں سے کوئی صورت بھی صحیح نہیں ہے۔ جو چیز مسئلہ کشمیر کو نا قابلِ حل بنا رہی ہے اور دونوں فریقوں کے درمیان تلخ کشمکش کا باعث بنتی ہے' وہ روایتی بین الاقوامی جھگڑوں سے الگ ہے۔ اس کی اصل وجہ دو الگ الگ نظریہ حیات' دو الگ الگ سیاسی تصورات' دو جداگانہ معیارات اور دو الگ الگ رویوں کے درمیان کشمکش ہے جو کسی صلح اور سمجھوتے سے ختم نہیں

ہوسکتی۔اس تصادم اور کشمکش کا اظہار آج ایک مہلک تنازعے کی صورت میں ہو رہا ہے...ایک ایسا تنازع' کشمیر جس کی علامت بھی ہے اور میدانِ جنگ بھی۔

نظریاتی پہلو کے علاوہ اقتصادی اعتبار سے بھی کشمیر پاکستان کے لئے زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اقتصادی اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان میں بہنے والے دریا جن پر پاکستان کی زراعت' توانائی اور صنعتوں کا دارومدار ہے' کشمیر سے نکلتے یا گزر کر آتے ہیں۔اگر خدانخواستہ بھارت ان دریاؤں کا رخ موڑنے میں کامیاب ہوجاتا ہے جو سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں کچھ مشکل نہیں' تو پاکستان کے سونا اُگلتے کھیت ریگستانوں اور کارخانے اور صنعتی مراکز کھنڈروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ تمام شہر اور قصبے تاریکیوں میں ڈوب جائیں گے۔اسی طرح اگر بھارت نے ان دریاؤں پر غیر قانونی طور پر تعمیر کردہ ڈیموں اور بندوں کے گیٹ کھول دیئے' تو پاکستان کے کئی اہم شہر اور دیہات سیلاب میں ڈوب جائیں گے۔

تقسیمِ ہند کے بعد پورے باسٹھ سال تک آزادیِ کشمیر کا مطلب پاکستان کے ساتھ الحاق لیا گیا ہے۔ کشمیر کے عوام بھی یہی سمجھتے ہیں اور پاکستان اور بھارت کی حکومتیں اور عوام بھی آزادی کا مطلب الحاقِ پاکستان ہی لیتے آرہے ہیں۔ بین الاقوامی اداروں میں مسئلہ کشمیر جیسے پیش ہوا' اس پر جس طرح بحثیں ہوئیں اور جس اسلوب اور جس زبان میں کشمیر پر قراردادیں منظور کی گئیں' اس نے بین الاقوامی منظر پر بھی کشمیر کے مسئلہ کا جو تعارف پیش کیا' اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ کشمیری عوام بھارتی قبضے کی مزاحمت کررہے ہیں اور وہ پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہیں۔ جنوری 1949ء کی اقوامِ متحدہ کی قرارداد میں مسئلہ کشمیر کا واحد حل یہی بتایا گیا۔ایسی وضاحت کے ساتھ تیسرے راستے کا تذکرہ کسی بھی بین الاقوامی قرارداد میں کہیں نہیں ملتا۔ یہاں بتانا ضروری ہے کہ سری نگر پر قبضہ اور یوں کشمیر بھارت کے ہاتھوں سے نکل ہی رہا تھا کہ بھارت نے اقوامِ متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا' پاکستان نے نہیں۔اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے ساتھ بڑی بحث وتمحیص کے بعد بھارتی وزیرِاعظم پنڈت نہرو نے اپنے منہ سے کہا تھا کہ بھارت کے

> ...دفاعی اعتبار سے دیکھا جائے تو کشمیر پاکستان کے لئے دفاعی حصار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ تسلط کے استحکام اور دوام کی صورت میں نہ پاکستان کی ایٹمی تنصیبات خطرے سے باہر اور نہ دارالحکومت اسلام آباد۔ پاکستان اور چین کو ملانے والی شاہراہِ ریشم بھارتی جارحیت سے بچ سکتی ہے اور نہ پاکستان کی جی ٹی روڈ اور ریلوے لائن۔ پاکستان کے لئے کشمیر کی اہمیت کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی بنیاد پر قائدِاعظمؒ نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ 1947ء میں بھارت کی طرف سے کشمیر پر غاصبانہ تسلّط کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ پاکستان کی شہ رگ پر قبضہ کرکے وہ پاکستان کو ختم کرنا چاہتا تھا۔
>
> (ڈاکٹر منیرالدین چغتائی: کشمیر کا مقدمہ' ہلال' 14 اگست 1998ء)

ساتھ کشمیر کا الحاق عارضی ہے۔ جب حالات ٹھیک ہوں گے تو استصوابِ رائے ہوگا' رائے شماری ہوگی۔ اس پر سلامتی کونسل میں قرارداد پاس ہوئی کہ حالات سازگار ہوتے ہی کشمیریوں کو ان کا حقِ خود ارادیت دیا جائے گا۔ رائے شماری کے لئے ایڈمرل نمٹز کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا۔

مقبوضہ کشمیر میں بھارتی سامراج کے غاصبانہ تسلّط کے خلاف جاری موجودہ تحریکِ آزادی خود پاکستان کی تکمیل اور بقاء و سالمیت کی جنگ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کشمیر اور پاکستان میں کوئی فرق نہیں اور کشمیر میں پاکستان کے مستقبل کی فیصلہ کن لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ اسے کمزور کرنے والے اور اس سے جان چھڑانے والے کشمیر سے نہیں' پاکستان سے بے وفائی کے مرتکب ہوں گے۔ پاکستان کی دفاعی صلاحیت میں تھوڑی سی بھی کمی کشمیر اور پاکستان دونوں کے لئے تباہ کن ہو سکتی ہے۔ یہ وہ جال اور چال ہے جو دشمن کے جارحانہ حملے سے بھی زیادہ خطرناک ہے!

اگر خدانخواستہ بھارتی سامراج تحریکِ آزادی کو کچلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' تو پھر اس کے بعد بھارت کا اگلا ہدف آزاد کشمیر ہوگا... پھر پاکستان۔ اس اعتبار سے کشمیری مسلمان اس وقت اپنی آزادی اور حقِ خود ارادیت کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بقاو سالمیت کی جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔

مسلمانانِ کشمیر کی تائید و حمایت کرنا اخلاقی لحاظ سے بھی اہلِ پاکستان پر لازم ہے۔ اس لئے کہ اقوامِ متحدہ کی جن قراردادوں کی رُو سے یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں آزادانہ رائے شماری کے وعدے پر مسلمانانِ کشمیر کے جہادِ آزادی کو عارضی طور پر بند کروایا گیا تھا' اس میں پاکستان نے باقاعدہ ایک فریق کی حیثیت سے یہ ذمے داری قبول کی تھی کہ وہ کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت سے متعلق ان قراردادوں پر عملدرآمد کرائے گا۔ اقوامِ متحدہ کی ان قراردادوں میں پاکستان کی حیثیت صرف ایک فریق کی ہی نہیں' بلکہ کشمیری مسلمانوں کے وکیل اور مختارِ عام کی بھی ہے۔ پھر 1951ء میں حکومتِ آزاد کشمیر اور حکومتِ پاکستان کے درمیان کراچی میں ہونے والے معاہدے کی رُو سے حکومتِ پاکستان نے کشمیر مسلمانوں کے حقِ خود ارادیت کے وکیل اور مختارِ عام کی حیثیت سے اپنی اس ذمے داری کی دوبارہ توثیق بھی کر دی تھی۔ اس لئے پاکستان اخلاقی اعتبار سے بھی مسلمانانِ کشمیر کی حمایت کا پابند ہے۔

واضح الفاظ میں بات کی جائے تو یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ کشمیر کوئی الگ ملک نہیں جس کو پاکستان کے ساتھ ملانا ہے۔ دراصل پاکستان کشمیر کے بغیر نامکمل ہے اور کشمیر پاکستان کے بغیر ادھورا۔ تاریخ کا تسلسل یہی بات دُہرا رہا ہے اور لوگوں کے مفاد کے نقطہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو یہی بات دونوں خطوں کے عوام کے مفاد میں ہے۔ بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق ایک غیر فطری عمل ہے جب کہ پاکستان کے ساتھ اس کا ملنا ایک طبعی اور فطری امر حقیقت پسندی کے تقاضے کے طور پر تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کشمیر پاکستان کا جزوِ لاینفک (ناقابلِ علیحدگی حصہ) ہے۔

گوشۂ قیادت

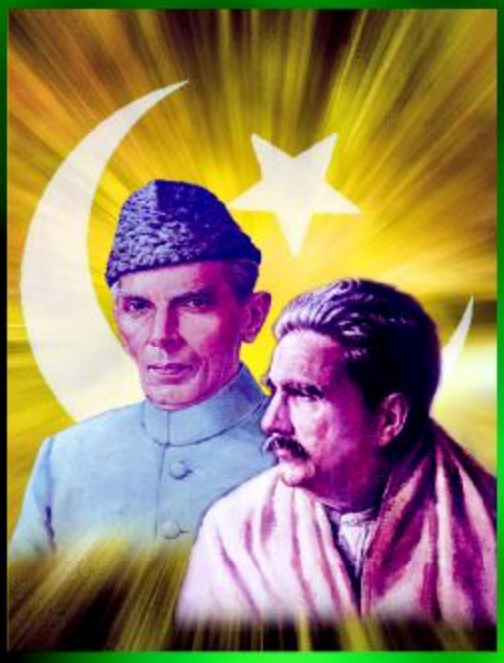

روحِ قائدؒ سے مکالمہ

نسٹیئن:

محترم قائدِاعظم! قومی زندگی کے انتہائی نازک لمحوں میں آج ہم مختلف قومی معاملات پر آپ سے رہنمائی کے لئے ملتمس ہیں۔ براہِ مہربانی فرمایئے کہ ہم سنگین ترین مسائل کا شکار کیوں ہو گئے ہیں؟

قائدِاعظم:

اگر ہم خود کو پنجابی، پٹھان، بنگالی، سندھی اور بلوچی وغیرہ پہلے اور مسلمان و پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان کو سنگین ترین مسائل کا شکار ہونا ہوگا۔ اسے کوئی معمولی بات قرار دے کر ٹالئے نہیں۔ اس کی شدتوں اور امکانات سے ہمارے دشمن بخوبی آگاہ ہیں۔ میں آپ کو متنبہ کر رہا ہوں کہ بھارت کی ایجنسیاں مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنے سے نہ روک سکیں، تو اَب یہ اپنے دوسرے ہتھکنڈوں اور پُرفریب پراپیگنڈے سے پاکستان کا شیرازہ بکھیرنے پر تلی ہوئی ہیں اور اس کے لئے انہوں نے پرانا طریقہ اختیار کیا ہے، یعنی ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے خلاف اکسانا...(1)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! بعض عناصر علاقائی لگاؤ کو صوبہ پرستی اور صوبائیت کے جواز کے طور پر پیش کرتے ہیں!

قائدِاعظم:

... علاقائی لگاؤ کی اپنی اہمیت ہے، لیکن ملک کے ہر حصے کی بہتری پورے ملک کی بقا کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے مقامی، علاقائی اور صوبائی مفادات کو قومی مفادات سے زیادہ اہمیت نہ دی جائے(2)...اپنے صوبے سے لگاؤ اور اپنے وطن سے محبت کے درمیان امتیاز کرنا سیکھئے۔ یاد رکھئے ملک سے وابستگی کے بعد ہی صوبے، ضلعے، شہر، گاؤں اور فرد کی باری آتی ہے۔ قدرت نے ہمیں آزادی عطا کی ہے۔ اب ہم سب پاکستانی ہیں، نہ کہ بلوچی، پٹھان، سندھی... یا پنجابی۔ لازم ہے کہ ہماری سوچ اور طرزِ عمل وسیع تر ہو، ایک پاکستانی جیسی ہو۔(3)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! آپ دیکھ رہے ہیں کہ کہیں کہیں سوچ کا

دائرہ زیادہ ہی وسیع اور طرزِ عمل آزادی کی حدوں سے باہر نکلتا نظر آ رہا ہے...

قائدِ اعظم:

آزادی کا مطلب بے لگامی نہیں۔ آزادی کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ مملکت کے مفادات کو نظر انداز کر کے جو چاہیں کرتے پھریں...(4) مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ آزادی کے وسیع مواقع اور ذمہ داریوں کا احساس کرنے کے بجائے اسے من مانی کا پروانہ سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ غیر ملکی تسلط سے نجات حاصل کر کے عوام اپنی تقدیر کے مالک بن گئے ہیں، انہیں آئینی ذرائع سے اپنی پسند کی حکومت قائم کرنے کا اختیار ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ کوئی طبقہ یا گروہ غیر قانونی طریقے سے اپنی مرضی مسلط کرے...(5) پاکستان پر غنڈوں، بے مہار گروہوں یا ہجوم کو بادشاہی چلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ حکومتِ پاکستان کو اپنے تمام تر ذرائع بروئے کار لا کر پوری قوت سے ایسے عناصر سے نمٹنا ہوگا۔(6)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! بے مہار گروہوں کی شرانگیزی نے ہر پاکستانی کو درد و کرب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس مسئلے کا حل؟

قائدِ اعظم:

ہمیں جن دشواریوں کا سامنا ہے، اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔ درد و کرب میں مبتلا ہونا فطری سی بات ہے۔ خرابی ہمارے اندر ہے، ہمیں خود اسے دُور کرنا ہے۔ ہماری صفوں میں نظم و ضبط اور اتحاد کی جتنی ضرورت آج ہے، اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ متحد ہو کر اور ہر قدم پر خود اپنا احتساب کر کے ہر مسئلے کو حل کیا اور تمام مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔(7)

نسٹیئن:

خود اپنا احتساب کس طرح کیا جا سکتا ہے، قائدِ محترم؟

قائدِ اعظم:

ضمیر سے بڑھ کر انسان کا کوئی محتسب نہیں۔ اس کے لئے ہر دم تیار رہیں تا کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں، تو یہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! مَیں نے خلوصِ نیت، دیانت داری، وفاداری، ذمہ داری اور تن دہی سے اپنا فرض سرانجام دیا۔(8)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِ اعظم! آپ نے فرمایا کہ خرابی ہمارے اندر ہے۔ براہِ کرم خرابی کی نشاندہی اور اس کے خاتمے کا علاج بھی تجویز فرما دیجئے۔

قائدِ اعظم:

آپ کے درمیان کچھ پانچویں کالم کے لوگ ہیں اور کتنے افسوس کی بات ہے کہ وہ مسلمان ہیں اور اپنی کارگزاریوں کے لئے روپیہ باہر سے حاصل کر رہے ہیں۔ پاک سرزمین پر ہم ان منافقوں اور ففتھ کالمسٹوں کو برداشت نہیں کریں گے، ہرگز نہیں کریں گے اور اگر یہ سب کچھ بند

نہ ہُوا تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی حکومت' آپ کی اپنی حکومت' ان کو بے دردی اور سختی سے کچلنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرے گی' کیوں کہ یہ لوگ ہمارے لئے زہر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں...(9) آپ اپنا اخلاق ہر صورت میں بلند رکھیں۔ موت سے نہ ڈریں۔ ہمارا دین یہی سکھاتا ہے کہ ہمیں موت کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔ مسلمان کے لئے خیر و فلاح کا اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں ہوسکتا کہ وہ حق کی خاطر شہید کی موت مر جائے۔(10)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! پاکستان کے بیٹوں نے ففتھ کالمسٹوں کو جس دلیری سے للکارا اور موت کو جس بے خوفی سے گلے لگایا ہے' اس سے آپ مطمئن تو ہوئے ہوں گے!

قائدِاعظم:

میرے تمام جذبات اُن بہادر مجاہدین کی طرف لگے ہوئے ہیں جنہوں نے کھلے دل اور بے پناہ دلیری سے اپنی پیاری زندگی تک کو اسلام اور پاکستان پر قربان کر دیا۔ مَیں یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان ہمیشہ ہمیشہ اُن کا ممنون رہے گا۔ اُن پیاروں کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ میرا ایمان ہے کہ اُن کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔(11)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! بھارت' افغانستان اور کچھ باوسیلہ ممالک ہمیں مغلوب کرنے کے لئے ہمارے اندرونی امن اور بیرونی سلامتی کے منافی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئے؟

قائدِاعظم:

ہم ان کی تمام سرگرمیوں کا مقابلہ کریں گے' مصائب جھیلیں گے۔ راستے میں ہمیں مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑے گا' ہمیں نقصان بھی برداشت کرنا پڑے گا' لیکن کوئی طاقت ہمیں مغلوب نہ کر سکے گی۔ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قائم رہے گا۔(12)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! یہی قوتیں ہمیں تنہا کرنے اور دباؤ ڈالنے کے لئے عالمی سطح پر بھی نت نئی مشکلات پیدا کر رہی ہیں' ایسے میں ہمارا لائحۂ عمل کیا ہو؟

قائدِاعظم:

جب پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اشاعتِ اسلام کی ابتداء کی' تو وہ تنہا تھے' ساری دنیا دشمن تھی اور ہر طرح کا دباؤ ڈالے ہوئے تھی' لیکن قوتِ ایمانی کے بَل پر آپؐ نے کُل عالَم کو للکارا اور قرآنی تعلیمات کے ذریعے انتہائی قلیل مدت میں عظیم ترین انقلاب برپا کر دیا۔ ہم اپنے اندر ایمان کی قوت' اتحاد' نظم و ضبط اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر لیں تو دنیا بھر کی مخالف قوتوں سے ڈرنے یا اُن کے پاؤں

پڑنے کی بالکل ضرورت نہ ہوگی۔ (13)... ہاں ہم پلہ اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے ہم کسی بھی دوسرے ملک کے ساتھ باہمی مفاہمت کے معاہدے پر تیار ہیں...(14)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! اختلافات اور تنازعات کو پُرامن طور پر طے کرنے کیلئے کیا بھارت کے ساتھ بھی کوئی معاہدہ کیا جاسکتا ہے؟

قائدِ اعظم:

...بشرطیکہ حکومتِ بھارت احساسِ برتری کو ختم کردے پاکستان کو برابر کا سمجھے اور اصل حقائق کا سامنا کرے... باعزت معاہدہ ان ہی میں ہوسکتا ہے جو برابر کے ہوں۔ جب تک فریقین ایک دوسرے کی عزت کرنا اور ایک دوسرے سے ڈرنا نہ سیکھیں' اس وقت تک کوئی معاہدہ ٹھوس بنیاد پر طے نہیں پاسکتا۔ کمزور فریق کی جانب سے امن وصلح کی پیش کش کا مطلب کمزوری کا اعتراف اور جارحیت کو حملہ کرنے کی ترغیب دینا ہوتا ہے ... (15) غیروں کے اشارے پر زندگی بسر کرنے پر آمادگی کا اظہار اور قومی مفادات کی پروا کئے بغیر دوسروں کی ہر بات مانتے چلے جانا قومی خودمختاری کا سودا کرنے کے مترادف ہے...(16)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! بعض اوقات لگتا ہے منہ زور قوتیں قومی مفادات کے منافی منصوبے اور حل ہم پر ٹھونسا چاہتی ہیں!

قائدِ اعظم:

مَیں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی اس امکان کو تسلیم نہیں کیا کہ ہم اس ملک میں کسی قسم کے غیرملکی تسلط یا منصوبے کے تحت زندگی گزار سکتے ہیں۔ اگر ایسا کوئی منصوبہ یا حل ہم پر ٹھونسا گیا جو ہمارے قومی مفادات کے منافی ہُوا' تو ہم پوری قوت سے اس کی مخالفت کریں گے اور تمام تر نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہیں گے۔(17)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِ اعظم! مسئلہ کشمیر' دریائی پانی اور ایٹمی صلاحیت کے حوالے سے ہر روز کوئی نیا اعلان' نرالا مشورہ سنائی دیتا ہے...

قائدِ اعظم:

... ہم نے جو موقف اختیار کر رکھا ہے' اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی منزلِ مقصود سے کوئی بھی طاقت بھٹکا نہیں سکتی۔ ہم نے ہر قیمت پر قومی مفادات کی نگہداشت اور حفاظت کا تہیہ کر رکھا ہے...(18)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! ہمارے معاملات میں کھُلم کُھلا غیرملکی مداخلت پر بین الاقوامی برادری حتیٰ کہ اقوامِ متحدہ تک نے آنکھیں موند رکھی ہیں...

قائدِ اعظم:

اقوامِ متحدہ کا ادارہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو' اپنے استحکام

اور دفاع کی بنیادی ذمہ داری تو ہماری ہی رہے گی...(19) ... پاکستان کو تمام خطرات اور آنے والے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیشہ' ہر طرح سے تیار رہنا ہوگا۔ اس دنیا میں کمزوری اور نہتا پن دوسروں کو حملہ کرنے کی دعوت دینے کا دوسرا نام ہے۔ امنِ عالم اور ملکی دفاع کی بہترین خدمت یونہی کی جاسکتی ہے کہ ہم اُن لوگوں کو جو ہمیں کمزور سمجھ کر دبا لینے یا ہم پر چھا جانے کی نیّت رکھتے ہوں' ایسا موقع ہرگز نہ دیں۔ یہ صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب ہم اتنے مضبوط ہو جائیں کہ کسی کو ہماری طرف بری نیّت سے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکے...(20) ہمارے اندرونی اور بیرونی حالات تسلی بخش نہیں ہیں' لیکن کیا ہم پریشانی میں مبتلا ہو کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ پاکستان کے مرد' عورتیں' اقلیتیں اور طلبہ غرض ہر شعبۂ زندگی سے وابستہ ہر فرد یک سُو ہو کر پوری پوری دیانتداری سے اپنا اپنا کردار ادا کرے اور اس نصب العین کو کبھی نہ بھولے: کام' کام اور کام۔(21)

نسٹیئن:

آپ نے خواتین کو اپنا کردار ادا کرنے کی ہدایت کی' عصرِ حاضر میں خواتین کو کیا کرنا ہے' قائدِ محترم؟

قائدِاعظم:

قوم کی تعمیر و ترقی کے عظیم کام میں خواتین کو انتہائی اہم کردار ادا کرنا ہے۔ کوئی بھی قوم اُس وقت تک عظمت کی بلندیوں کو نہیں چُھو سکتی جب تک اس کی خواتین مردوں کے شانہ بشانہ قوم کی خدمت میں مصروف نہ ہوں...(22)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! شانہ بشانہ کے حوالے سے بعض تحفظات پائے جاتے ہیں...

قائدِاعظم:

... مَیں یہ نہیں کہتا کہ آپ مغربی طرزِ زندگی کی برائیوں کی نقالی کریں' خود اسلام نے حقوقِ نسواں کے جو معیار مقرر کئے ہیں' ہم ان کے مطابق اپنی خواتین کا رتبہ بلند کر سکتے ہیں...(23)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! آپ نے اقلیتوں کا ذکر بھی کیا' ان کے کردار کی وضاحت فرما دیجئے۔

قائدِاعظم:

ہم اقلیتوں کے جان و مال کا تحفظ کرتے رہیں گے اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک جاری رہے گا۔ حقوق و مراعات کے ساتھ وہ فرائض بھی اُن کے ذمے ہوں گے جو پاکستانی شہری ہونے کے ناتے ان پر عائد ہوتے ہیں۔ ان فرائض کو پورا کر کے وہ امورِ مملکت میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں۔ جب تک اقلیتیں ملک کی وفادار رہیں گی' انہیں کسی قسم کا خوف یا تشویش نہیں ہونی چاہئے۔(24)

نسٹیئن :

محترم قائدِاعظم! بجا فرمایا آپ نے۔شہنشاہِ اکبر نے بھی غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا۔ غیر مسلم آج بھی اس کا حوالہ دیتے ہیں...

قائدِاعظم:

... شہنشاہِ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس رواداری اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا' وہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔اس کی ابتداء تیرہ سو سال پہلے پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کی۔ آپؐ زبانی نہیں' بلکہ عملی طور پر مفتوح غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی رواداری سے پیش آئے اور ان کے مذہب اور عقائد کا احترام کیا۔ جہاں جہاں بھی مسلمانوں نے حکومت کی' وہاں کی تاریخ ان عظیم اور شائستہ اصولوں کی مظہر ہے جن پر اب بھی عمل ہونا چاہئے۔(25)

نسٹیئن :

قائدِ محترم ! آپ نے طلبہ کو بھی اپنا کردار ادا کرنے کی ہدایت فرمائی' ذرا تفصیل مرحمت فرما دیجئے ان کے کردار کی؟

قائدِاعظم:

مَیں طالب علموں کو متنبّہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کسی کا بھی آلۂ کار بن گئے تو یہ اُن کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔اپنی صفوں میں مکمل اتحاد اور استحکام پیدا کریں۔ایمان' اتحاد' تنظیم کے اصولوں پر کاربند رہ کر آگے بڑھتے جائیں اور ایک مثال قائم کر دیں کہ پاکستان کے نوجوان کیا کچھ کر سکتے ہیں۔اُن کا اصل کام ہونا چاہئے :اپنی ذات سے وفا' اپنے والدین سے وفا' اپنی مملکت سے وفا' اپنے مطالعے پر پوری پوری توجہ...(26)

نسٹیئن :

... محترم قائدِاعظم ! پاکستان سے وفا تو ہمارا خواب ہے' ہمارا...

قائدِاعظم:

... محض خواب دیکھنے اور تصوراتی دنیا میں بسے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا... اپنی تعلیم پر پورا دھیان دیں۔تعلیم ہماری قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔دنیا اتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے کہ اگر آپ نے اپنے آپ کو تعلیم یافتہ نہ بنایا' تو نہ صرف پیچھے رہ جائیں گے' بلکہ خدانخواستہ بالکل ختم ہو جائیں گے۔...(27) دیانت' محنت' مستقل مزاجی اور کردار چار ایسے ستون ہیں جن پر کامیاب انسانی زندگی کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔آپ اپنے کردار کو مثالی بنا لیں گے تو دیگر تین صفات خود بخود آپ میں جمع ہو جائیں گی۔(28)

نسٹیئن :

جنابِ قائدِاعظم! کردار کیا ہے؟

قائدِاعظم:

''... کردار نام ہے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر قربان کر دینے کا' دیانتداری' مضبوط عقیدے اور عزتِ نفس کا...''(29)

نسٹیئن:

جنابِ محترم! حالیہ عالمی اقتصادی بحران نے پاکستان کی معیشت پر بھی ضرب لگائی ہے۔ہمیں معاشی خوشحالی اور معاشرتی اطمینان کے لئے کیا طریق کار اختیار کرنا چاہئے؟

قائدِاعظم:

مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لئے بے شمار مسائل پیدا کر دیئے ہیں اور اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔مغرب کی وجہ سے ہی یہ تباہی ساری دنیا کے سر پر منڈلا رہی ہے۔مغربی نظام انسانوں کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دُور کرنے میں ناکام رہا ہے۔ ... [1914ء اور 1939ء میں برپا ہونے والی] دونوں عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب اور مغربی نظام پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی مہارت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین بُحران میں مبتلا ہے۔اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور مالی نظام ہی اپنا لیا تو عوام کو خوشحالی مہیا کرنے کے لئے ہمیں کوئی مدد نہ ملے گی۔اپنی تقدیر ہمیں اپنے منفرد انداز میں بنانا ہوگی۔ہمیں دنیا کے سامنے ایک مثالی معاشی نظام پیش کرنا ہے جو انسانی مساوات اور معاشی انصاف کے سچّے اسلامی تصورات پر قائم ہو...(30) پاکستان کے ہر شعبے کی بنیاد عدل و انصاف اور برابری و مساوات پر ہونی چاہئے۔دولت چند ہاتھوں میں اکٹھی نہ ہونی چاہئے۔لوگوں کے معیارِ زندگی میں کم سے کم فرق ہو۔مَیں ہر پاکستانی کے لئے منصفانہ اور یکساں مواقع کا حامی ہوں۔(31)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری...

قائدِاعظم:

یہاں مَیں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسے ظالمانہ اور شر پسند نظام کی پیداوار ہیں جس کی بنیادیں ہمارے خون سے اُٹھائی گئی ہیں۔عوام کا استحصال ان کی رگوں میں خون بن کر گردش کر رہا ہے۔کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ لاکھوں لوگ معاشی ظلم کا شکار ہو کر دن بھر کی محنت کے باوجود ایک وقت کی روٹی کو بھی ترستے رہیں؟ کیا پاکستان کا یہی مطلب ہے؟...(32) ... قیامِ پاکستان کی کٹھن جِدّ وجُہد میں عوام ہی تھے جنہوں نے رضا کارانہ طور پر میرا ساتھ دیا، خواص سب سے آخر میں آئے۔ (33)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِ اعظم! عمومی بدامنی اور انفرادی لاقانونیت پر قابو پانے اور معاشرے میں استحکام وسکون کے لئے بھی رہنمائی فرمائیے۔

قائدِاعظم:

...رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کا عظیم الشان

ضابطۂ عمل موجود ہے...(34) قرآن مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مذہبی، عسکری، معاشی، معاشرتی اور اخلاق سے لے کر انسدادِ جرائم تک ہر فعل اور عمل پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے (35)... قرآنی احکام کی روشنی میں ہر فرد اور ادارہ اپنا فرض ادا کرے تو نہ صرف عمومی بدامنی اور انفرادی لاقانونیت جنم نہیں لیتی، بلکہ بطورِ مجموعی معاشرے میں بھی سکون اور استحکام رہتا ہے...(36) لاقانونیت پر قابو پانے کے لئے ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم وہ اوصاف ہیں جو آپ نے اپنے اندر پیدا کرنے ہیں۔ آپ کی اور قوم کی نجات اسی میں مضمر ہے۔(37)

نسٹیئن:

محترم قائدِ اعظم! ہم خود میں ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم کے اوصاف کیسے پیدا کر سکتے ہیں؟

قائدِ اعظم:

اپنے آپ سے پوچھیں کہ کیا آپ کی عادات کسی ترتیب اور قاعدے کی پابند ہیں؟ کیا آپ سڑک یا راستے پر صحیح رُخ پر چلتے ہیں، کیا آپ اپنا کام دیانت اور خلوص کے ساتھ کرتے ہیں؟ کیا آپ دوسروں کی مدد کرتے ہیں، کیا آپ میں دوسروں کو برداشت کرنے کا مادہ ہے؟ ہوسکتا ہے یہ باتیں آپ کو چھوٹی لگیں، لیکن یہی باتیں ضبطِ نفس اور ترتیب و تنظیم جیسے اوصاف پیدا کرنے میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔(38)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! نسٹ اور نسٹیئنز کے لئے بھی چند کلماتِ شفقت عطا فرمائیے۔

قائدِ اعظم:

عام مضامین کے ساتھ ساتھ سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم اقتصادی ترقی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کو زراعت، حیوانیات، تجارت، طب، سائنس، انجینئرنگ اور تمام مہارت طلب شعبوں میں اوّل درجے کے ماہرین پیدا کرنے پر بھرپور توجہ دینی چاہئے... ہم مسلمان دوسروں قوموں کی نسبت اقتصادی لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ کیا ہم صرف بی ڑی والا اور چمڑے والا ہی رہنا چاہتے ہیں یا صنعتی اور تجارتی میدان میں آگے بڑھیں گے ...(39) آپ میں سے جو لوگ عملی زندگی میں داخل ہونے والے ہیں، انہیں موقع پرستوں اور پاکستان کے دشمنوں سے خبردار رہنا ہوگا اور جن کی تعلیم ابھی جاری ہے، انہیں کسی بھی سیاسی جماعت کا آلۂ کار نہیں بننا چاہئے۔(40)

نسٹیئن:

لیکن قائدِ محترم! عملی زندگی میں داخل ہونے کے لئے اوّل درجے کے ماہر، انتہائی ہنرمند اور باصلاحیت نوجوانوں کو بھی بے پناہ مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ کچھ علاج اس کا!

قائدِ اعظم:

...پاکستان میں صنعتیں قائم کرنے سے نہ صرف بیرونی ممالک پر انحصار کم ہوگا، بلکہ پڑھے لکھے، ہنرمند اور تربیت یافتہ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ عام آدمی کو بھی روزگار ملے گا۔

(41)...اللہ نے پاکستان کو برسرِ زمیں اور زیرِ زمیں، بے حساب ذرائع اور لامحدود وسائل سے نوازا ہے۔انہیں کامل دیانتداری، ذمہ داری اور عقلمندی سے پوری طرح کام میں لایا جائے تو صنعت، زراعت، تجارت اور کان کنی سمیت ہر شعبے میں ناقابلِ تصور ترقی وخوشحالی آئے گی اور روزگار کے متلاشی ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق بلا روک ٹوک روزگار ملے گا...(42) ہمیں رشوت اور بددیانتی کا سامنا ہے، انہیں آہنی ہاتھوں سے کچلنا ہوگا۔ان کے علاوہ ناجائز فائدہ اٹھانے اور اقرباء پروری جیسی لعنتیں بھی موجود ہیں، ان کا سختی سے خاتمہ ضروری ہے...(43)مَیں سیاسی رہنماؤں پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اقرباء پروری کے لئے انتظامیہ پر دباؤ ڈالیں گے تو حق داروں کو حق نہیں مل سکے گا۔ ہم یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے...(44) انتظامی عہدیدار اور اداروں کے سربراہ کسی سیاستدان کے دباؤ میں نہ آئیں، حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں، لیکن انتظامی منصب دار اپنے منصب پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ خدا خوفی سے کام لے کر عدل وانصاف کا مظاہرہ کریں۔ باصلاحیت اور اہل لوگوں کو حق تلفی اور محرومی سے بچائیں اور صدقِ دل سے عوام کے مسائل حل کریں...(45)

نسٹیئن:

جنابِ قائدِاعظم! سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے حوالے سے نسٹیئن میں ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے، رسولِ کریمؐ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی خاطر نسٹیئن کے صفحات آپ کے لئے بھی حاضر ہیں!

قائدِاعظم:

پیغمبرِ اسلام حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دنیا کی عظیم ترین ہستی ہیں۔ آپؐ کی عزت وتکریم صرف کروڑوں عام مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ ساری دنیا کی تمام بڑی بڑی شخصیات بھی آپؐ کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔مَیں ایک عاجز ترین، کم ترین، بندۂ ناچیز کہاں اس قابل ہوں کہ اتنی عظیم، عظیموں کی بھی عظیم ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کا حق ادا کرسکوں۔پیغمبرِ اسلامؐ عظیم مُصلح تھے، عظیم رہنما تھے، عظیم واضعِ قانون تھے، عظیم سیاستدان تھے، عظیم حکمران تھے۔ہم اُنؐ کی تعلیمات پر عمل کرتے رہے تو کسی بھی میدان میں ناکامی سے دوچار نہ ہوں گے...(46)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! کوئی تمنا جس کے پورا ہونے کی حسرت ہو!

قائدِاعظم:

مَیں نے بہت دنیا دیکھ لی۔اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شُہرت بھی بے حساب دی۔اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کو باوقار اور سربلند دیکھوں اور میری حسرت ہے کہ جب مَروں تو میرا دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے دین اسلام سے خیانت اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت سے غداری نہیں کی۔مسلمانوں کی آزادی، تنظیم، اتحاد اور مدافعت میں اپنا کردار ٹھیک ٹھیک ادا

کیا اور میرا اللہ کہے کہ اے میرے بندے! بے شک تُو مسلمان پیدا ہُوا' بے شک تُو مسلمان مَرا... (47)

نسٹیئن:

قائدِ محترم! قوم کے نام آپ کا پیغام؟

قائدِ اعظم:

اگرچہ افق پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں' لیکن مَیں اپیل کرتا ہوں کہ حوصلے اور امید کے ساتھ اپنا اپنا کام کئے جائیں۔ اسلام کی تاریخ بہادری اور مستقل مزاجی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ پس مشکلوں' رکاوٹوں' مصیبتوں بحرانوں کے باوجود آگے بڑھتے جائیں۔ پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی مملکت کو اتنے سنگین مسائل ومشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو ہمیں درپیش ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں کبھی کسی مملکت نے مسائل کا مقابلہ کرنے میں اتنی پامردی' عزم اور استقلال کا مظاہرہ نہیں کیا' جتنا ہم نے۔ ہمارے دشمنوں کی خوش فہمی ہے کہ پاکستان ان مشکلات کے بھنور سے نہ نکل سکے گا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاکستان ان مسائل کے ہجوم سے مردانہ وار اور کامران نکلے گا... (48) میرا ایمان ہے کہ تمام مشکلات' مصائب اور مسائل سے ہماری نجات کا واحد ذریعہ سنہری اصولوں والے اُس ضابطۂ حیات پر عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم واضعِ قانون' پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمارے لئے قائم کر رکھا ہے۔... (49) ... میرے عزیز پاکستانیو! قدرت نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے' آپ کے پاس لامحدود ذرائع ہیں۔ پاکستان کو ہر ممکن عمدگی اور حتی الوسع تیزی سے مضبوط اور خوشحال بنانا اب آپ کا کام ہے۔ اپنے کام کا آغاز کریں' اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔

پاکستان: زندہ باد (50)

حوالہ جات

1۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان ڈھاکہ۔ 28 مارچ 1948ء
2۔ بلدیہ کوئٹہ کے سپاسنامے کے جواب میں۔ 15 جون 1948ء
3۔ طلبہ سے خطاب' اسلامیہ کالج پشاور۔ 12 اپریل 1948ء
4۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن میں خطاب۔ 24 مارچ 1948ء
5۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان ڈھاکہ۔ 28 مارچ 1948ء
6۔ فسادات کراچی کے بعد بیان' کراچی۔ 9 جنوری 1948ء
7۔ جلسۂ عام سے خطاب' ڈھاکہ۔ 21 مارچ 1948ء
8۔ سول افسروں سے خطاب' سبّی۔ 15 فروری 1948ء
9۔ جلسۂ عام سے خطاب' ڈھاکہ۔ 21 مارچ 1948ء
10۔ طلبہ سے خطاب' لاہور۔ 30 اکتوبر 1947ء
11۔ پیغامِ عیدالفطر۔ 17 اگست 1947ء
12۔ ریڈیو پاکستان کے افتتاح پر پیغام' کراچی۔ 15 اگست 1947ء
13۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان کراچی۔ 27 دسمبر 1947ء
14۔ امریکی سفیر کی تقریر کے جواب میں' کراچی۔ 26 فروری 1948ء
15۔ سوئٹزر لینڈ کے صحافی ڈی ایرک سٹریف سے انٹرویو' کراچی۔ 11 مارچ 1948ء
16۔ رائٹر کے نمائندے سے انٹرویو۔ 23 اکتوبر 1947ء
17۔ شہری استقبالیے میں خطاب' چٹاگانگ۔ 26 مارچ 1948ء

18-19۔ ریڈیو کے نمائندے سے انٹرویو۔23 اکتوبر 1947ء

20۔ ایچ ایم پی ایس ''دلاور'' پر افسران اور عملے سے خطاب' کراچی۔ 23 جنوری 1948ء

21۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان کراچی۔ 27 دسمبر 1947ء

22-23۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب۔10 مارچ 1944ء

24۔ پریس کانفرنس سے خطاب' دہلی۔14 جولائی 1947ء

25۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی افتتاحی تقریب میں وائسرائے کی تقریر کے جواب میں'

26۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کا نووکیشن میں خطاب۔ 24 مارچ 1948ء

27۔ طلبہ سے خطاب' کراچی۔ 26 ستمبر 1947ء

28۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب۔5 فروری 1945ء

29۔ ارکانِ اسمبلی سے خطاب' دہلی۔ یکم اپریل 1946ء

30۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں صدارتی خطاب' کراچی۔ یکم جولائی 1948ء [کسی عوامی تقریب میں آخری خطاب]

31۔ شہری استقبالیے میں خطاب' چٹاگانگ۔ 26 مارچ 1948ء

32۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب' دہلی۔ 24 اپریل 1946ء

33۔ مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ کے استقبالیہ میں تقریر' کراچی۔ 19 اگست 1947ء

34۔ پیغامِ عیدالفطر۔12 نومبر 1939ء

35۔ خط بنام مسٹر گاندھی۔ 17 ستمبر 1944ء

36۔ صحافیوں سے گفتگو' کراچی۔2 جنوری 1948ء

37۔ بلدیہ کوئٹہ کے سپاسنامے کے جواب میں۔15 جون 1948ء

38۔ پیغامِ عیدالفطر۔ 12 نومبر 1939ء

39۔ پیغام بنام آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس' منعقدہ کراچی۔ 27 نومبر 1947ء

40۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس میں خطاب' لاہور۔ 19 مارچ 1948ء

41۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز کی تقریبِ سنگِ بنیاد میں خطاب' کراچی۔ 27 ستمبر 1947ء

42۔ پاکستان کے نئے سکّے اور کرنسی نوٹ پیش کئے جانے کی تقریب میں صدارتی خطاب' کراچی۔ یکم اپریل 1948ء

43۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں صدارتی خطبہ' کراچی۔ 11 اگست 1947ء

44۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں صدارتی خطبہ' کراچی۔ 11 اگست 1947ء

45۔ سول افسروں سے غیر رسمی بات چیت' پشاور۔14 اپریل 1948ء

46۔ کراچی بار ایسوسی ایشن میں جلسۂ میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں صدارتی خطاب۔ 25 جنوری 1948ء

47۔ اپنے معالجِ خصوصی کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش سے گفتگو' زیارت۔ 2 ستمبر 1948ء

48۔ نشریاتی تقریر' ریڈیو پاکستان لاہور۔30 اکتوبر 1947ء

49۔ دربار سے خطاب' سبّی۔ 14 فروری 1948ء

50۔ پاکستان کی پہلی سالگرہ پر پیغام۔ 14 اگست 1948ء

[یہ قوم کے نام آخری پیغام تھا— محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب ''میرا بھائی'' میں لکھا ہے کہ قائدِاعظمؒ اپنے تمام پیغامات اور اکثر تقاریر خود ہی لکھتے تھے]

استفادہ

اس مکالمے کے جوابات اِن کتب سے لئے گئے:

1۔ سیّد قاسم محمود' مرتب' قائدِاعظمؒ کا پیغام' پاکستان اکیڈمی' لاہور، 1967ء

2. Khurshid Ahmad Khan Yousfi, Comp, *Speeches, Statements and Messages of the Quaid-i-Azam (Volumes I-IV)*, Bazm-e-Iqbal, Lahore,1996

3. Z. H. Zaidi, Ed, *Jinnah Papers (Volume I-VII)*, Quaid-i-Azam Papers Project, Culture Division, Government of Pakistan, 2003

4. Shareef Al Mujahid and Liaquat Merchant, Comp, *Quotes from the Quaid,* Oxford Press, Karachi, 2008

انتخاب و ترتیب: ممتاز اقبال ملک

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ

حمیرا گُل محسود

جس زمانے میں قائدِ اعظمؒ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گئے' لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے چار ادارے مڈل ٹمپل' انٹر ٹمپل' گریز اِن اور لنکنز اِن تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے لنکنز اِن میں داخلہ لیا۔ اس کی وجہ انہوں نے 1947ء میں کراچی بار کے ایک اجتماع میں یوں بیان کی: ''ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت محبت ہے۔ ایک دن مَیں اتفاقاً لنکنز اِن گیا اور میں نے اس کے دروازے پر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا اسم مبارک لکھا ہُوا دیکھا۔ میں نے فوراً لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا' کیونکہ اس کے صدر دروازے پر رسول اللہؐ کا نام مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرِ فہرست تھا۔''

ڈاکٹر احسان رشید (سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) بتاتے ہیں کہ جب میں چھوٹا تھا' تو قائدِ اعظمؒ اکثر علی گڑھ آیا کرتے تھے۔ ایک بار میں نے ان سے آٹو گراف دینے کے لیے اصرار کیا تو انہوں نے مسکرا کر میری آٹو گراف بُک لے لی اور اس پر دستخط کرنے سے پہلے لکھا: ''پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بچوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جب بڑے ہو جاؤ تو یہ بات یاد رکھنا۔''

1890ء میں بیس سال کی عمر میں قائدِ اعظمؒ لندن سے امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے کراچی واپس آئے تو یہیں بیرسٹری کا آغاز کیا' لیکن یہ جگہ چھوٹی تھی اور ان کا عزم و حوصلہ وسعت کا طالب تھا۔ وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں اپنی ذہانت' محنت اور قانون فہمی سے بہت جلد دلوں پر ایسا سکہ جمایا کہ حکومت کے سیکرٹری قانون سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پندرہ سو روپے مہینے کے مشاہرے پر پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے پر مامور کرنے کی پیشکش کی' لیکن قائدِ اعظمؒ نے یہ کہہ کر اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے مَیں اتنی رقم ایک دن میں کمانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ بعد میں اللہ تعالیٰ پر بھروسے' خود اعتمادی اور محنت کی وجہ سے انہوں نے اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا۔

بمبئی میں ایک مشہور تاجر حاجی عبدالکریم تھے' جنہیں کسی سنگین الزام کے سلسلے میں عدالت میں طلب کیا گیا۔ وہ

قائدِ اعظمؒ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ مقدمے کی کتنی فیس لیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ پانچ سو روپے روزانہ۔ حاجی صاحب محتاط آدمی تھے۔ پوچھا کہ مقدمہ کتنا عرصہ چلے گا؟ میرے پاس پانچ ہزار روپے ہیں، آپ یہ ساری رقم بطور معاوضہ قبول کر لیں۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ میری فیس پانچ سو روپے روزانہ ہے۔ یا تو اس فیس پر مجھے اپنا وکیل کریں یا کوئی اور وکیل تلاش کریں۔ حاجی صاحب نے ان کی شرط منظور کر لی اور قائدِ اعظمؒ نے تین روز میں مقدمہ جیت لیا۔ اُن کی کُل فیس پندرہ سو روپے بنی۔ حاجی صاحب نے زیادہ رقم دینا چاہی، تو قائدِ اعظمؒ نے پندرہ سو روپے سے زائد رقم لینے سے انکار کر دیا۔

قائدِ اعظمؒ فرماتے تھے کہ غلطی بغیر جھجک کے تسلیم کر لیں، لیکن گاندھی اس کے قائل نہ تھے۔ ایک دفعہ گاندھی وعدے سے منحرف ہو گئے تو اخبار نویسوں کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ میری ''روحانی قندیل'' نے اس وعدہ خلافی پر مجبور کیا۔ قائدِ اعظمؒ کو معلوم ہوا تو کہا: ''روحانی قندیل کیا ہے؟ ایمان داری سے کیوں تسلیم نہیں کر لیتے کہ اُن سے غلطی ہو گئی ہے۔''

ایک بار قائدِ اعظمؒ نے گاندھی سے کہا: ''میدانِ سیاست میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ کس بات سے خوش ہوں گے۔ پھر اس کے مطابق آپ اقدام کرتے ہیں، لیکن میرا انداز اس کے برعکس ہے۔ میں پہلے فیصلہ کرتا ہوں کہ کیا بات صحیح اور مناسب ہے، اس کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے لوگ میری آواز پر لبیک کہتے ہیں اور رفتہ رفتہ مخالفت ختم ہو جاتی ہے۔''

1946ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا: ''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا دیا میرے پاس اتنا ہے کہ میں باقی زندگی آرام سے بسر کر سکوں، لیکن اس کے باوجود میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں اور سارے ہند میں بھاگتا پھرتا ہوں۔ آخر یہ کس لیے؟ یہ تکلیف مَیں سرمایہ داروں کے لیے نہیں بلکہ غریب مسلمانوں کی خاطر اُٹھا رہا ہوں۔'' انہی دنوں ایک اور جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان قائم ہو جانے کے بعد ہم اس بات کی انتہائی کوشش کریں گے کہ وہاں ہر شخص کی کم از کم اتنی آمدنی ضرور ہو کہ وہ مہذب انسانوں کی طرح زندگی گزار سکے۔''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم شکارپور سندھ کے غلام صابر انصاری نے تعلیمی اخراجات پورا کرنے کے لیے بوٹ پالش کا پارٹ ٹائم کام شروع کر دیا، اور ایک روز بوٹ پالش کرتے کرتے وہ بمبئی کے تاج ہوٹل پہنچ گیا۔ وہیں اس نے لاؤنج میں قائداعظمؒ کو دیکھ کر پوچھا: ''صاحب! بوٹ پالش کرائیں گے؟'' قائداعظمؒ نے نکر، قمیض اور ہیٹ میں ملبوس نوجوان سے پوچھا: ''تم کون ہو؟'' میں علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ ''بوٹ پالش کیوں کرتے ہو؟'' ۔''اخراجات پورا کرنے کے لئے۔'' ''بوٹ پالش کرنا آپ کے نزدیک کیسا ہے؟'' طالب علم نے ذرا جھجک کر کہا ''میں اس کام کو معیوب سمجھتا ہوں مگر مجبوری ہے۔'' اسے حوصلہ اور شاباش دیتے ہوئے قائداعظمؒ نے کہا ''محنت میں شرم کیسی؟ غریب ہونا جرم نہیں۔ میں خود غریب دکاندار کا بیٹا ہوں۔ میں علی گڑھ کے طالب علم کی یہ جرأت دیکھ کر بہت خوش ہوا ہوں کہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے کسی سے مدد یا وظیفہ طلب کرنے کی بجائے بوٹ پالش کرتا ہے۔''

(منیر احمد منیر: قائداعظمؒ کا ادھورا خواب)

1946ء میں ایک بار قائدِ اعظمؒ جمعہ کے روز لندن میں تھے۔ سوال پیدا ہوا کہ کس مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کی جائے۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقہ سے خاص نہ ہو اور جس میں امیر غریب سب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔ مسجد میں گئے تو لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں خالی کر دیں تا کہ وہ سب سے آگے والی صف میں بیٹھ سکیں، لیکن قائدِ اعظمؒ آخری صف میں بیٹھ گئے اور فرمایا: ''میں دیر سے آیا ہوں، اس لئے اگلی صف میں بیٹھنے کا مستحق نہیں ہوں۔''

قائدِ اعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس دسمبر 1947ء میں طلب کیا۔ خالق دیناہال کے صدر دروازے پر انتظامات کی نگرانی کے لئے نواب صدیق علی خاں بطور سالارِ اعلیٰ نیشنل گارڈز اپنی وردی میں ملبوس قائدِ اعظمؒ کا انتظار کر رہے تھے اور ہر اِک کا پاس داخلہ چیک کر رہے تھے، لیکن جب جانے پہچانے قائدِ اعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل اپنے اے ڈی سی کے ہمراہ جلوہ افروز ہوئے تو نواب صاحب نے آپ کا پاس داخلہ چیک کرنا خلافِ ادب سمجھا۔ قائدِ اعظمؒ ہال میں داخل ہوئے، تھوڑا فاصلہ طے کر کے ٹھک سے رک گئے اور نواب صاحب سے پوچھا: آپ نے مجھ سے پاس کیوں نہیں مانگا؟ نواب صاحب قائدِ اعظمؒ کی اصول پسندی کو جانتے تھے، انہوں نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا: ''آئندہ کبھی اپنے فرض میں کوتاہی نہ کرنا۔''

یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں قائدِ اعظمؒ بحیثیت مہمانِ خصوصی ٹھیک مقررہ وقت پر تشریف لائے، لیکن کچھ وزراء اور سرکاری حکام بروقت نہ پہنچے جس کی وجہ سے چند ریزرو کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر قائدِ اعظمؒ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کارروائی شروع کرنے کے ساتھ ہی فرمایا: ''تقریب گاہ میں موجود تمام خالی کرسیاں اٹھالی جائیں تا کہ جو حضرات بعد میں آئیں انہیں کھڑا رہنا پڑے اور آئندہ پابندیٔ وقت کا خیال رکھیں۔'' کرسیاں اٹھالی گئیں۔ تقریب شروع ہونے کے کچھ دیر بعد جب وزراء اور اعلیٰ افسران آئے تو شرمندہ ہو کر کھڑے رہے، کسی کو ان کے لیے کرسی لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے مدعوئین تقریبات میں وقت پر پہنچنے لگے۔

مولانا حسرت موہانی ایک بار بمبئی گئے تو قائدِ اعظمؒ سے ملنے کے لئے ان کی کوٹھی مونٹ پلینرنٹ پہنچے۔ مولانا سے کون واقف نہ تھا، وہاں عزت واحترام سے بٹھائے گئے۔ قائدِ اعظمؒ کے سیکرٹری نے کہا کہ آپ تشریف رکھیں، ابھی قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں آپ کے آنے کی اطلاع بھجواتا ہوں۔ مولانا بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بلاوا آجانا چاہئے تھا لیکن بڑی دیر تک بلاوا نہ آیا۔ مولانا پہلو بدلتے رہے، پھر فوراً اپنی نشست سے اٹھے اور برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ کبھی وہ ایک طرف جاتے، کبھی دوسری طرف۔ ٹہل ٹہل کر وقت گزار رہے تھے کہ اتفاقاً نیز ہوا کا

ایک جھونکا آیا اور کمرے کا پردہ اُڑا لے گیا۔ اب جو مولانا کی نظر اٹھی تو جم کر رہ گئی۔ قائدِاعظم مصلیٰ بچھائے مناجات میں مصروف تھے' ان کا سر سجدے سے اٹھتا ہی نہ تھا۔ مولانا خود بھی اللہ والے تھے اور رکوع و سجود کی لذت سے خوب واقف تھے۔ جب دیکھا کہ قائدِاعظمؒ کا سر سجدے سے اٹھتا ہی نہیں' تو آگے بڑھ گئے اور اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ اب ان کی سوچ کسی اور طرف نکل گئی۔ مولانا اسی حال میں بیٹھے تھے کہ بلاوا آیا' جھٹ اسی کمرے میں پہنچے جہاں سجدہ ریزی کا منظر دیکھا تھا۔ بولے: ''اللہ تعالیٰ سے تعلق کا جو منظر میں نے دیکھا' اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔'' قائدِاعظمؒ نے فرمایا: ''مولانا! بس اب تو ایک ہی دعا ہے کہ جو قدم پاکستان کے لیے اٹھا ہے' اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کر دے!'' قائدِاعظمؒ کی یہ دعا جو سجدہ ریزی کی حالت میں دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی' قبول ہوئی۔ 27 رمضان 1366ھ کی مقدس رات میں (مطابق 14 اگست 1947ء) پاکستان بن گیا۔

قائدِاعظمؒ کا جلوس بمبئی بازار سے گزر رہا تھا۔ دو بچوں نے انہیں چھت پر سے دیکھا تو پوری قوت سے چلاّئے: ''قائدِاعظم' قائدِاعظم۔'' قائدِاعظمؒ نے نگاہ اٹھا کر بچوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اسی لمحے دو سنگترے بچوں کی طرف سے کار میں آ کر گرے۔ قائدِاعظمؒ نے نہایت شفقت سے سنگترے اٹھائے اور چھت پر کھڑے بچوں کی طرف دیکھ کر دوبارہ ہاتھ ہلایا۔ قائدِاعظمؒ نے ان کے تحفے کو سارے راستے ہاتھ میں رکھا۔

ایک شخص قائدِاعظمؒ کے پاس بیرے کی حیثیت سے ملازم ہوا۔ اس نے ایک بار اپنی غربت کی وجہ سے قائدِاعظمؒ سے کہا کہ آپ ہمارے بچے کی فیس معاف کروانے کے لئے ایک خط لکھ دیں۔ قائدِاعظمؒ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے بیٹے کا

28 فروری 1951ء کو ڈاکٹر محمد مصدق ایران کے وزیراعظم بنے اور اسی روز مجلس (ایرانی پارلیمنٹ) نے تیل کی ساری کمپنیوں اور تنصیبات کو قومی تحویل میں لے لیا۔ ان میں برطانیہ کی 560 ملین ڈالر کی اینگلو ایرانین آئل کمپنی اور دنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ بھی شامل تھا۔ جب ڈاکٹر مصدق نے سیکورٹی کونسل میں شکایت کی کہ تیل کی آمدنی کا صرف 15 فیصد حصہ ایران کو ملتا ہے اور 85 فیصد بیرونی سرمایہ کار لے جاتا ہے تو اُنہیں جواب ملا کہ یہ ٹیکنالوجی اور سرمایہ کی قیمت ہے۔ مصدق نے کہا:

We are not prepared to finance other peoples' dreams of empire from our resources.

یعنی وہ لوگ جو امپیریلزم کے خواب دیکھتے ہیں' ہم ہرگز اپنے وسائل سے ان کے خوابوں کی تعبیر کے لیے سرمایہ فراہم نہیں کریں گے۔

ڈاکٹر مصدق نے سیاسی آزادی کو ناکافی قرار دیتے ہوئے پسماندہ اقوام کے قدرتی وسائل کو مغرب کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے جو پہل کی' وہ اس کے لیے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ 1947ء میں قائدِاعظمؒ پاکستان حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوتے تو 1951ء میں کسی مصدق کے وزیراعظم ہونے اور آبادان ریفائنری پر قبضہ کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اور اگر مصدق دنیا کی سب سے بڑی ریفائنری کو قومی ملکیت میں نہ لیتے تو 1956ء میں کسی ناصر کی طرف سے نہر سویز کو مصر کی ملکیت میں لینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ تیسری دنیا کے کئی بڑے نام ایک دوسرے سے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ جب تک رک کر اس سلسلے پر غور نہ کریں' ہمیں ان رہنماؤں کی باہمی قربت اور رفاقت کا پتا نہیں چلتا— لیکن اس ایک بات میں کوئی شک نہیں کہ محمد علی جناحؒ صرف برِصغیر ہی نہیں' تیسری دنیا کے سارے مظلوموں کے قائدِاعظم ہیں۔ (مختار مسعود: لوحِ ایّام)

ماہوار خرچ کتنا ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بیٹے کا ماہوار خرچ تیس روپے ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہا کہ یہ تیس روپے مَیں اپنی جیب سے دیا کروں گا' کیونکہ اگر میں فیس معاف کرانے کا خط لکھوں گا تو پھر سب بچوں کی فیس معاف کرانا ہوگی کیونکہ پاکستان کے سب بچے میرے بچوں جیسے ہیں۔

1941ء میں قائدِ اعظمؒ مسلم لیگ مدراس کے اجلاس سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ایک قصبے سے گزر ہوا۔ وہاں مسلمانوں نے قائدِ اعظمؒ کا پُرجوش استقبال کیا۔ استقبال کرنے والوں میں آٹھ سال کے ایک لڑکے نے جس کے تن پر صرف ایک لنگوٹی تھی' بہت زور سے ''پاکستان۔ زندہ باد'' کا نعرہ لگایا۔ قائدِ اعظمؒ کی نظر پڑی تو اپنی گاڑی رکوائی اور اس لڑکے کو قریب لانے کو کہا۔ کچھ لوگ اسے قائدِ اعظمؒ کے پاس لے آئے۔ قائدِ اعظمؒ نے پوچھا: تم پاکستان کا مطلب سمجھتے ہو؟ لڑکا پہلے گھبرایا' لیکن قائدِ اعظمؒ کی شفقت اور دوسرے لوگوں کی جانب سے حوصلہ بڑھانے پر اس نے جواب دیا: ''پاکستان کا مطلب آپ بہتر جانتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا سمجھتے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی حکومت ہو' وہ پاکستان اور جہاں ہندوؤں کی حکومت ہو وہ ہندوستان۔'' قائدِ اعظمؒ کے ہمراہ صحافیوں کا دستہ بھی سفر کر رہا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا: ''جاؤ! مسٹر گاندھی کو بتا دو کہ مسلمانوں کا آٹھ سال کا بچہ بھی پاکستان کا مطلب سمجھتا ہے۔ اگر مسٹر گاندھی اب بھی نہیں سمجھ سکے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سمجھتے خوب ہیں لیکن اعتراف کرنا نہیں چاہتے۔''

گول میز کانفرنس کے دوران برطانوی وزیرِ اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے قائدِ اعظمؒ سے علیحدگی میں بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ قائدِ اعظمؒ آمادہ ہوگئے' تو وزیرِ اعظم نے کہا کہ جب ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دی جائے گی تو ہمیں ایسے قابل ہندوستانیوں کی ضرورت ہوگی جنہیں صوبوں کا گورنر بنایا جا سکے۔ قائد نے اشارہ سمجھ لیا اور برملا کہا: ''مسٹر میکڈانلڈ! کیا آپ مجھے خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپریل 1942ء میں قائدِ اعظمؒ کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دینے کا فیصلہ کیا' تو قائد نے لکھا کہ میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں' مگر کوئی ایسی ڈگری قبول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں جو میری محنت اور کام کے بغیر مجھے مل رہی ہو۔

گھر ہو یا سرکاری رہائش گاہ' قائدِ اعظمؒ فالتو بتیاں خود بجھا دیتے۔ ایک بار ان کے سیکرٹری نے کہا کہ آپ کے اس طرح بتیاں بجھانے سے ہمیں شرمندگی ہوتی ہے' ویسے بھی چند بتیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہا: ''بات فرق کی نہیں' اصول کی ہے۔ روپیہ ضائع کرنا ایک گناہ ہے اور اگر وہ قوم کا روپیہ ہو تو بہت ہی بڑا گناہ ہے۔''

جنوری 1942ء میں قائدِ اعظمؒ نے مسلم لیگ کے اخبار ''ڈان'' کے لئے چندے کی اپیل کی۔ الٰہ آباد کے جلسے میں نواب بہادر یار جنگ نے اس کا تذکرہ اس موثر انداز سے کیا

کہ سٹیج پر روپے اور زیورات نچھاور ہونے لگے۔ قائد نے اچانک اٹھ کر اعلان کیا: ''مجھے چندہ منی آرڈر سے بھیجا جائے کیونکہ اس طرح غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ آدھ گھنٹے میں مطلوبہ رقم جمع کر سکتے ہیں مگر میں ایسا چندہ نہیں لینا چاہتا جس کا حساب رکھنا یا دینا ممکن نہ ہو۔'' اسی طرح 1943ء میں مسلم لیگ کے اجلاس میں عورتوں نے اپنے زیورات سٹیج پر لا ڈالے تو قائدِاعظمؒ نے کہا: ''ان کا حساب رکھنا بہت مشکل ہے' اس لئے ان کا قبول کرنا بھی درست نہیں۔ انہیں خود بیچئے اور روپیہ ہمیں منی آرڈر سے بھجوا دیجئے۔''

1941ء میں مدراس میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائدِاعظمؒ کو مسلم لیگ کا تاحیات صدر بنانے کی قرارداد پیش کی گئی۔ قائد نے اس کی سخت مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹی کو جمہوری طریقۂ کار سے چلانے پر یقین رکھتے ہیں اور ہر سال کھلے اجلاس میں پارٹی کی رضامندی حاصل کرنا پسند کریں گے۔ چنانچہ وہ سال بہ سال مسلم لیگ میں اپنی رکنیت کی باقاعدہ تجدید کرواتے۔

ایک بار گاندھی نے قائدِاعظمؒ سے کہا کہ آپ دولت مند آدمی ہیں مسلم لیگ کے کاموں کے لئے لوگوں سے چندہ مانگنے کے بجائے اپنا روپیہ کیوں خرچ نہیں کرتے؟ قائدِاعظمؒ نے جواب دیا: ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا سب کچھ خرچ کر کے دوسروں کا محتاج بن جاؤں اور مسلم لیگ کے جلسوں میں جانے کے لئے لوگوں سے کرایہ مانگوں؟ لیڈر کی یہ محتاجی

> 1946ء میں خواجہ ناظم الدین نے قائدِاعظمؒ کو لکھا کہ مسلم لیگ کی وزارت بنانے کے لئے چند غیر مسلم لیگی مسلمان ارکان کو خریدنا یا کسی ہندو جماعت سے اتحاد ضروری ہے۔ قائد نے جواب میں لکھا: ''مَیں کسی حال میں ضمیر فروش عناصر سے کوئی واسطہ نہیں رکھ سکتا۔ ہاں! ہندوؤں سے باعزت شرائط پر بیشک اشتراک ہو سکتا ہے۔ مَیں بِکاؤ مال [لوٹوں] کی مدد سے حکومت بنانے کی بجائے حزبِ اختلاف میں رہنا زیادہ پسند کروں گا۔''
>
> (مولوی تمیزالدین خاں: ہماری تحریکِ آزادی)

اس کی قوم کی بدنامی کا باعث بنتی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے' اللہ کا دیا ہُوا ہے اور مسلمان قوم کے لئے ہے' وقت آنے پر سب کچھ نذر کر دوں گا۔'' قائد نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا۔ اپنی وصیت میں ورثاء کے لئے تھوڑی سی رقم چھوڑ کر باقی اثاثے انجمنِ اسلام سکول بمبئی' عربیک کالج دہلی' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' سندھ مدرسہ کراچی' انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور میں تقسیم کر دینے کی ہدایت کی۔

قراردادِ پاکستان منظور ہوئے دو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ دس سال کا ایک بچہ کسی چیز سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگایا اور خون بہتا دیکھا تو چلّانا شروع کر دیا۔ ایک بزرگ نے کہا: ''اے لڑکے تم مسلمان کی اولاد ہوتے ہوئے بھی خون دیکھ کر اتنے خوف زدہ ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔'' بچے نے بڑے سکون سے جواب دیا: ''بابا! میں بالکل خوفزدہ نہیں' مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ خون

بے مصرف بہہ رہا ہے۔ میں یہ خون بچا کر حصولِ پاکستان کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔'' قائدِاعظمؒ نے یہ واقعہ سنا تو کہا: ''اب دنیا کی کوئی طاقت قیامِ پاکستان کو نہیں روک سکتی۔''

قائدِاعظمؒ سے دفعہ ایک ہندو لڑکوں نے پوچھا کہ آپ علیحدہ وطن کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں' آخر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟ قائدِاعظمؒ کچھ دیر سوچنے کے لیے ٹھہرے تو ہندو لڑکوں نے تالیاں بجا دیں کہ شاید قائدِاعظم ہمارے سوال کا جواب نہیں دے سکے۔ پھر قائدِاعظمؒ نے ہندو لڑکے سے پانی کا ایک گلاس منگوایا۔ جب لڑکا پانی لے آیا تو آپ نے اس سے آدھا پانی پینے کے بعد ایک ہندو لڑکے کو بلایا اور باقی ماندہ پانی پینے کو کہا۔ اس نے پانی پینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ دیکھ کر قائدِاعظمؒ نے فرمایا کہ ہم میں اور ہندوؤں میں یہی فرق ہے۔ تمام ہندو لڑکے یہ سن کر بہت شرمندہ ہوئے۔

جارج ششم شاہِ انگلستان کے زمانے میں ہندوستان کے لئے مزید اصلاحات کے سلسلے میں قائدِاعظمؒ لندن گئے۔ مذاکرات جاری تھے کہ قصرِ بکنگھم سے ظہرانے کی دعوت موصول ہوئی۔ اس زمانے میں قصرِ بکنگھم کی دعوت ایک اعزاز ہی نہیں بلکہ ایک یادگار موقع ہوتا تھا' لیکن قائدِاعظمؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آج کل رمضان المبارک کا مقدس مہینہ ہے اور اس مہینے میں مسلمان روزے رکھتے ہیں۔

قائدِاعظمؒ پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی کانفرنس سے فارغ ہو کر ہوٹل نیڈوز پہنچے۔ ایک مسلم لیگی خواجہ اشرف احمد نے جوشِ عقیدت میں جُھک کر ان کے پاؤں چُھونا چاہے تو انہوں نے کہا: ''صرف خدائے بزرگ و برتر کے آگے ہی جھکنا چاہئے۔ اسلام اسی کی تلقین کرتا ہے۔''

قائدِاعظمؒ کسی مقدمے کی پیروی کے لئے آگرہ گئے۔ مسلم لیگ نے جلسہ کرنا چاہا' قائدِاعظمؒ نے یہ کہہ کر شرکت سے انکار کر دیا کہ مَیں اپنے موکل کی طرف سے عدالت میں پیش ہونے آیا ہوں جس کی وہ فیس ادا کر رہا ہے' مَیں خیانت کیسے کروں۔ آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو مجھے بعد میں بُلا لیں' مَیں اپنے خرچ پر آگرہ آؤں گا۔

22 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ سبجیکٹ کمیٹی کے اجلاس میں قراردادِ لاہور [قراردادِ پاکستان] پر غور ہو رہا تھا تو کمیٹی کے رکن شیخ رشید احمد نے قائدِاعظمؒ سے کہا کہ جناب والا! ہم تو آپ کو اپنا لیڈر مان چکے ہیں۔ آپ جو کہیں گے' آنکھیں بند کر کے اسے مان لیں گے۔ قائدِاعظمؒ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''آپ سب لوگ ہندوستان کے کونے کونے سے صرف اس لئے بلائے گئے ہیں کہ اپنی اپنی رائے دیں۔ اس لئے ہرگز نہیں کہ مَیں جو کچھ کہوں' اسے آنکھیں بند کر کے منظور کر لیں۔ اگر ایسا کرنا ہوتا' تو مَیں اپنی رائے اخبار میں شائع کرا دیتا اور آپ لوگ اسے گھر بیٹھے مان لیتے۔''

قائدِاعظمؒ نے اپریل 1945ء میں مسلم لیگ کے جلسۂ حیدرآباد میں شرکت کی۔ ملٹری پولیس سنٹر کے حوالدار میجر خان بہادر نے قائدِاعظمؒ کو بتایا کہ میں افسروں کی اجازت

کے بغیر مسلمان فوجیوں کا جتھہ ساتھ لے کر جلسے میں آیا ہوں۔ قائداعظمؒ نے سخت غصے میں کہا: ''تم نے آرمی ایکٹ اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کی' تمہارا یہ اقدام نا قابلِ تعریف ہے۔فوراً واپس جا کر اپنی یونٹ میں رپورٹ کرو۔''

جون 1946ء میں قائدِاعظمؒ بنگال کا دورہ کر رہے تھے' تو مسٹر ایم اے اصفہانی کی موجودگی میں بنگال مسلم لیگ کے صدر مولانا عبدالحمید خان بھاشانی ملاقات کیلئے آئے۔ مسلمانوں پر ہندوؤں کے تشدد کے واقعات بیان کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔مسٹر اصفہانی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ بھاشانی صاحب کے جانے کے بعد مسٹر اصفہانی نے قائد سے کہا کہ اگر ہندوستان کے تمام صوبوں کی مسلم لیگوں کو مولانا بھاشانی جیسے پُر درد صدر مِل جائیں تو مسلم لیگ ایک فعال اور طاقتور جماعت بن جائے۔ اس پر قائدِاعظمؒ نے کہا: ''مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اس مزاج کے لوگ قیادت اور رہنمائی کے قابل نہیں ہوتے' جذباتی باتیں کرنے اور رونے دھونے والے مخلص رہنما نہیں ہو سکتے۔جتنی جلدی ممکن ہو مسلم لیگ کو اس قسم کے لوگوں کی رہنمائی سے آزاد کرا لیا جائے۔''

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد حکومتِ پاکستان نے سرکاری استعمال کیلئے ایک وائی کنگ جہاز کا آرڈر دیا۔ طیارہ ساز کمپنی نے دورانِ پرواز دفتری کام کرنے کے لئے کچھ اضافی لوازمات تجویز کئے' جس پر رضامندی ظاہر کر دی گئی۔ جب کمپنی کی طرف سے اضافی خرچ کی بیجک (invoice) آئی' تو وزارتِ خزانہ نے اس پر نوٹ لکھا کہ اضافی اخراجات کے لئے وزارتِ خزانہ کی اجازت کیوں نہیں لی گئی۔ جب فائل گورنر جنرل [قائدِاعظمؒ] کے پاس آئی' تو انہوں نے نہ تو وزیرِ خزانہ [ملک غلام محمد] کو نوٹ واپس لینے کا حکم دینے کا سوچا اور نہ سیکرٹری خزانہ کے تبادلے کے احکامات جاری کئے بلکہ فائل پر لکھا: ''یہ ایک غلطی تھی کہ کمپنی کو اضافی اخراجات کرنے کی اجازت دینے سے پہلے وزارتِ خزانہ سے منظوری نہیں لی گئی۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔ موجودہ حالات میں ہم ان اضافی چیزوں کے بغیر بھی گزارا کر سکتے ہیں' اس لئے ان اضافی چیزوں کا آرڈر منسوخ کر دیا جائے۔''

شاہِ انگلستان جارج ششم کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر اور ان کی اہلیہ ڈچس آف گلوسٹر پاکستان آ رہے تھے۔ پاکستان میں برطانیہ کے ہائی کمشنر نے گورنر جنرل پاکستان [قائدِاعظمؒ] سے ملاقات میں تجویز پیش کی کہ شاہِ انگلستان کے بھائی کے

1942ء میں قائدِاعظمؒ ایک جلسے میں انگریزی میں خطاب کر رہے تھے۔ایک چھابڑی والا نوجوان بڑے شوق سے اُن کی تقریر سن رہا تھا۔اس کے چہرے پر خوشی کے اثرات نمایاں تھے۔ایک انگریز صحافی نے مترجم کے ذریعے اس سے پوچھا کہ تمہیں انگریزی تو آتی نہیں' پھر خوش کس بات پر ہو رہے ہو؟ نوجوان نے جواب دیا: ''میں انگریزی سمجھوں یا نہ سمجھوں' میں اتنا جانتا ہوں کہ قائدِاعظمؒ سچ کہتے ہیں۔'' (چوہدری محمد علی: ظہورِ پاکستان)

استقبال کے لئے اگر گورنر جنرل خود کراچی ائرپورٹ پر چلے جائیں، تو یہ خیر سگالی کی علامت ہوگی اور پاکستان کو اس سے بہت فائدہ پہنچے گا۔ قائدِ اعظمؒ نے انتہائی خوش اخلاقی کے ساتھ جواب دیا: ''ایسا کر کے میں حکومتِ برطانیہ کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتا' کیونکہ اس صورت میں اگر میرا بھائی یا پاکستان کے کسی سربراہِ مملکت کا بھائی لندن گیا' تو بادشاہ سلامت کو بھی ان کے استقبال کے لئے لندن ائرپورٹ جانے کی زحمت اُٹھانا پڑے گی۔''

زندگی کے آخری ایام میں قیامِ زیارت کے دوران قائدِ اعظمؒ کی خوراک بہت کم ہوگئی۔ ان کے معالج کرنل الٰہی بخش نے بڑی کوشش اور تلاش کے بعد لاہور سے ان کا پرانا باورچی بلوالیا۔ قائد اس کا پکا ہوا کھانا رغبت سے کھانے لگے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ پرانے باورچی کو لاہور سے بلوایا گیا ہے' تو کہا کہ اس کی تلاش اور زیارت لانے پر جو روپیہ صرف ہوا ہے' وہ ان کے ذاتی حساب سے ادا کیا جائے۔

شدید محنت کی وجہ سے اپریل 1948ء میں قائدِ اعظمؒ کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ اس کے باوجود وہ ڈاکٹروں کے مشورے کے برعکس صبح سے رات گئے تک کام میں مصروف رہتے۔ ایک بار محترمہ فاطمہ جناح نے اصرار کیا کہ رات کو کچھ آرام بھی کرلیا کریں' تو قائد نے پیاری بہن سے کہا: ''کیا تم نے سنا ہے کہ کوئی سپہ سالار اُس وقت چھٹی پر چلا گیا ہو' جب اس کی فوج فیصلہ کُن جنگ لڑ رہی ہو؟''

وفات سے چند روز پیشتر ان کے معالج کرنل الٰہی بخش نے ان سے کہا: ''جناب! یہ سلکی لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے' آپ کے لیے مضر ہے۔ آپ کو سردی لگ جانے کا خطرہ ہے۔'' اس پر قائدِ اعظمؒ نے کہا: ''فی الحال تو میرے پاس یہی سلکی لباس ہے لیکن میرا ارادہ ہے کہ میں چند جوڑے کھدر کے بنوالوں۔'' ڈاکٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا اور کہا: ''سر! ٹھنڈے کپڑوں سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو گرم لباس کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر تیس گز وائیلا (گرم کپڑے) کا آرڈر کراچی بھیج دیا ہے۔'' یہ سن کر قائدِ اعظمؒ ناراض ہوئے اور کہا: ''ڈاکٹر! آئندہ خرچ کے معاملے میں محتاط رہنا۔ جب بھی کسی چیز پر روپیہ خرچ کرو تو اچھی طرح سوچ لو کہ اس خرچ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں؟''

حوالہ جات

اس مضمون کی ترتیب و پیشکش کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

1۔ فاطمہ جناح' میرا بھائی
2۔ محمد سلیم' محمد علی جناحؒ۔ سیاسی و تجزیاتی مطالعہ
3۔ آتش فشاں۔ قائدِ اعظمؒ نمبر' لاہور' دسمبر 1976ء
4۔ رضوان احمد' قائدِ اعظمؒ — ابتدائی تیس سال
5۔ خالد محمود ربانی' قائدؒ کے آخری پچاس دن اور ان کے معالج
6۔ سید شمس الحسن' صرف مسٹر جناح
7۔ منیر احمد منیر' قائدِ اعظمؒ — اعتراضات اور حقائق
8۔ پروفیسر محمود الرحمٰن' بچوں کے قائدِ اعظمؒ

ملّت کا اقبال

اُسامہ حسن

برِّصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ (نئی زندگی) کا دَور سیاسی اعتبار سے ان کے دورِ غلامی کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا تعلق دل کے احساس اور ذہن کے رویّے سے ہوتا ہے اور اس کے لئے اہلِ دل اور اہلِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسے اہلِ دل اور صاحبانِ فکر و نظر میں دو نام ایسے ہیں جنہوں نے ادب کو اپنے اجتماعی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنایا۔ یہ دو نام مولانا حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے ہیں۔ مولانا حالیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں کے پیشِ نظر بہت بلند اور انتہائی اعلیٰ اجتماعی مقاصد تھے۔ قدرت نے انہیں عمدہ ذہن اور شعر و نثر کی جو نعمت عطا کی تھی، اسے انہوں نے اپنے مقصد کا پابند بنایا۔ اس سے فائدہ علم و ادب کو بھی پہنچا اور قوم کو بھی۔ یہاں علامہ اقبالؒ کی کوششوں کا تفصیلی ذکر ہوگا۔

برِّصغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ آزمائش کا دور وہی تھا جسے ہم دورِ غلامی کہتے ہیں۔ انگریز نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہاں ان کو حقیقی مزاحمت کا سامنا صرف مسلمانوں کی جانب سے ہوگا، لہٰذا اپنی حکمتِ عملی میں انہوں نے یہ مقصد سرِ فہرست رکھا کہ مسلمانوں کو ہر پہلو سے نقصان پہنچایا جائے۔

بے بسی اور بے کسی کی اس کیفیت اور حد درجہ نا مساعد حالات میں برِّصغیر کے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ ان کی اجتماعی حیثیت کا تسلیم کیا جانا ضروری ہے، ورنہ انگریزوں کی دشمنی اور ہندوؤں کی عددی کثرت کی وجہ سے وہ بے نام و بے مقام ہو کر رہ جائیں گے۔ برِّصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی داستان درحقیقت ان کے اجتماعی تشخص کو تسلیم کئے جانے کی داستان ہے اور اس کی نظریاتی بنیادیں استوار کرنے میں علامہ اقبالؒ کی فکر کے وسیلے نے اہم کردار ادا کیا۔

علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر بہت بڑا مقصد تھا۔ وہ اسلامیانِ ہند کو بالخصوص اور اُمتِ مسلمہ کو بالعموم فکری اور سیاسی غلامی سے نکال کر اقوامِ عالَم کی صف میں ایک باوقار مقام دلوانا چاہتے تھے۔ اتنے عظیم مقصد کے لئے ایمان اور صدقِ عمل ہی وسیلہ بن سکتے تھے۔ ان کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے مقالہ نگاری اور شاعری کو ایک بڑے تعمیری مقصد کے حصول کا ذریعہ

بنایا۔ وہ مختلف وادیوں میں نہیں بھٹکے بلکہ اپنے فکروفن کو اپنے ایمان کے تابع کرلیا۔ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں علامہ اقبالؒ کی اہمیت سے آگہی کے لئے ان کی فکروفن کے بعض اہم نکات پر توجہ ضروری ہے۔

ان کا پختہ اور کامل یقین یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے لئے دین صرف اسلام ہے اور اسلامی نظامِ فکر کا محور و مرکز تصورِ توحید ہے۔ توحید پر ایمان کے نتیجے میں معاشرتی وحدت اور احترامِ آدمیت ضروری ہے۔ توحید پر ایمان انسانی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے اور اس سے انسانی زندگی پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

معاشرتی وحدت کے اظہار کیلئے ایک ریاست ضروری ہے۔ ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہلِ مکہ کی جانب سے بادشاہت کی پیش کش یکسر مسترد کردی اور اسلامی نظام کے قیام کا ایک عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس معاشرے میں عقیدۂ توحید ایک زندہ معاشرتی قوت کی طرح کارفرما نظر آتا ہے، یعنی انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے قانون کی بالادستی تاکہ ہر انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں گلشنِ آدمیت کے پھول اور پھل بن کر عالمِ انسانیت کیلئے سامانِ بہار کی صورت نکھر کر سامنے آجائیں۔

علامہ اقبالؒ نے برِّصغیر کے مسلمانوں کے سامنے عالمگیر ملّی وحدت کی بنا پر جداگانہ قوم کا جو تصور پیش کیا اور جو آگے چل کر قیامِ پاکستان کا باعث بنا، وہ کسی تعصّب یا محدود منفعت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ وہ اسلام کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر یقینِ محکم کا تقاضا تھا۔ اس ایمان کے بعد انسان جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کے قیام کو اپنا مقصدِ حیات بناتا ہے۔

اسلام نے ہمارے سامنے دو اصول بنیادی عقیدے کے طور پر مقرر کئے ہیں۔ پہلا احترامِ آدمیت کا اصول یعنی مقامِ آدمی سے آگاہی پاؤ کہ احترامِ آدمی ہی کا نام آدمیت ہے۔ یہ اصول اس ارشادِ قرآنی کے مطابق ہے:

ہم نے بنی آدم کو احترام عطا کیا اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔ (سورۃ بنی اسرائیل۔ آیت:70)

علامہ اقبالؒ نے اسے اپنی شاعری میں اس طرح سمویا:

باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمیت احترامِ آدمی

اور دوسرا اخوتِ ایمان کا اصول جسے اقبالؒ نے اس طرح بیان کیا:

تُو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
غُبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مُرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

یہ تفسیر ہے قرآنِ پاک کے اس ارشاد کی:

سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ اس طرح اللہ تمہارے سامنے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے۔ (سورۃ آلِ عمران۔ آیت: 103)

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے برِّصغیر کے مسلمانوں کو جداگانہ وحدت قرار دیا اور کہا کہ ان کو اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی ضرورت ہے۔ ہمارا مسئلہ صرف آزادی کا حصول نہ تھا بلکہ اصل مقصد اس مملکت میں اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کرنا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے حریت پر بہت زور دیا ہے۔ دراصل حریت میں شخصی آزادی اور احترامِ آدمیت دونوں شامل ہیں۔ مساواتِ انسانی کا تصور اسی اصول کی بناء پر ایک سماجی حقیقت بن سکتا ہے۔ اخوت مسلمان کے لئے جزوِ ایمان ہے۔ عدالت اس نظامِ ارض و سما کی تخلیق اور اس کے قیام کا سبب ہے۔ امانت اور دیانت اس عدالت کو انسان کی معاشرتی زندگی میں قائم کرنے اور قائم رکھنے کا وسیلہ ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا جب انہوں نے کہا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

علامہ اقبالؒ دورِ غلامی میں مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ ان کو صرف آزادی ہی حاصل نہیں کرنی بلکہ آزادی اور احترامِ آدمیت کی راہ پر عالمِ انسانیت کی رہنمائی بھی کرنی ہے۔ انتہائی تاریک دَور اور نامساعد حالات میں بلند ترین مقاصد کی جانب پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اشارہ محض خواب یا خیال کی باتیں نہیں تھیں، اس میں ارشاداتِ قرآنی پر

فیضانِ سماوی سے محرومی انسان کی سب سے بڑی محرومی ہے اور اس محرومی سے تحفظ کا سامان ہمارے سوا کسی کے پاس نہیں۔ ہم نے پاکستان اسی صداقت کی شہادت کے لئے ہی تو بنایا تھا۔ قیامِ پاکستان میں علامہ اقبالؒ کی فکر کی توانائی اور ان کی آرزوؤں کی روشنی ہمارے ساتھ تھی۔ انہوں نے کہا:

مری نگاہ نہیں سُوئے کوفہ و بغداد
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

قیامِ پاکستان محض ایک خطہ ارض کی آزادی کا نہیں بلکہ اسلامی ضابطۂ حیات کی سماجی تشکیل کا اعلان تھا۔ تمام باطل نظاموں کے لئے اصل خطرہ اسی امکان کا تھا اور ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلامی فکر کی عملی طور پر سماجی تعبیر ہو جائے۔

(پروفیسر حسنین کاظمی: اقبال باکمال)

عمل پیرا ہونے کا درس بھی شامل تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبالؒ کی نگاہ میں برِّصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ یا حیاتِ نو کا مفہوم کیا تھا اور وہ جب یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے گا تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں مسلمانوں کی عالمی امامت کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان دنیا کے تمام غیر مسلموں پر اپنی حکومت قائم کر لیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کو بطورِ اجتماعی قوانین کا تحفظ حاصل ہو جائے۔ یہی پیروی سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

خواجہ غلام السیّدین کے نام اپنے ایک خط میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ "علم کے ذریعے انسان کو جو طبعی قوت ہاتھ آتی ہے اگر وہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔" تعلیماتِ اسلامی کی رُو سے اقبالؒ معاشرتی اختیار اور اقتدار کو بھی انسان کے پاس دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی امانت تصور کرتے ہیں۔ تعلیماتِ قرآنی اور اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس امانت کی ذمہ داری کو ایک مسلمان کس طرح بطریقِ احسن پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔

اسلام کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان کی بالادستی سے نجات دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کی فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے مطابق باہمی مشاورت سے معاملات و مسائل طے کرنے کیلئے وہ ایک نظام کی تشکیل کر لیں۔ قائدِ اعظمؒ کے نام ایک خط میں علامہ اقبالؒ نے لکھا:

> "اسلامی قوانین کے گہرے مطالعے کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر قانون کو اچھی طرح سمجھ کر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے لئے حقِ روزی محفوظ ہو جاتا ہے لیکن اس ملک [متحدہ ہندوستان] میں جب تک آزاد مسلم ریاست وجود میں نہ آئے اس کا نفاذ ممکن نہیں۔"

یہ ہماری ذمہ داری تھی اور ہے کہ پہلے خود راہِ راست اختیار کریں اور دیکھتے رہیں کہ ساری دنیا میں انسان کہیں بھی ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنیں۔ ہم امتِ وسطہ ہیں، اپنے مرکز سے تعلق اور پھر عالمِ انسانیت کی نگہبانی بھی ہمارا فرض ہے۔ حریّت، اخوت، مساوات اور صداقت، امانت اور دیانت عالمگیر انسانی اقدار ہیں۔ انسانی معاشرے کے مہذب ہونے کے یہی پیمانے ہیں۔ یہ پیمانے عالمِ انسانیت کو قرآنِ حکیم کے وسیلے سے ملے ہیں۔ ان کی نگہداشت بہرحال ہماری ذمہ داری ہے۔

مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا میں آنا بڑی سعادت ہے لیکن اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اقبالؒ کا تصورِ مومن ایک مطمئن انسان کا تصور ہے۔ ایک ایسا انسان جو سکونِ قلب سے کہہ سکے کہ مَیں نے اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت عالمِ انسانیت کی کوئی خدمت کی ہے۔ دل کی دولت ہی مسلمان کی زندگی کا حاصل ہے، بقول علامہ اقبالؒ:

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں

تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اقبالؒ کے مردِ مومن کا دل آزاد ہوتا ہے، بیدار ہوتا ہے اور وہ اس منزلِ بلند پر پہنچ جاتا ہے جہاں مسلمان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا، کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اُس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

اُس وقت ساری دنیائے اسلام غلام تھی۔ صرف ترکوں کا ایک جھنڈا تھا جو آزاد فضا میں لہرا رہا تھا، مگر ترکوں کو بھی مجموعی زوال نے آن لیا۔ اس سب ظاہر بے سروسامانی کے باوجود علامہ اقبالؒ کا وجدان انہیں بتا رہا تھا کہ غلامی کی شبِ تاریک ختم ہونے والی ہے، غلامی کی زنجیر کٹنے والی ہے۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانانِ برِصغیر

- شیطانی اعمال والا بھلے لوگوں کے متعلق ہمیشہ بدگمانی رکھتا ہے
- اللہ کیلئے خدمت کر، خلقت کے دَر سے تجھے کچھ نہیں ملے گا
- کنجوس دولت کا مالک نہیں ہوتا، دولت اس کی مالک ہوتی ہے
- فکر ہی سے فکر دُور ہوتی ہے
- لالچی کی قبر کو مٹی کے بغیر کوئی شے نہیں بھر سکتی
- انسانوں کے کام آنا انسانیت کی جان ہے
- دوست وہ ہے جو تجھے تیرے عیبوں سے آگاہ رکھے

—— مولانا جلال الدین رومیؒ

بلکہ پوری ملت کے دلوں کی بیداری کا سامان یوں کیا:

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مِری پیدا کرے گی سوز و ساز
اِس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیر پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
نالۂ صیّاد سے ہوں گے نَوا ساماں طیور
خونِ گُل چیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہُوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے
قسمتِ عالَم کا مسلم کوکبِ تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اَسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہُوں اس دورِ نشاط افزا کو مَیں
دیکھتا ہُوں دوش کے آئینے میں فردا کو مَیں

امید افزا شعر نگاری کا یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ احوال نے پلٹا کھایا' اور انہوں نے 1923ء میں کُھل کر اعلان کردیا کہ:

دلیل صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب ابھرا' گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

علامہ اقبالؒ نے یہاں گویا ایک بہت بڑے راز سے پردہ اٹھایا ہے۔ صاف بتادیا کہ حضور نبی کریمؐ کے روحانی تصرّف (بخشش' عطا) کا آغاز ہوگیا ہے۔ دوسروں کی نگاہیں اس تصرّف کو شاید نہ دیکھ رہی ہوں لیکن اہلِ دل کی آنکھوں پر یہ

> اقبالؒ ہمیں اس لئے بھی عزیز ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اسلامیانِ برِّصغیر کے الگ وطن کا تصور پیش کیا' بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کیلئے اپنے کلام کی گرمی سے وہ قافلہ تیار کیا جس نے حصولِ مقصد کے لئے تن من دھن کی بازی لگادی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بے خوف اور بے لوث قائد کی نشان دہی کرکے قافلۂ آزادی کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کرلیا۔ کون نہیں جانتا کہ محمد علی جناحؒ جو بعد میں قائدِاعظم اور پھر بانیِ پاکستان بنے' علامہ اقبالؒ کے اصرار پر اور ان کے دلائل سے قائل ہوکر ہی لندن میں اپنا آرام تج کر برِّصغیر میں آئے۔ انہی کی بے مثل قیادت میں 14 اگست 1947ء کو علامہ اقبالؒ کا خواب حقیقت بنا اور پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھر آیا۔ (پروفیسر محمد منوّر: ایقانِ اقبالؒ)

تصرّف بالکل واضح اور ظاہر تھا۔ گویا تین چیزیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ ایک غلامی کے دور میں فقہی صورتِ حال کی علیٰ حالیہ حفاظت (Status quo) اور اس میں کسی خاص اجتہاد سے اجتناب اور دوسری چیز عنقریب حاصل ہونے سے اجتناب اور دوسری چیز عنقریب حاصل ہونے والی آزادی کی امید اور اس کے لئے دلوں کو پُر اُمّید رکھنے بلکہ دلوں میں ولولۂ آزادی پیدا کرنے کی کوشش کا جاری رکھنا..... تیسری چیز یہ کہ جب آزادی میّسر ہو تو مسلمان معاشروں کا فرض ہوگا کہ اس وقت زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے سرمایۂ فقہ کا از سرِ نو جائزہ لیں اور جرأت کے ساتھ پیش آمدہ معاشی' دینی اور سیاسی امور و مسائل کا حل تلاش کریں۔

اسی لئے تو آج وہ ملّت کا اقبال کہلاتے ہیں۔

سرسید احمد خان

حسیب لطیف

1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانانِ برِّصغیر پر ظلم و ستم کا نیا باب شروع ہوا۔ انگریزوں نے اسے بغاوت اور غدر کا نام دیا۔ صرف اور صرف مسلمانوں کو اس کا موردِ الزام ٹھہرانے لگے اور برِّصغیر کے طول و عرض میں مسلمانوں کی سرکوبی کے لئے مہم چلا دی گئی۔ وہ مسلمان جو بالواسطہ یا بلا واسطہ جنگِ آزادی میں ملوث تھے' اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ دہلی کی گلیاں مسلمانوں کے خون سے رنگ گئیں۔ اہلِ ثروت سے اُن کی جائیدادیں اور زمینداروں سے اُن کی زمینیں چھن گئیں۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو جنگِ آزادی میں اہم کردار ادا کرنے کا مجرم قرار دے کر ملک بدر کر دیا گیا۔ ان کے بیٹوں کا انتہائی بے دردی سے قتل ہوا۔ ایسے حالات میں ایک مردِ علم و عمل مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور عظمت واپس دلانے کے لئے کمر بستہ ہوا جس نے تحریکِ بیداریِ مسلمانانِ برِّصغیر کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی قدر و منزلت اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ (حیاتِ نو) کے حصول کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔

جنگِ آزادی سے پہلے ہی ہندوؤں نے انگریزی زبان' مغربی تہذیب و تمدن اور جدید علوم حاصل کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ وقت کی ضرورت کو سمجھ چکے تھے اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر انگریزوں کی سرپرستی میں مسلمانوں کے چھ سو سالہ حکمرانی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگِ آزادی میں ہندوؤں کی شرکت کے باوجود صرف مسلمان ہی مجرم ٹھہرائے گئے کیونکہ ہندو انگریزوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

سرسید نے سرکاری ملازم (ایسٹ انڈیا کمپنی کے تنخواہ دار) ہونے کے باوجود 1857ء کی جنگِ آزادی کے حالات حکمران طبقے کو لکھ کر بتائے۔ جب اُن کی کتاب ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' کا انگریزی ترجمہ برطانوی پارلمنٹ میں پیش ہوا تو بعض عمائدین نے خوب نکتہ چینی کی۔ سرسید کو اپنا دشمن اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا باغی قرار دے کر اُن کو سزا دینے پر زور دیا لیکن کچھ ارکانِ پارلمنٹ ایسے بھی تھے جنہوں نے سرسید کے خیالات کی تائید کی۔ سرسید نے انگریزوں پر یہ بات واضح

کرنے کی کوشش کی کہ جنگِ آزادی غدر یا سازش نہیں تھی بلکہ یہ چند غلط فہمیوں کا فوری ردِعمل تھا۔ اس کی تائید سر ولیم نے بھی کی جو اس واقعہ کے بعد انڈیا آفس کے انڈر سیکرٹری تھے اور لارڈ لارنس نے بھی آخر یہی فیصلہ کیا کہ یہ صرف کارتوس کے سبب مسلمان سپاہیوں کا ایک احتجاج تھا۔ نہ یہ سازش تھی' نہ بغاوت۔ یوں سرسید احمد خان نے انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانیوں' بالخصوص مسلمانوں کے خلاف پائے جانے والے اوہام اور نفرت کو کم کیا۔ دوسری طرف سرسید نے ہندوستانی عوام کو برطانوی حکومت سے وفاداری کی تلقین کی تاکہ حکومت اور عوام میں شکوک وشبہات کی صورت نہ پیدا ہو اور فتنہ وفساد سے بچا جا سکے۔

1867ء میں اُردو ہندی تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ ہندوؤں کی مسلمانوں اور ان کی ثقافت کے خلاف ایک گہری سازش تھی۔ وہ اُردو کے بجائے ہندی کو نصابِ تعلیم اور سرکاری محکموں میں ذریعۂ بیان واظہار کے طور پر لانا چاہتے تھے۔ اس واقعہ سے پہلے سرسید احمد خان نے ہندوستان میں امن وامان کے قیام اور بقا کے لئے دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کے اتفاق اور مل جل کر رہنے کو لازم قرار دیا تھا' لیکن اردو ہندی تنازعے نے اُن کی آنکھیں کھول دیں۔ اُن کی دُوررس نگاہوں نے جان لیا کہ ہندو آنے والے وقت میں کبھی بھی مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر نہیں رہ سکتے۔ سرسید کی سیاسی بصیرت اور فکری دانائی کی بدولت دوقومی نظریہ کی بات ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ''دوقومی نظریے'' کی بات سامنے آئی۔ سرسید احمد خان نے برِّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر واضح کر دیا کہ ''مستقبل میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ریاست ناگزیر ہے جس کی بنیاد صرف اور صرف اسلام اور تہذیبِ اسلام ہوگی۔''

امتِ مسلمہ کی بے حالی نے سرسید کو آئندہ چالیس برس تک مضطرب رکھا اور اسی اضطراب سے ان میں انقلاب آفریں کارنامے سرانجام دینے کی تحریک' قوت اور ہمت پیدا ہوئی۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستانی معاشرے میں جو انقلاب آیا' اس نے سرسید کے ذہن پر ایک مجموعی تہذیبی اثر مرتب کیا۔ اس لحاظ سے سرسید اُن پہلے عظیم ہندوستانی مفکروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے عصری تقاضوں کے پیشِ نظر تبدیلی کے ہمہ گیر اور دُوررس نتائج کا ادراک کیا اور ایک اثباتی ردِعمل کے لئے ذہن کو تیار کیا۔

سرسید کی باقاعدہ کاوش کا آغاز 1864ء میں ''علی گڑھ تحریک'' سے ہوا۔ یہ کوئی عام تحریک نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے لئے ایک نئے علمی اور عملی سفر کا آغاز تھا۔ سرسید احمد خان نے جدید علوم کے حصول کا طریق کار جاننے کے لئے برطانیہ کا دورہ کیا اور وہاں علمی درسگاہوں اور لائبریریوں کا بغور جائزہ لیا۔ ہندوستان واپسی پر انہوں نے وہ تمام چیزیں' جو اسلامی تہذیب اور تعلیمات سے متصادم نہ تھیں' اپنانے کا فیصلہ کیا۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان عقل وشعور سے عصری تقاضوں کو

سمجھیں، محرک ہوں اور ارتقائی منازل کی جانب گامزن ہو کر علوم وفنونِ عصریہ حاصل کریں۔ بعض حلقوں نے ان پر کفر تک کے فتوے لگا دیئے لیکن اُن کے دل میں پائی جانے والی مسلم اُمہ کے لئے سچی لگن اور بے کنار محبت نے راستے میں آنے والی کسی بھی رکاوٹ کو خندہ پیشانی سے عبور کروا دیا۔ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے حصول کے لئے انہوں نے ہر کڑوے گھونٹ کو آبِ حیات سمجھ کر پیا۔ 1873ء میں جب سرسید مدرسۃ العلوم کی داغ بیل ڈالنے کی تیاریوں میں منہمک تھے اور مخالفت شدت پکڑتی جا رہی تھی، انہوں نے لاہور کے ایک جلسے میں جو تقریر کی، وہ اہلِ فہم و دانش کو ان کا ہمنوا بنا گئی۔ اس تقریر کا ہر لفظ ان کی بے لوث خدمت اور دردمندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اُس تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

اے بزرگانِ پنجاب! مَیں بدعقیدہ ہوں، مگر مَیں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر و مرتد آپ کی قوم کی بھلائی میں کوشش کرے تو کیا آپ اس کو اپنا خادم، اپنا خیرخواہ نہ سمجھیں گے؟ آپ کے لئے وہ دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں، آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے واحد کا نام پکارتے ہیں، بھنگی، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں، پس آپ مجھ کو بھی اسی مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجئے۔ میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے، اپنے گھر کو مت ڈھایئے۔ مجھ بدبخت، نامہ سیاہ کی شامتِ اعمال سے کیا آپ اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بہ نسلاً ڈبونا اور خرابی و خستہ حالی میں ڈالنا

ایک روز احباب کی محفل میں سرسید احمد خان کا ذکر ہوا۔ کچھ حق میں، کچھ مخالفت میں۔ آخر میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا:

''سرسید کی ذات بڑی بلند اور ہمہ گیر تھی۔ غلامی اور محکومی بڑی آفت ہے۔ حکومت اور اقتدار ایک سحر ہے جس سے محکوموں کے دل اور دماغ بے کار ہو جاتے ہیں۔ علی گڑھ کی کتنی بڑی خوبی ہے کہ اس نے ہمارے دل و دماغ کو محفوظ رکھا، یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ اسلام میں زندگی کی بے پناہ قوت ہے۔ یہ قوت علی گڑھ میں بھی کارفرما تھی اور محکومی کے باوجود اور مغربی تعلیم کے باوجود مسلمانوں کا جذبۂ ملی قائم اور برقرار رہا۔ سرسید احمد خان غالباً دورِ جدید کے وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے آنے والے زمانے کے مزاج کی جھلک دیکھ لی تھی، لیکن اُن کی حقیقی عظمت اس میں ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنہوں نے اسلام کی نئی تعبیر کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لئے جان توڑ کوشش کی۔''

(سیدنذیر نیازی: اقبالؒ کے حضور)

چاہتے ہیں؟ اگر آپ سب صاحبان میری حالت کو بدتر جانتے ہیں' اس سے عبرت پکڑیں اور براہِ خدا اپنی قوم کی' اپنی اولاد کی بھلائی و بہتری کی فکر کریں۔ (حالی' حیاتِ جاوید' صفحہ 143)

تھوڑے ہی عرصے میں سرسید احمد خان کی کوششیں رنگ لانے لگیں۔ رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' نے مسلمانوں کے مزاج میں کافی تبدیلی لانا شروع کی۔ وہ انگریزی تعلیم اور سائنس کی اہمیت سمجھنے لگے اور ان کے توہمات جو ترقی اور تبدیلیِ حالات کی راہ میں رکاوٹ تھے' آہستہ آہستہ دُور ہونے لگے۔ لوگوں کو رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ سرسید کو جس کام کے لئے چندہ دیا جاتا ہے' وہ اسی کام میں صرف ہوتا ہے۔ یہ امر زیادہ سے زیادہ چندہ دینے کا باعث بنا۔

سرسید نے 24 مئی 1875ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل سکول (ایم اے او سکول) کی بنیاد رکھی جو 1878ء میں کالج بنا اور 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مقام تک پہنچ گیا۔ اس ادارے کے قیام سے سرسید کا مقصود یہ تھا کہ یہاں سے طلباء ''مکمل انسان'' بن کر نکلیں۔ علم و اخلاق کے زیور سے آراستہ یہ طلباء مسلمانانِ ہند کے لئے ایک نمونہ بنیں۔ تاریخ نے دیکھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء نے تحریکِ پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور قیامِ پاکستان کے خواب کو تعبیر کے سانچے میں ڈھالنے میں مددگار اور موثر ثابت ہوئے۔

سرسید نے 1857ء کے حالات ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں لکھے اور جنگِ آزادی کے محرکات کو تفصیل سے لکھ کر انگریزوں کو متوجہ کیا۔ جس وقت سرسید نے ان حالات کو قلم بند کر کے کتابی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو ان کے دوست رائے شنکر جج مرادآباد نے سرسید کو مشورہ دیا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا کہ میں اِن کتابوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک و قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں۔ پس اگر ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو' مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارہ ہے۔ رائے شنکر نے جب سرسید کی اس درجہ آمادگی دیکھی اور سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو آبدیدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔ سرسید نے دو رکعتیں بطورِ نفل ادا کیں اور کچھ کم پانچ سو جلدوں کا ایک پارسل لندن روانہ کر دیا۔ ایک جلد گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔

سرسید کے سامنے جنگِ آزادی کا پورا نقشہ تھا۔ انہوں نے ذاتی طور پر جنگِ آزادی سے متاثر مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھی تھی' وہ اس کے مضر اثرات سے بخوبی واقف تھے۔ صرف مسلمان قوم ہی نہیں بلکہ دوسری ہندی قوموں اور انگریزوں پر بھی جو مظالم ہوئے' ان سب سے وہ یکساں متاثر تھے۔ ایسے حالات کی کیفیت خود ان کی زبانی سنیئے:

غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنے گھر کے لُٹنے کا رنج تھا' نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا' وہ اپنی قوم کی بربادی کا رنج تھا... میں اُس وقت ہرگز یہ نہیں

سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی' کچھ عزت پائے گی اور جو حال اس وقت قوم کا تھا' وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ چند روز میں اِسی خیال میں رہا اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیئے۔ جب میں مراد آباد پہنچا جو بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا' تو اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامرادی اور بے مروّتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑ کر مَیں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں! اس مصیبت میں شریک رہنا چاہئے اور جو مصیبت پڑے' اس کو دُور کرنے میں ہمت باندھانا ہمارا قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو ہی پسند کیا۔

(خطباتِ سرسید' جلد اول' صفحہ 278)

سرسید مدرسہ کے لئے قلیل سے قلیل رقم کو بھی ویسی خوشی اور کشادہ پیشانی سے قبول کرتے تھے' جیسے بڑی بڑی رقمیں کو لیتے ہوئے۔ کسی دوست نے اگر اُن کی دعوت کی تو سرسید اس سے دعوت کے بدلے نقد روپیہ لے کر کالج کے چندہ میں جمع کر دیتے تھے۔ ایک بار جب انہوں نے پنجاب جانے کا ارادہ کیا تو اپنے دوست خان بہادر برکت علی خان کو ایک خط لکھا جس کا کچھ حصہ اس طرح تھا: ''آپ سے اور سب دوستوں سے درخواست ہے کہ جو کچھ آپ یا احباب میری

- اگر کوئی شخص قرض لے اور دینے کی نیت نہ ہو تو وہ چور ہے
- دولت سے نرم بستر حاصل کر سکتے ہو' نیند نہیں
- محتاج کو مہلت دینے میں احسان نہیں' بلکہ عدل و انصاف ہے
- بادشاہ کے کارندوں کے ظلم کی باز پرس بادشاہ سے بھی ہو گی
- سچائی کامیابی کا اور جھوٹ رُسوائی کا سبب ہے
- اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھ لینا جہالت ہے
- دس میں سے نو برائیاں اور تکلیفیں سُستی سے پیدا ہوتی ہیں
- دنیا کی جو چیز بھی تم سے کھو جائے' اُسے غنیمت جانو

— فریدالدین عطارؒ

مہمانداری میں صرف کرنا چاہیں' ازراہِ عنایت اس کی لاگت نقد عنایت فرمائیں۔ میں نے اکثر دوستوں سے اسی طرح دعوت کے بدلے نقد روپیہ لے لیا ہے اور اس کو کالج کے چندہ میں جمع کر دیا ہے۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ امیر اور غریب سب دعوت کر سکتے ہیں۔'' (حالی' حیاتِ جاوید' صفحہ 199)

معروف محقق اور تحریکِ پاکستان پر مستند کتب کے مصنف ڈاکٹر جہانگیر تمیمی نے اسلامیانِ برِّصغیر کے لئے سرسید احمد خان کی خدمات کے سمندر کو کوزے میں یوں سمویا ہے:

> سرسید احمد خان کا برِّعظیم کی ملتِ اسلامیہ پر یہ احسان کیا کم ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو قرونِ وسطیٰ کے عہدِ قدیم سے نکال کر جدید دور میں داخل کر دیا' جس کے نتیجے میں وہ دینی عصبیت بیدار اور نمودار ہو گئی جو قوموں کی زندگی کا زادِراہ ہے۔ یہی وہ دو قومی نظریہ ہے' جس کے آگے انگریزی استعمار اور عیار ہندو نے

بالآخر ہتھیار ڈال دیئے' سرسید احمد خان برِّعظیم میں دوقومی نظریہ کے اولین علمبردار کے طور پر شہرت عام اور بقائے دوام کی حامل شخصیت ہیں۔ یہ وہ تاریخی کردار ہے جسے کسی دور کا مؤرخ تذکرہ کئے بغیر گزر نہیں سکتا۔ (زوال سے اقبال تک' صفحہ 210)

سرسیّد احمد خاں کی ادبی خدمات بھی نہایت اہم ہیں۔ اُردو زبان و ادب پر ان کے بے شمار احسانات ہیں۔ مختلف قومی' ادبی اور تعلیمی مضامین شائع کرنے کے لئے سرسیّد نے کئی کتابیں لکھیں۔ ان سے پہلے اردو کی نثر تکلف اور تصنع سے پُر ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے ان کتب میں جو بھی لکھا' وہ سادہ اور آسان زبان میں ہوتا تھا اور قاری کے دِل میں اتر جاتا تھا۔

مختصر یہ کہ سرسید کے مشن کا مدعا و مقصد یہ تھا کہ مسلمان:

- ایسے عقائد جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو' ترک کر دیں اور مذہب کی روح کو سمجھیں۔
- تمام مذہبی اور سماجی توہمات سے اجتناب کریں اور عقلِ سلیم کی روشنی میں معاملے کو سمجھ پرکھ کر عملی صورت اختیار کریں۔
- بچوں کو تعلیم دلانے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ علم کے بغیر زندگی کے کسی بھی شعبے میں ترقی ممکن نہیں۔ جب تک جہالت کو جڑ سے نہیں اکھاڑا جاتا' ترقی کی راہیں ہموار نہیں ہوسکتیں۔
- عورتوں کو علم کے زیور سے آراستہ کریں۔ ان کے حقوق کا ہر ممکن لحاظ رکھیں۔ انہیں دستکاری اور دیگر چھوٹے موٹے مفید کام سکھائیں۔
- مختلف فنون سیکھیں۔ ممکنہ حد تک صنعتی ترقی کی کوشش کریں تاکہ اقتصادی مسائل آسانی سے حل ہوسکیں' وہ خود کفیل ہوں اور ان میں خود اعتمادی آئے۔
- مغربی علوم و فنون سیکھیں۔ جدید طرزِ زندگی اپنائیں' مگر ان کے حصول میں اس بات کا خیال رکھیں کہ کوئی بھی طریق اسلامی احکام و تعلیمات سے تضاد نہ پیدا کرتا ہو۔ جدید علوم و فنون بھی سیکھے جائیں اور مذہبی و تاریخی تشخص بھی قائم رکھا جائے۔

سرسید کے خطبات و افکار اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تادیر استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ اسلامی دنیا سرسید احمد خان کے اس جاری و ساری فیض کی احسان مند رہے گی کہ انہوں نے ایک طرف آزادی و خود شناسی کا درس دیا اور دوسری طرف علم کے احیاء اور فکر و نظر کے چراغ روشن کر کے مسلمانانِ برِّصغیر کی دینی' سیاسی اور علمی تعمیر و ترقی کا اثاثہ فراہم کیا جو آگے چل کر تحریکِ پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوا۔

حوالہ جات

اس مضمون کیلئے مندرجہ ذیل کتب اور جرائد سے استفادہ کیا گیا:

1۔ ڈاکٹر محمد جہانگیر تیمی' زوال سے اقبالؒ تک

2۔ علم و عمل' جلد دس' شمارہ ایک' سرسید میموریل سوسائٹی' اسلام آباد

3۔ پروفیسر احسان رشید' تحریکِ آزادی و تاریخِ آزادی' کراچی یونیورسٹی

4۔ خطباتِ سرسید' جلد اول' ادارۂ تصنیف و تالیف مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ

5۔ مولانا الطاف حسین حالی' حیاتِ جاوید' کتابیات' آرام باغ کراچی

گوشۂ وطن

پرچمِ ستارہ و ہلال

تحریکِ پاکستان کے دو ممتاز رہنماؤں سردار عبدالرب نشتر اور جناب مرزا ابوالحسن اصفہانی کی یادداشتوں میں اور باتوں کے علاوہ پاکستان کے قومی پرچم کی ترتیب، وضع قطع اور منظوری کی داستان بھی سمٹ آئی ہے۔ پرچمِ ستارہ و ہلال کی سرافرازی کی دعا کے ساتھ یہ معلومات افزا تحریر نذرِ قارئین ہے

3 جون 1947ء کو برِّصغیر کی تقسیم کا اعلان ہُوا، تو تقسیم کے کام کے لئے پاکستان اور بھارت کے نمائندوں پر مشتمل کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی صدارت میں ایک کمیٹی وزراء پر مشتمل تھی جس میں بھارت کی طرف سے سردار پٹیل اور بابو راجندر پرشاد ممبر تھے اور پاکستان کی طرف سے جناب لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر۔ چند دن بعد جب سندھ کی صوبائی اسمبلی نے اعلانِ تقسیم کی شرائط کے مطابق تقسیم کے حق میں تجویز پاس کی تو پاکستان کی طرف سے قائدِاعظمؒ اور بھارت کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس کمیٹی میں شامل کئے گئے۔ کمیٹی کے اجلاس عام طور پر صبح کے وقت وائسرائے کے گھر پر ہوا کرتے تھے اور سہ پہر کو پاکستان کے نمائندے قائدِاعظمؒ کے مکان واقع اورنگزیب روڈ دہلی پر مشورہ کے لئے جمع ہوتے تھے۔ وہاں پر صبح کی کارروائی اور آئندہ اجلاس کے ایجنڈے پر غور کیا جاتا اور ساتھ ہی ساتھ دیگر مسائل کے متعلق بھی فیصلے کئے جاتے تھے۔ ایک دن وائسرائے نے قائدِاعظمؒ کے ساتھ پاکستان کے پرچم کے متعلق بحث چھیڑی اور بتایا کہ بھارت کے نمائندے تو اس بات پر رضا مند ہیں کہ دیگر نوآبادیوں (Dominions) کی طرح اپنے جھنڈے میں پانچواں حصہ برطانوی پرچم یعنی یونین جیک کے لئے مخصوص کریں۔ اس نے قائدِاعظمؒ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے رفقاء سے مشورہ کر کے وائسرائے کو مطلع کریں گے۔

قائدِاعظمؒ کی جمہوریت پسندی اور مشاورت پر یقین کے جذبے کو دیکھئے کہ وہ اس سادہ سی بات کا جواب وہیں دے سکتے تھے، مگر انہوں نے یہ معاملہ شام کے اجلاس میں کمیٹی کے ارکان کے سامنے رکھا۔ طے پایا کہ یہ تجویز نہیں ماننی چاہئے کیونکہ ہماری کیفیت کسی برطانوی ڈومینین سے جُدا ہے۔ وہ ممالک برطانوی لوگوں کے قبضہ میں ہیں اور انہیں قدرتاً برطانوی جھنڈے سے خاص تعلق ہے، ہم تو برطانیہ کے قبضے سے آزادی حاصل کر رہے ہیں، برطانیہ کے ساتھ نہ ہمارا نسلی

تعلق ہے' نہ مذہبی۔ ہمارا ملک ایک آزاد اسلامی ملک ہوگا۔ اس ملک کے پرچم میں ایک ایسے جھنڈے کو جگہ دینا جو غلامی کی یادگار ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں صلیب موجود ہے' غیر منطقی اور قوم کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ قائدِ اعظمؒ نے وائسرائے کو اطلاع دے دی کہ اس معاملے میں بھارت کا جو بھی رویّہ یا پالیسی ہو' پاکستان یونین جیک کو اپنے پرچم میں جگہ نہیں دے سکتا۔

طے پایا کہ بحریہ والے چونکہ پرچم بنانے میں ماہر ہوتے ہیں' اس لئے انہیں کہا جائے کہ پاکستانی نمائندوں کے فیصلے کے مطابق قومی پرچم تجویز کریں۔ چند دن بعد بحریہ نے چند چھوٹے چھوٹے پرچم بنا کر بھیج دیئے۔ کسی میں سفید رنگ دونوں طرف اور بیچ میں مسلم لیگ کا جھنڈا تھا کسی میں سفید رنگ' لکڑی یا بانس کی طرف اور مسلم لیگ کا پرچم دوسری طرف اور کسی میں اس کا اُلٹ۔ ایک سہ پہر کو حتمی انتخاب کے لئے پرچم کے چند نمونے پیش ہوئے۔ دونوں طرف سفید رنگ اور بیچ میں سبز جھنڈے والا نمونہ تو بھلا نہیں معلوم ہوتا تھا' اس لئے اسے رد کر دیا گیا' باقی دونوں پر بحث ہوئی۔ بالآخر موجودہ پرچم کا انتخاب کیا گیا۔ علاوہ دیگر وجوہات کے اس کی تائید میں دو باتیں تھیں۔ ایک تو پرچم کا سبز حصہ جو ہوا میں لہراتا ہے' خوبصورت نظر آئے گا' دوسرے جو کپڑا جھنڈے کی لکڑی پر چڑھایا جاتا ہے' وہ سفید رنگ کا ہوتا ہے' اس لئے اسی تسلسل میں سفید رنگ والا حصہ ہونا چاہئے۔ اس طرح ایک تو سب اقلیتوں کی مشترکہ نمائندگی ہو جائے گی اور دوسرے پاکستانی پرچم میں سفید رنگ کا موجود ہونا ہمارے ملک کی امن اور صلح کی پالیسی کا بھی مظہر ہوگا۔

بحریہ کو اس انتخاب کی اطلاع دی گئی اور اس نے وہ فارمولا تیار کر کے دیا جس کے مطابق پاکستان کا پرچم بنایا جاتا ہے۔ 11 اگست 1947ء کو کراچی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو خان لیاقت علی خان نے یہ فارمولا اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ ان کے ہاتھ میں اس وقت نمونے کا ایک چھوٹا سا پرچم بھی تھا جس کی نسبت یہ طے پایا کہ اسے بطورِ یادگار محفوظ رکھا جائے۔

جناب مرزا ابوالحسن اصفہانی مسلم لیگ کے ایثار پیشہ کارکن اور باشعور رہنما تھے۔ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد انہیں امریکہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا۔ ان کی یادداشتوں میں بھی پرچم کے حوالے سے معلومات کے کئی حیرت انگیز پہلو سامنے آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 3 جون 1947ء کے ماؤنٹ بیٹن کے اعلان کے فوراً ہی بعد پاکستان کے قومی پرچم کی ضرورت تھی' اس پرچم کے لئے مختلف نمونے پیش کئے گئے۔ آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ڈنڈے کے پاس جھنڈے کا ایک چوتھائی حصہ سفید ہو اور تین چوتھائی سبز اور سبز حصے پر ایک ہلال اور ستارہ ہو۔ جھنڈے کا سفید رنگ پاکستان کی اقلیتوں کی علامت تھا جن کی مجموعی تعداد آزادی کے وقت آبادی کے چوتھائی حصے سے بھی کم تھی۔ جب قومی پرچم پر اتفاقِ رائے

ہوگیا تو حکم دیا گیا کہ 14 اگست کو پرچم کشائی کے لئے جھنڈے تیار رہیں۔ 11 اگست کو وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے اس جھنڈے کو منظوری کے لئے مجلسِ آئین ساز کے سامنے پیش کیا۔ جھنڈے کی وضع قطع بتانے کے بعد انہوں نے اس کی علامتی اہمیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی:

صدرِ محترم! یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جھنڈا کسی ایک سیاسی جماعت یا فرقے کا جھنڈا نہیں ہے۔ یہ جھنڈا پاکستانی قوم کا اور اس پاکستانی ریاست کا جھنڈا ہے جو 14 اگست 1947ء کو وجود میں آ رہی ہے۔ جنابِ والا! کسی بھی قوم کا جھنڈا محض کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں ہوتا' کپڑا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اہم چیز وہ ہوتی ہے جس کی یہ نمائندگی کرتا ہے اور مَیں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھنڈا جس مجلس کے سامنے پیش کرنے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے اور ان سب لوگوں کے لئے جو پاکستان کے جھنڈے کے وفادار ہیں' آزادی اور مساوات کی علامت ہوگا۔ یہ جھنڈا ہر شہری کے جائز حقوق کی حفاظت کرے گا...

جناب اصفہانی نے واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے اور نیویارک میں پاکستانی قونصل جنرل کے لئے اسمبلی کا منظور کردہ پرچم تیار کرایا۔ پاکستان کے دیگر سفارت خانوں میں بھی یہی پرچم رائج و سربلند ہوگیا۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے تقریباً دو سال بعد امریکہ میں پاکستان کے سفارت خانے کو دفترِ خارجہ سے ہدایت موصول ہوئی کہ ہلال اور ستارے کے نشان کا رُخ بدل دیا جائے۔ آئندہ ہلال کا رخ مغرب یعنی جھنڈے کے

گہرے رشتے

قائدِ اعظمؒ نے 23 مارچ 1940ء کو قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے بعد سب سے پہلے جن ملکوں کی تائید وحمایت حاصل کرنے کی کوشش کی' ان میں سعودی عرب سرِ فہرست تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے نواب بہادر یار جنگ کو اپنے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے سعودی فرمانروا ملک عبدالعزیز کی خدمت میں بھیجا کہ برِّصغیر کے مسلمانوں کی حصولِ پاکستان کی جدّوجُہد میں تعاون کریں۔ نواب بہادر یار جنگ کا یہ مشن کامیاب رہا۔ 1943ء میں بنگال میں قحط پڑا تو سعودی فرمانروا نے مسائل کے باوجود دس ہزار پاؤنڈ کی رقم قحط کے صرف مسلمان متاثرین کی امداد کیلئے برطانوی حکومت کی بجائے براہِ راست قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح کو ارسال کی۔ اسی طرح سعودی عرب پہلا ملک تھا جس نے مسلم لیگ کو برِّصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت اور قائدِ اعظم کو مسلمانوں کا غیر متنازعہ رہنما تسلیم کیا۔ 1950ء میں سعودی حکومت حرمین شریفین کی توسیع اور تزئینِ نَو کا کام شروع کرنے لگی تو ملک عبدالعزیز نے ایک فرمان جاری کیا کہ اس کام میں پاکستانی انجینئروں کا تعاون حاصل کیا جائے اور توسیع وتزئین کے صرف اسی نقشے اور خاکے پر عمل ہوگا جس کی منظوری پاکستانی انجینئروں کی ٹیم دے گی۔

(کے ایچ خورشید: انٹرویو دیکھی نئی زندگی' لاہور' 25 دسمبر 1977ء)

بانس کی طرف ہونا چاہئے نہ کہ مشرق کی جانب جیسا کہ قومی جھنڈے میں تھا اور اب بھی ہے۔ بعد میں اس معاملے پر سفارت خانے اور پاکستانی دفترِ اُمورِ خارجہ میں خط کتابت ہوتی رہی۔ سفارت خانے کا نقطۂ نظر تھا کہ اس قسم کی تبدیلی غیر ضروری تھی کیونکہ ہلال اور ستارہ محض علامتی تھے اور ان کے رُخ سے بڑھتے گھٹتے چاند کا مفہوم پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کئی مثالیں دی گئیں اور بالخصوص بتایا گیا کہ ترکی کے قومی جھنڈے کا ہلال ایک مبالغہ آمیز خمدار ہلال تھا' جو جھنڈے کے بانس کے بالکل وسط میں بانس کے متوازی بنا ہے۔ یقیناً اس وضع کے کسی ہلال نے کبھی آسمان کو مزیّن نہ کیا ہوگا' نہ ہی ایسی خوبصورت شکل و صورت کا چمکدار ستارہ' ہلال کے دونوں سروں کے بیچ میں جاگزیں ہُوا ہوگا اور نہ ہی آسمان میں کبھی مقام و ہیئت کے اعتبار سے ایسا بے عیب اور کامل ہلال نظر آیا ہوگا' لیکن اس کے باوجود یہ ترکی کے قومی جھنڈے کا جزو ہے اور برسہا برس سے ایسا ہی چلا آتا ہے۔ حکومتِ پاکستان نے قومی جھنڈے کے ہلال اور ستارے کا رخ بدلنے کے سلسلے میں اپنے نقطۂ نظر اور فیصلے کو منوانے کو ضد اور اَنا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ ظاہر ہے یہ جھنڈا مجلسِ آئین ساز نے 14 اگست سے تین روز پہلے بغیر کسی اعتراض کے منظور کر لیا تھا اور قائدِ اعظمؒ نے بھی اسے پسند کیا تھا۔

کچھ عرصہ بعد واشنگٹن میں پاکستان کے سفارت خانے کو حکم ملا کہ وہ لاک ہیڈ ائر کرافٹ کارپوریشن کو ہدایت کرے کہ قومی جھنڈے کو پاکستان کی قومی ائرلائن (اورینٹ ائرلائنز) کے جہازوں کی دُم پر اس طرح بنائے کہ اس کا رخ مغرب کی سمت ہو' لیکن اس سے پہلے کہ کوئی دوسرا ہوائی جہاز' اورینٹ ایرویز کے لئے بن کر تیار ہو' حکومت نے اپنی ہدایات کے الفاظ کو یوں بدل دیا: ''جھنڈا دُم کی طرف اُڑتا اور ہلال وستارہ اسی ہیئت اور وضع سے باقی رہیں' جیسے کہ پاکستان کے جھنڈے میں ہے۔''

1955ء میں وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی وزارت نے سرکاری نشان (Coat of Arms) کو باقاعدہ طور پر اختیار کر لیا۔ اس میں ستارہ و ہلال کا وہی رخ ہے جو دستور ساز اسمبلی نے منظور کیا۔ یوں ستارہ و ہلال کے رخ کی تبدیلی کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو گیا۔ سرکاری نشان کو تمغوں' شیلڈوں' حکومتی تحائف اور سول و فوجی اعزازات پر کندہ کیا جاتا ہے۔ قومی تہواروں' میلوں' کھلاڑیوں کے لباس اور بینروں پر کاڑھا جاتا ہے' ریاستی مراسلوں' آئین و قوانین کی کتابوں اور اسناد وغیرہ پر چھاپا جاتا ہے۔

نشانِ عزمِ عالی شان

فطرت کے حُسن کی گرویدہ اقوام اپنی سرزمین کے کسی خوبصورت ترین پھول پودے' پتے درخت یا پرندے کو قومی علامت قرار دیتی ہیں۔ اس چناؤ میں اولیں ترجیح پھول کو دی جاتی ہے جو دلفریب' خوشبو سے معمور اور کارآمد بھی ہو۔ اس کا ذکر کہیں لوک گیتوں یا کہانیوں میں موجود ہو تو اسے فوقیت دی

جاتی ہے۔حکومتِ پاکستان کے محکمہ داخلہ نے گُلِ شبو (Tube-rose) اور یاسمین کے مابین موازنہ کرتے ہوئے یاسمین کے پھول کو قومی پھول کا اعزاز بخشا۔اس فیصلے کا اعلان 15 جولائی 1962ء کو کیا گیا۔اس کے ساتھ ہی موتیے کے پھولوں سے لدی ٹہنیوں کو بھی سرکاری نشان پر کندہ کر دیا گیا۔

یاسمین کی جنس کی دوسو سے زائد اقسام میں سے مندرجہ ذیل تین سے مطلوبہ پھول کا انتخاب ممکن تھا کیونکہ یہی تین اقسام پاکستان میں عوامی مقبولیت کی حامل تھیں:

1۔چمپا/بنسور/مالتی 2۔سرخ چنبیلی/رجنی 3۔موتیا

مذکورہ بالا پہلے دو پودے مغربی پاکستان کی نسبت مشرقی پاکستان میں نہ ہونے کے برابر تھے؛اس لئے یاسمین کی قسم موتیا ہی ہمارا قومی پھول قرار پاسکتا تھا۔جناب خورشید محمد چودھری نے اس حوالے سے بڑی دلچسپ معلومات قلم بند کی ہیں۔ان کے مطابق 1962ء میں قومی پھول کے انتخاب کا مرحلہ طے پانے پر اس کا تصوّری خاکہ تیار کرنے کا خیال دامن گیر ہوا۔ ان دنوں پاکستان کے دو مایۂ ناز مصوّر بقیدِ حیات تھے۔ان عہد ساز فنکاروں نے چند ہی روز میں قومی پھول کے خاکے تیار کر دیئے۔

استاد اللہ بخش نے جو پاکستانی ثقافت؛ معاشرت اور فطری منظر کاری کے علَم بردار تھے؛ سندھی اجرک کے فن پاروں؛ پنجابی؛ افغانی؛ سندھی دستاروں؛ کلاہوں؛ نسوانی دوپٹوں؛ ملتانی اور ہالہ کے گلدانوں میں یاسمین کی تینوں اقسام کے برگ وگل

> لیاقت علی خان کھڑے ہو کر ارکانِ اسمبلی کو جھنڈا دکھا رہے تھے تو قائدِ اعظمؒ کا چہرہ مشعل کی مانند روشن ہو گیا۔اس سے اللہ کی شکر گزاری اور اطمینان نمایاں تھا کہ آخر کار ان کی زندگی میں وہ دن آ ہی گیا جب پاکستان کے لوگ اپنا جھنڈا منتخب کرنے کے لئے آزاد ہو گئے۔قائدِ اعظمؒ اس وقت یوں نظر آ رہے تھے جیسے کوئی فخر کرنے والا باپ تقسیمِ اعزازات کی ایسی تقریب میں موجود ہو جس میں اس کے بیٹے کو سب سے بڑا انعام ملنے والا ہو۔ (خواجہ ناظم الدین:ایمان افروز لمحے)

سے گلدستے ترتیب دے کر انہیں کاغذ و کینوس پر منقش کیا؛ لیکن افسوس کہ یہ نادر و نایاب فن پارے دیمک کی نذر ہو گئے۔

مرزا غالب کی غزل اور علامہ اقبال کی خودی کے رازداں مصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے اپنی فیضانی اور الہامی کیفیت میں ایک نادر مرقع تخلیق کیا۔اس میں ایک تابندہ ستارہ؛ ہلالِ نَو کی ضیا پاش کرنوں کے جلو میں یاسمین کا سبز تصور اور دل آویز ادھ کھلی کلی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نوید کا اظہار ہیں۔

حوالہ جات

اس مضمون کی تحریر و ترتیب میں مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

1۔خورشید محمد چوہدری:قومی پھول کی کہانی

2. Syed Mujawar Husain Shah, *Sardar Abd-ur-Rab Nishtar— A Political Biography, 1957*

3. Mirza Abul Hassan Isphahani, *Quaid-i-Azam Jinnah—As I knew Him, 1967*

ہماری وادیاں ــــ ہمارے پہاڑ

عارف محموداوپل

سیّد عثمان حیدر

پاکستان کے طول وعرض، بلندیوں اور پنہائیوں میں ایسی سربستۂ راز دنیائیں آباد ہیں جنہیں پاکستانی کم اور دیارِغیر کے سیاح بخوبی جانتے ہیں اور انہیں کھوجنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ قدرتی حُسن سے مالامال وادیاں جیسے ہنزہ، کاغان، ناران، گلگت، سکردو، چوٹیار، گلیات، بالاکوٹ اور کافرستان سیاحوں کی جنت ہیں۔ ان دلکش وادیوں کے اندر موجود دلکش سرسبز چراگاہیں، خوشبوؤں سے لدی ہوائیں اور مترنم آبشاریں دعوتِ نظارہ دیتی ہیں۔ سدابہار پھولوں سے آراستہ یہ وادیاں معدنی نعمتوں سے بھی مالامال ہیں۔ چند وادیوں کا تذکرہ ذراسی تفصیل کے ساتھ:

وادیٔ بصر

یہ طلمساتی وادیٔ ناران کے رنگ و بو کی آئینہ دار ہے مگر اس کی اپنی ہی دنیا ہے۔ وادیٔ بصر تک پہنچنے کے لئے ناران سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس وادی کا جمال اور جلال اُس وقت دیدنی ہوتا ہے جب اس کے مرغزاروں اور برف پوش کوہساروں میں بسنے والے چیتے، چکور اور تیتر نظر آجاتے ہیں۔ بصر تک پہنچنے کے لئے جیپ پر جانا پڑتا ہے۔ اکثر سیاح اس وادیٔ خوش رنگ سے آگے پیدل سفر کرتے ہیں۔ وادیٔ بصر کے دیدار کی اصل وجہ جھیل دودی پت سر تک پہنچنے کی جستجو ہوتی ہے۔ جھیل کا شفاف نیلگوں اور ٹھنڈا حیات بخش پانی شفا کا حامل ہے۔ یہ جھیل قدرت کے طلسماتی ماحول کی ترجمان ہے۔ اس کے اردگرد ایک سکوت ساطاری رہتا ہے۔

غیرملکی سیاح وادیٔ بصر اور جھیل دودی پت سر پہنچ کر خیمے گاڑ لیتے ہیں۔ یہ جدید مواصلات اور رہن سہن کی دنیا ہے اگر وادیٔ بصر اور جھیل دودی پت سر کے درمیان راستوں کو درست کر کے وہاں ہوٹل قائم کیا جائے تو دنیا سوئٹزر لینڈ کو بھول جائے گی۔ سیاح اس مقام پر قدرت کی بوقلمونیوں، پرندوں کی چہکار اور جھیل کے شفاف ماحول پر باتیں کرتے

رہتے ہیں۔ اس مقام کو جنتِ گم گشتہ سمجھتے اور کئی روز و شب یہاں گزارتے ہیں۔ موسم نظر التفات ہٹاتا ہے تو انہیں مجبوراً واپس ناران جانا پڑتا ہے۔ قیام اور طعام کا بندوبست بہتر کر دیا جائے تو سیاح جوق در جوق وادیٔ بصر اور جھیل دودی پت سر کے کنارے جمے رہیں گے۔

وادیٔ راما

گلیشیئر کی سرزمین تک پہنچنے کے لئے پہلے گلگت اور وہاں سے استور پہنچنا پڑتا ہے۔ عسکری حوالے سے گلگت اور استور پاکستان کے لئے اہم مقامات ہیں مگر سیاحت کے لحاظ سے ان کی عالمی شناخت ہے۔ مئی جون سے ستمبر کے آخر تک استور سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ استور صدیوں پرانا تاریخی مقام ہے۔ کئی طالع آزما اس کے قلعہ پر حملے کرتے رہے ہیں۔

استور میں جنوری، فروری سے ہی کوہ پیماؤں اور سیاحوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ وہ استور میں گھومتے پھرتے اور اس کے سیمابی موسم سے لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن ان کی پُرتجسس فطرت انہیں راما کی جانب کھینچ لیتی ہے۔ راما بظاہر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، مگر یہ گلیشیئر کے علاقے سیاچن اور جھیل منگوسار تک پہنچنے کا داخلی دروازہ بھی ہے۔ راما کی ایک مسحور کن بات یہ ہے کہ اس پر کھڑے ہو کر برف پوش علاقوں کو دیکھا جا سکتا ہے، دوسری اہم بات اس کے اردگرد گلیشیئرز میں بند چھوٹی چھوٹی جھیلیں ہیں۔

استور سے راما تک کا پیدل سفر دو گھنٹوں کا ہے لیکن یہ فاصلہ ماحول کی لطافت کی وجہ سے لمحوں میں گزر جاتا ہے۔ راما کے راستے چراگاہوں، پھولوں اور نادر درختوں کے قطعات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں کے روایتی پودے بھوج پتر کے سفید پھول اپنی بہار دکھا کر سیاحوں کا دل لبھاتے ہیں۔ مقامی لوگوں کے لئے یہ آمدنی کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کی شاخوں سے جھاڑو اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ کئی شوقین سیاح یہ ٹوکریاں ساتھ لے جاتے ہیں اور کئی تو بھوج پتر کی لکڑی سے فرنیچر بھی تیار کرنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، لیکن اس فرنیچر کو ساتھ لے کر جانا دشوار ہوتا ہے۔ راما سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر محکمہ جنگلات کا ریسٹ ہاؤس ہے۔ راولپنڈی اور گلگت پہنچ کر اس کی بکنگ کرائی جا سکتی ہے۔

فیری میڈوز

نانگا پربت اور چلاس جانے والے سیاحوں کے لئے فیری میڈوز جادو بھری وادی ثابت ہوتی ہے۔ نانگا پربت کوہ پیمائی کے لئے عالمی توجہ حاصل کر چکی ہے، لہٰذا چلاس جیسے تاریخی مقام کو جدید ہوٹلوں اور ذرائع مواصلات سے سجایا جا چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ یہ خطہ کوہ پیماؤں کا دیس ہے۔ کوہ پیما رات، بالخصوص چاندنی راتوں میں ہوٹلوں سے باہر نکل آتے اور وادی کے بازاروں میں گھومتے رہتے ہیں۔

مئی، جون سے ستمبر تک کوئی بھی سیاح چلاس پہنچ کر فیری میڈوز سے زیادہ دیر دُور نہیں رہ سکتا۔ یہ ٹریکنگ کا علاقہ ہے، یہاں اس کی مناسب سہولتیں بھی موجود ہیں۔ فیری میڈوز

کو پریوں کی قیام گاہ بھی کہا جاتا ہے۔ سیاح یہاں کے برفیلے ماحول سے لطف اندوز ہو کر اس کی چوٹی کو مسخر کرنا چاہتے ہیں ۔ فیری میڈوز کی اونچائی 3,800 سے 5,500 میٹر تک ہے۔ اس کے آس پاس برفانی چیتے اور ہمالیہ کے دوسرے جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ فیری میڈوز تک پہنچنے کے لئے آغاز چلاس سے کیا جاتا ہے۔ چلاس سے فیری میڈوز کی ٹریکنگ چار دنوں کی ہوتی ہے۔ سیاح ضروری ساز و سامان لے کر گلگت سے ایک سو کلو میٹر تک کا سفر بذریعہ جیپ یا بس طے کرتے ہیں' لیکن اس کے آگے گاڑی لے جانا ممکن نہیں ہوتا۔ کئی سیاح سامان خود اٹھاتے ہیں اور کچھ اس مقصد کے لئے پورٹر کو ساتھ لے جاتے ہیں۔ پورٹرز اور گائیڈ کی رہنمائی میں سیاح ٹالچی اور رائے کوٹ پل پہنچتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب قطعۂ زمین ہے۔ سرسبز اور برف پوش وادیوں کے درمیان جڑا ہوا بنجر سطح مرتفع چلاس اور فیری میڈوز کے حُسن کی قدر کرنے پر اُکساتا ہے۔

رائے کوٹ پل پر پہنچ کر سیاح سستاتے ہیں اور پھر وہاں سے کچھ گھنٹے کی مسافت کے بعد تازہ دم ہو کر وتاتو گاؤں کی جانب چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ رفتار معتدل ہو تو گاؤں سے فیری میڈوز کا سفر چار گھنٹے کا ہے۔ سیاح وتاتو پہنچ کر کیمپنگ اور ٹریکنگ کرتے ہیں اور پھر سے تازہ دم ہو کر فیری میڈوز کی جانب روانہ ہو جاتے ہیں۔ جب ہمالیاتی رنگ و بو کی آئینہ دار پریوں کی وادی فیری میڈوز میں پہنچتے ہیں' تو رشک اور حیرت سے ان کی تھکن اُتر جاتی ہے۔

فیری میڈوز پر قدم رکھتے ہی سارے جہانِ فطرت ہویدا ہو جاتے ہیں۔ ایک جانب نانگا پربت کا پُرشکوہ منظر نظر آتا ہے' جسے دیکھ کر سیاح کا دل چاہتا ہے کہ پریوں کے اس دیس پر کچھ دن ٹھہر جائے لیکن فطرت کا جمال جب آمادۂ جلال ہوتا ہے تو واپس ہو لیتے ہیں۔ سیاح کہتے ہیں کہ فیری میڈوز میں وقت تھم جاتا ہے اور دل میں امنگ جاگ اٹھتی ہے کہ کاش وہ پریاں جنہوں نے فیری میڈوز کو آباد کیا ہے' اک ذرا سی دیر کے لئے سامنے آجائیں۔

وادیٔ کانڈیا

برف پوش وادیٔ کانڈیا کوہستان کا اہم ترین مقام ہے جو سارا سال برف میں ڈھکا رہتا ہے' مگر کوہ پیماؤں کے لئے بھرپور کشش رکھتا ہے۔ دریائے کانڈیا' جو دریائے سندھ کو پانی مہیا کرتا ہے' کے کنارے آباد یہ قصبہ صدیوں پرانی تہذیبوں کو اپنے ہاں بسائے ہوئے ہے۔ یہاں کے لوگوں کی روزی زراعت سے وابستہ ہے' لیکن جب سیاح یہاں کا رخ کرتے ہیں تو ان کے دن پھر جاتے ہیں۔

وادیٔ کانڈیا کا اپنا تمدن ہے جو اس کی تاریخی چٹانی عمارتوں کی تزئین و تعمیر میں پایا جاتا ہے۔ آرٹ کے دلدادہ لوگ بھی اسے دیکھنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں استعمال ہونے والی لکڑی میں ہر زاویہ سے نقش نگاری کی گئی ہے۔

وادیٔ گوپس

گلگت کی سرزمین نے کئی نادر وادیوں کو اپنے دامن میں سمویا ہوا ہے۔ گلگت جانے والوں کے لئے وادیٔ گوپس دلکش نظاروں اور فطری مناظر کی گہما گہمی سے بھری ہوئی ہے۔65 میل میں پھیلے علاقہ میں گیارہ پہاڑی چوٹیاں ہیں۔گلگت سے تقریباً پچاسی کلومیٹر دور تنگ و کشادہ راستوں کے حسین و پُرخطر امتزاج کی حامل یہ وادی زندہ دل لوگوں کی سرزمین ہے۔ وادیٔ گوپس کے اردگرد پھیلی پہاڑی چوٹیوں کی اونچائی اٹھارہ سے بائیس ہزار تک ہے۔

یہ خطہ معدنی ذخائر سے مالامال ہے۔ جب زلزلہ آتا ہے تو اس کی پہاڑیاں سونا بھی اُگل دیتی ہیں۔وادیٔ گوپس جاتے ہوئے کئی اہم پکنک پوائنٹ آتے ہیں۔جو سیاح صرف وادیٔ گوپس کا عزمِ سفر کئے ہوتے ہیں' ان کے لئے دریائے گلگت کے ٹھنڈے اور گہرے پانیوں کی ٹراؤٹ مچھلی خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ سیاح یہاں کچھ دیر کے لئے پڑاؤ ڈالتے' مچھلی کا شکار کرتے اور کھانا کھاتے ہیں۔اس سے کچھ فاصلے پر بدھ مذہب کے پیروکاروں کے علاوہ عام سیاحوں کی دلچسپی کے لئے بدھا کے مجسمے قابلِ دید ہیں۔وادیٔ گوپس میں شینا قوم آباد ہے۔زیادہ تر شینا زبان بولی جاتی ہے' مگر سیاحوں کی آمد ورفت کی وجہ سے انگریزی اور پشتو بھی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ وادیٔ گوپس کا اپنا ثقافتی و تہذیبی تمدن ہے۔یہاں آ کر سیاح دنیا کی فکر سے بے پروا ہو جاتا اور یہاں کے ماحول میں رچ بس جاتا ہے۔یہاں پہنچ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ خطہ مادی زمانے کی کدورتوں سے بالکل محفوظ ہے۔لیکن جو بھی آیا ہے' اسے واپس بھی تو جانا ہے۔

> وادیٔ کانڈیا کے گاؤں سیر شاہی اور گہریال میں سیاحت کے دوران ایک بات کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔یہاں کی خواتین باحیا اور برقع پوش ہوتی ہیں' لہٰذا ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے والے کی شامت آ جاتی ہے۔ وادی میں تین چار شادیاں کرنا مردوں کی شان سمجھا جاتا ہے۔
> (مستنصر حسین تارڑ: آسمان کے قریب)

وادیٔ گریز

آزاد کشمیر کے صدر مقام مظفر آباد سے پچاسی کلومیٹر دُور نیلم ویلی کے مرکزی قصبہ اٹھ مقام اور دریائے نیلم کے مغربی کنارے پر کیرن ریسٹ ہاؤس واقع ہے۔اس سے شمال مشرق میں سطح سمندر سے 6,500 فٹ بلند وادیٔ گریز ایسی منفرد وادی ہے جس کے متعلق لوگوں کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔کنٹرول لائن کے دونوں طرف آباد وادیٔ گریز آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں منقسم ہے۔اٹھ مقام سے تقریباً پچاس کلومیٹر دُور وادیٔ نیلم کی تحصیل شاردا بدھ مت کے دور میں یونیورسٹی کی حیثیت سے افغانستان سے لے کر مشرقِ بعید کے ممالک تک کے طالب علموں کی علمی پیاس بجھاتی تھی۔ یہاں کے آثارِ قدیمہ بدھ مت دور کی کہانیاں سناتے نظر آتے ہیں۔شاردا کے ہیڈ کوارٹر کیل سے وادیٔ گریز کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں

سے محدود تعداد میں جیپیں ملتی ہیں جو سیاحوں کو وادی کے آخری مقام تاؤبٹ تک لے جاتی ہیں۔ راستے میں سرداریؔ نیکروؔ ہلمت اور کریم آباد وغیرہ اہم دیہات آتے ہیں۔ وادی سے بائیں طرف ایک انتہائی دشوار گزار راستہ شونٹر پاس سے گزر کر استور اور گلگت کی طرف جا نکلتا ہے۔ کیل سے آگے وادیٔ گریز میں مکان زیادہ تر لکڑی کے بنے ہوئے ہیں جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بڑی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ تاؤبٹ تک جاتے وقت راستے میں کئی دلفریب جھیلیں اور آبشاریں سیاحوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہیں جن میں ساٹھ فٹ بلند مچل آبشار اور کریم آباد آبشار قابلِ دید ہیں۔ سرداری سے تاؤبٹ تک دس کلومیٹر کا علاقہ اپنے حُسن اور دلکش مناظر کی وجہ سے جنتِ ارضی کہلانے کا صحیح معنوں میں حقدار ہے۔ سرسبز گھنے جنگلات کے درمیان بہتے ہوئے دریائے نیلم کے شفاف پانی کو دیکھتے ہوئے انسان حیران رہ جاتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں دریائے نیلم کا نام دریائے کشن گنگا ہے لیکن آزادی کے بعد آزاد کشمیر میں اس کا نام دریائے نیلم رکھ دیا گیا ہے۔ وادیٔ گریز میں کئی بلند مقامات بھی ہیں۔ ان میں ہرپل ٹاپ؛ نوسر ٹاپ؛ رتی مائی پرمٹ وغیرہ اپنے دلفریب نظاروں کی وجہ سے سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ وادیٔ گریز میں جونؔ جولائی اور اگست کے مہینوں میں رنگ برنگ پھولوں کی اس قدر بہتات ہوتی ہے کہ سیاح وادیٔ دیوسائی کے سبزہ زار اور گلزاروں کو بھول جاتے ہیں۔

اٹھ مقام سے تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر دواریاں کا گھنے جنگلات میں گھِرا ہُوا خوبصورت ریسٹ ہاؤس سیاحوں کو یہاں قیام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

دومیل

یہ خوبصورت وادی منی مرگ سے بائیں طرف تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ سردیوں کے موسم میں برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ یہاں سکی کا کھیل کھیلا جاتا ہے۔ سردیوں کے موسم میں چونکہ وادی کا زیادہ تر حصہ برف سے ڈھکا رہتا ہے۔ لینڈ سلائیڈیں آتی رہتی ہیں۔ وادی کے لوگ جولائی اور اگست کے مہینوں میں پورے دس مہینوں کے لیے ضروریات زندگی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں۔ نومبر کے مہینے میں بیل، یاق وغیرہ ذبح کر کے رکھتے ہیں اور ماہ اپریل تک اس کا گوشت استعمال کرتے ہیں۔

پہاڑ

پاکستان کے بلند و بالا اور باوقار پہاڑ ملکِ عزیز کا بڑا قیمتی خزانہ ہیں۔ یہ ملک کی جغرافیائی سرحدوں کے پہریدار اور محافظ ہیں۔ ان کے شکم میں معدنیات کے خزینے محفوظ ہیں۔ ان کی کوکھ سے جنم لیتے گلیشیئر؛ ندی نالے اور دریا ہمارے کھیتوں کی شادابی اور معیشت کی توانائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ زبانِ حال سے قادرِ مطلق کی بڑائی اور کبریائی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ قدرت کے یہ عظیم شاہکار انسان کو جرأت؛ بلند حوصلوں اور کوششِ پیہم کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان

دلکش و دلفریب پہاڑوں کا نزدیک سے مطالعہ کرنے اور ان کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھانے کی غرض سے جواں ہمت اور نڈر مرد و خواتین مدتوں سے مہم جوئی میں مصروف ہیں اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

سلسلہ ہائے کوہ

پاکستان کو تین سلسلہ ہائے کوہ یعنی قراقُرم، ہمالیہ اور ہندوکُش اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہیں۔ مشرق سے مغرب تک عریض و طویل سلسلہ جو کہ قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکُش پر مشتمل ہے، پاکستان کو چین، افغانستان اور روس سے علیحدہ کرتا ہے۔ ہمالیہ ملک کی شمالی سرحدوں کے شمال اور مشرق کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ قراقرم ہمالیہ کی شمال مغربی جانب سے شروع ہو کر مغرب میں گلگت اور مشرق میں قراقرم کے پاس تک جا پہنچتا ہے۔ ہندوکُش سلسلہ قراقرم کے شمال مغرب میں واقع ہے اور اس کی حدود افغانستان سے جا ملتی ہیں۔ سردیوں میں ان علاقوں کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے پچاس ڈگری تک نیچے گر جاتا ہے۔ دن کو تیز دھوپ برداشت نہیں ہوتی لیکن جونہی سائے ڈھلنے لگتے ہیں، درجہ حرارت تیزی سے گرنے لگتا ہے۔ یہاں پر تیز ہوائیں، جن کی رفتار ایک سو کلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہوسکتی ہے، کوہ پیماؤں اور کوہ نوروں، دونوں کے لئے بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتی ہیں۔

قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکُش صدیوں سے کوہ پیماؤں اور سیاحوں کے لئے کشش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کے زرخیز میدانوں سے لے کر چین اور صحرائے گوبی کی سطح مرتفع تک یہ پہاڑی سلسلے درّوں اور پُر ہیبت گزرگاہوں کے ذریعے راستے فراہم کرتے ہیں۔ چینی بدھوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ان علاقوں کے پہلے سیاح تھے جنہوں نے کالے پہاڑوں (قراقرم)، رسے کے بنے ہوئے پُلوں اور بڑے بڑے گلیشیئرز کا ذکر کیا ہے۔ 390ء میں فاہن نامی سیاح نے سنکیانگ سے برِّصغیر کا سفر درۂ منتکا (4,700 میٹر) کے راستے طے کیا۔ ہن یانگ 630ء میں قراقرم کے پہاڑوں سے گزرتا اس علاقے میں آیا تھا۔ مارکو پولو 1300ء میں وینس سے قبلائی خان کے دربار میں حاضری دینے کی غرض سے اسی علاقے سے گزرا تھا۔ مارکو پولو کی بھیڑ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ ابن بطوطہ چودھویں صدی میں یہاں آیا تھا۔ بعد میں اٹلی اور برطانیہ کے ڈیوک اور شہزادے، یورپ اور امریکہ کے مہم جُو، سائنس دان، سیاح، طالع آزما اور کھلاڑی

- جو دکھ دے اسے چھوڑ دے، جسے چھوڑ دے اُسے دکھ نہ دے
- زیادہ بلندی پر جانے کی خواہش سے پہلے بنیاد مضبوط کر
- پڑوسی کو ستانے والا دوزخی ہے، اگرچہ کتنا ہی عبادت گزار ہو
- حسد اور غرور انسان میں داخل ہوں تو عقل کو باہر کر دیتے ہیں
- محنت کے سمندر کی تہہ کامیابی کے موتیوں سے بھری ہوئی ہے
- بھوکوں کی سازش اور شر بہت بُرے ہوتے ہیں
- خوش کلامی ایسا پھول ہے، جو کبھی نہیں مُرجھاتا
- دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے

—رازیؒ

سیر وسیاحت، کوہ پیمائی، تحقیق اور بعض دفعہ پوشیدہ مقاصد لے کر یہاں آتے رہے ہیں۔

ان علاقوں کی خوبصورتی اور شان وشوکت کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہاں اَن گنت چوٹیاں سات ہزار میٹر سے زیادہ بلند ہیں۔ ساڑھے سات ہزار میٹر سے زیادہ بلند تیس کے قریب پہاڑ موجود ہیں اور آٹھ ہزار میٹر سے بلند دنیا کی کُل چودہ چوٹیوں میں سے پانچ یہاں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ کئی چوٹیاں ایسی بھی ہیں جہاں نہ انسان کا گزر ہُوا ہے اور نہ ہی انہیں کوئی نام دیا گیا ہے۔ یہاں جتنی زیادہ تعداد میں گلیشیئر ہیں، اتنے شاید ہی دنیا میں کہیں اور ہوں۔ یہاں کے بعض درّوں کی بلندی یورپ کے پہاڑوں سے زیادہ ہے۔ 3,700 میٹر بلندی پر واقع وسیع وعریض دیوسائی میدان اسی علاقے میں ہے۔ پھنڈر، کھجورہ، ست پرا کی شفاف، نیلی اور سبز جھیلیں یہاں پائی جاتی ہیں۔ پاکستان اور چین کو ملانے والی شاہراہِ ریشم بھی اسی علاقے میں سے گزرتی ہے۔ تین ہزار کلو میٹر لمبے دریائے سندھ کی گزرگاہ یہیں ہے۔ کافرستان اور بلتستان کی ثقافت، شمشال اور شِگر کی پُراسرار وادیاں بھی یہیں ملیں گی۔ اس طرح پاکستان کے پہاڑوں میں حُسن اور پُراسراریت کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان علاقوں کی کشش ناقابلِ بیان اور ناقابلِ فراموش ہے۔ جو غیر ملکی کوہ پیما اور سیاح ایک دفعہ ان علاقوں میں آتے ہیں، ان میں سے اکثر وبیشتر کی یہ خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ وہ بار بار یہاں آئیں اور فطرت کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوں۔

گلیشیئر

صدیوں کی مسلسل برفباری اور موسمی تغیر وتبدل کے باعث پہاڑی علاقوں میں برف کی موٹی تہیں جم جاتی ہیں۔ پہاڑوں کے دامن سے یہ تہیں آہستہ آہستہ سرکتی جاتی ہیں۔ آس پاس کے علاقے سے ان میں مٹی، پتھر اور معدنیات گھل مل جاتی ہیں۔ اسے برف کے دریا سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ یہ تو دے گلیشیئر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ بوجھ، دباؤ اور اندرونی حرارت کی وجہ سے گلیشیئر کے نچلے حصوں سے برف پگھل کر پانی کی شکل میں رسنے لگتی ہے اور گلیشیئر کے دہانے سے ندی نالے جنم لیتے ہیں۔ گلیشیئر کے اوپر کی سطح تو جیسے طویل وعریض سفید چادر ہو، لیکن اس کے نیچے خطرناک گہری دراڑیں ہیں۔ گلیشیئر کی رفتار عموماً بہت کم ہوتی ہے اور سرسری نگاہ میں اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات یہ اچانک بپھر کر خاصے نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

سیاچین گلیشیئر

بلتستان کے شمال مشرقی کونے میں واقعہ ہے۔ اندرا کولی سے نکل کر جنوب مشرق کی سمت ستّر کلو میٹر دُور جا کر دریائے نوبرا میں جا ملتا ہے۔ اس کے مغربی پہلو میں سیالا، بلافانڈلا، گیانگ لا اور یاسمالا درّے واقع ہیں۔ مقامی زبان میں ''لا'' درّے کو کہتے ہیں۔ اس گلیشیئر کے علاقے میں واقع پہاڑ ریموا، کے 12، شربی کانگری، سلتورو کانگری، تیرم کانگری

وغیرہ پر پچیس برس تک حکومتِ پاکستان کی اجازت سے غیر ملکی کوہ پیما مہمیں جاتی رہی ہیں۔ سیاچن گلیشیئر بلاشبہ پاکستان کا حصہ ہے' لیکن اس کا کچھ حصہ اب بھارت کے غاصبانہ قبضہ میں ہے۔ بھارت کے دُوررس عزائم کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

بلتورو گلیشیئر

قراقرم کے پہاڑوں کے مہم جُو بلتورو گلیشیئر سے بخوبی واقف ہیں' کیونکہ پہاڑوں کے دامن تک پہنچنے کے لیے انہیں اس پر چار پانچ دن چلنا پڑتا ہے۔ اس کی لمبائی ساٹھ کلو میٹر اور چوڑائی پانچ کلو میٹر ہے۔ یہ گلیشیئر کے ٹو سے جنم لیتا ہے اور راستے میں علاقے کے متعدد پہاڑوں سے نکلتے ہوئے گلیشیئر اس میں ملتے جاتے ہیں۔ اس کا دہانہ پیتر و میں جا کر کھلتا ہے اور اس کا پانی آخر کار دریائے شگر میں گرتا ہے۔

جانے پہچانے گلیشیئر

ہس پر اور بیافو گلیشیئر تقریباً ساٹھ کلو میٹر لمبے ہیں۔ یہ دونوں نگر اور اشکولے کے درمیان واقع ہیں۔ وادیٔ ہنزہ میں کریم آباد سے کوئی پچاس کلو میٹر آگے پسو اور بتورہ گلیشیئر پہاڑوں سے نکل کر شاہراہِ ریشم کو آچُھوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مناپن' چھوگولگما' رکھیوٹ گلیشیئر بھی کافی معروف ہیں۔

راستے

متعدد سلسلہ ہائے کوہ تک پہنچنے کے لیے پہلے سکردو' گلگت اور چترال جانا پڑتا ہے' وہاں سے مختلف راستے پہاڑوں کے دامن تک جاتے ہیں۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کوہ پیما اور سیاح جہاز میں جانے کے لیے ہفتہ دس دن تک چک لالہ کے ہوائی اڈہ پر موافق موسم کا انتظار کیا کرتے تھے اور اکثر اوقات ایسی ہی دشواری شمالی علاقوں سے واپسی پر بھی پیش آتی۔ موسم پر کسی کو اختیار نہ تھا اور متبادل اور تسلی بخش ذرائع بھی میسر نہ تھے۔ اب حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ اسلام آباد سے اگر ہوائی جہاز کے ذریعے سکردو اور گلگت جانا مشکل ہو تو لوگ بسوں اور ویگنوں میں سفر کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ راولپنڈی' اسلام آباد سے سکردو کا فاصلہ 760 کلو میٹر اور گلگت کا 630 کلو میٹر ہے۔ یہاں سے ایبٹ آباد' مانسہرہ' تھاکوٹ' پتن' چلاس اور جگلوٹ فارم تک شاہراہِ ریشم پر گلگت اور سکردو کے راستے ایک ہی ہیں' لیکن سکردو جانے کے لیے جگلوٹ فارم کے نزدیک دریائے سندھ کو پل کے ذریعے عبور کرتے ہیں اور پھر اسی دریا کے ساتھ ساتھ ہی یہ سڑک سکردو تک لے جاتی ہے۔ ستا گاچو'

شاہراہِ ریشم کی تعمیر کے دوران پانچ سو پاکستانی اور چینی انجینئروں اور محنت کاروں نے جان کی قربانی دی۔ گلگت سے چند کلو میٹر دُور دینور میں چینی و فاشعاروں اور کریم آباد میں گنیش پُل کے پاس پاکستانی مجاہدوں کی یادگار نصب ہے۔ اس شاہراہ کی بنیادوں میں شامل چینی اور پاکستانی محنت کاروں کا خون دونوں ممالک کے مابین اخوت و بھائی چارے کا جذبہ قائم رکھنے کا ضامن ہے جو اِن شاءاللہ تعالیٰ تا ابد قائم رہے گا۔

(میجر جنرل سید شفقات احمد: شاہراہِ ریشم' اُردو ڈائجسٹ)

دھمبو داس' کت زارا راستے کی چند آبادیاں ہیں۔ یہ سڑک کھجورہ جھیل اور سکردو کے ہوائی اڈے کے پاس سے گزرتی بلتستان کے صدر مقام سکردو جا پہنچتی ہے۔ یہ سڑک بھی آرمی انجینئرز کی بے لوث خدمت اور شب و روز محنت کی نشانی ہے۔ بس اور ویگن اچھی حالت میں ہوں اور ڈرائیور تجربہ کار ہو تو اسلام آباد سے سکردو' گلگت کا سفر سولہ تا اٹھارہ گھنٹے میں طے کیا جاسکتا ہے۔ کوہ پیما اور سیاح اب سڑک کا سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان سڑکوں پر چھوٹے چھوٹے ریسٹورنٹ' پٹرول پمپ اور رہائش گاہیں بن گئی ہیں۔ اس سمت میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاکہ سیاحوں کا سفر آرام دہ ہو۔

شاہراہِ ریشم

شاہراہِ ریشم یا قراقرم ہائی وے (کے کے ایچ) انجینئرنگ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ یہ شاہراہ' قراقرم اور ہمالیہ کے دشوار گزار پہاڑوں سے گزرتی ہے۔ اسلام آباد سے درۂ خنجراب (4,703 میٹر) تک اس شاہرہ کی لمبائی 850 کلومیٹر ہے۔ اس سڑک کی تعمیر کا ابتدائی کام 1958ء میں آرمی انجینئرز نے وادیٔ سندھ روڈ کی شکل میں اپنے ذمہ لیا تاکہ دُور دراز علاقوں میں رہنے والوں کو سفر کی بنیادی سہولتیں میسر آسکیں۔ 1968ء میں بے مثال ہمسایہ اور دوست' عوامی جمہوریہ چین نے اس کٹھن کام میں پاکستان کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ 1978ء میں تھاکوٹ کے پل کے افتتاح سے یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

شاہراہِ ریشم حویلیاں' ایبٹ آباد' مانسہرہ' تھاکوٹ' بشام' پٹن' گلگت' ہنزہ' پسو' سست سے ہوتی ہوئی درۂ خنجراب پر جا ختم ہوتی ہے۔ راولپنڈی سے گلگت کا درمیانی فاصلہ 630 کلومیٹر ہے جو کہ ایک دن میں طے کیا جاسکتا ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر کے بعد کاشغر (سنکیانگ) اور کراچی کا درمیانی فاصلہ 3,400 کلومیٹر ہے اور کاشغر سے شنگھائی کی بندرگاہ 5,700 کلو میٹر دُور پڑتی ہے۔ اس شاہراہ کی تعمیر میں جغرافیائی حالات' ناموافق موسم اور سامان و مشینری کو لانے لے جانے کی دشواریاں انجینئروں کے لئے بڑا چیلنج تھیں۔ آرمی انجینئرز نے بے مثال دلیری' انتہائی ذہانت' بے پناہ محنت و لگن اور شاندار پیشہ ورانہ مہارت کو کام میں لا کر مشکلات کو شکست دی اور انہونی کو رواں دواں سڑک بنا کر دنیا کا آٹھواں عجوبہ تخلیق کر دکھایا۔ انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد پاکستان اور چین کے درمیان ریل رابطے کی صورت میں نواں عجوبہ بھی ظاہر ہونے کو ہے۔ یہ افتخار بھی چینی بھائیوں اور پاک فوج کے انجینئروں کے حصے میں آئے گا۔ علامہ اقبالؒ نے انہی بہادروں کے لئے برسوں پہلے کہہ دیا تھا:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

حوالہ جات

1۔ میجر جنرل قمر علی مرزا' ہمارے پہاڑ
2۔ جمال حیدر صدیقی' قدرت کا انعام
3۔ ڈاکٹر محمد منیر مرزا' دل فریب نگری

گوشۂ ادب

ادب کیا ہے؟

ادب کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جیسے پوچھا جائے کہ زندگی کیا ہے؟ ادب زندگی کا ترجمان ہے۔ نامور عرب سکالر اور ادیب خلیل جبران نے کہا تھا کہ مَیں کبھی لاجواب نہیں ہوا' مگر اس شخص کے سامنے جس نے پوچھا تھا کہ تم کون ہو؟ سوال کی حیثیت ہمیشہ قائم رہتی ہے' جواب بدلتے رہتے ہیں۔ ''ادب کیا ہے''؟ کے جواب میں اُردو اور انگریزی ادب کے کئی اساتذہ' دانش وروں اور نقادوں نے بہت کچھ بتایا اور سمجھایا' مگر یہ سوال ابھی تک قائم ہے کہ ''ادب کیا ہے''؟ ڈاکٹر جمیل جالبی بہت بڑے نقاد ہیں۔ انہوں نے کئی ادبی مسائل پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ علمی ذوق وشوق رکھنے والے قارئین' بالخصوص ادب کے طالب علموں کے استفادے کے لئے ہم نے جالبی صاحب سے پوچھا کہ ادب کیا ہے؟ سوال اردو میں ہے' ظاہر ہے جواب بھی اُردو میں آیا — البتہ ہر زبان کے ادب دوست' نکتہ رس اور طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں گے (ایڈیٹر)

ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ و فکر بھی شامل ہوتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعے جذبے' احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ اس تعریف کے مطابق کم و بیش ہر وہ بات جس سے کسی جذبے' احساس یا فکر کا اظہار ہوتا ہے اور جو منہ یا قلم سے نکلے' ادب کہلائے گی _ لیکن میری طرح آپ بھی یہ جانتے ہیں کہ ہر وہ بات جو منہ سے نکلتی ہے یا ہر وہ بات جو قلم سے ادا ہوتی ہے' ادب نہیں ہے۔ عام طور پر اخبار کے کالم یا اداریئے ادب نہیں کہلاتے حالانکہ ان میں الفاظ بھی ہوتے ہیں اور اثر و تاثیر کی قوت بھی ہوتی ہے۔ ہم سب خط لکھتے ہیں' لیکن ہمارے خطوط ادب کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس کے برخلاف غالب کے خطوط ادب کے ذیل میں آتے ہیں۔ غالب اور عام لوگوں کے خطوط کے فرق کو دیکھتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسی تحریر کو ادب کہا جا سکتا ہے جس میں الفاظ اس ترتیب و تنظیم سے استعمال کیے گئے ہوں کہ پڑھنے والا اس تحریر سے لطف اندوز ہو اور اس کے معنی سے مَسَرت حاصل کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب لفظ و معنی اس طور پر گھل مل گئے ہوں کہ ان میں ''رس'' پیدا ہو گیا ہو۔

یہی رس کسی تحریر کو ادب بناتا ہے۔اس مَسرَت کا تعلق ہمارے باطن میں چھپے ہوئے اس احساس سے ہوگا جس کو اس تحریر میں پا کر ہم مَسرَت محسوس کر رہے ہیں اور اس معنی سے بھی ہوگا جس کا ہمیں ادراک ہُوا ہے۔ یہ وہ تحریر ہوگی جس نے ہمارے شعور اور ہمارے تجربوں کے خزانے میں اضافہ کیا ہے اور ہمیں اَن دیکھے تجربات سے یوں مانوس کر دیا ہے کہ وہ تجربے ہمارے اپنے تجربے بن گئے ہیں۔ یہ وہ تحریر ہوگی جس کا اثر وقتی اثر کا حامل نہیں ہوگا بلکہ اس میں اَبَدیت ہوگی اور جو زمان ومکان سے آزاد ہو کر آفاقیت کی حامل ہوگی۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے مثنوی مولانا روم' دیوانِ حافظ' کلامِ غالب' اشعارِ میر' تخلیقاتِ شیکسپیئر اور مکالماتِ افلاطون ہمیں آج بھی متاثر کرتے ہیں اور ہمارے تجربات وشعور میں' احساسِ مَسرَت کے ساتھ' اضافہ کرتے ہیں۔ جس تحریر میں بیک وقت یہ سب خصوصیات موجود ہوں گی' وہ تحریر ادب کہلائے گی اور جس تحریر میں جتنی زیادہ یہ خصوصیات ہوں گی' وہ تحریر اسی اعتبار سے عظیم ادب کے ذیل میں آئے گی۔

ادب کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ادب زندگی میں کسی چیز کا ''بدل'' نہیں ہے اور اگر اس کی حیثیت کسی اور چیز کے بدل کی ہے تو پھر وہ ادب نہیں ہے۔ ادب ایسا اظہار ہے جو زندگی کا شعور اور ادراک حاصل کرنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخیّلی تجربے کو ابھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ادب میں متحرک کرنے اور روح میں موجود خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی غیر معمولی قوت ہوتی ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ یہ ادب کا خاص منصب ہے۔ ادیب ایک ایسا انسان ہے جس میں ادراک کی صلاحیت بھی ہوتی ہے اور اس کے اظہار میں اتنی داخلی وخارجی وسعت اور تہ داری ہوتی ہے کہ ادب انفرادی وذاتی ہوتے ہوئے بھی آفاقی ہوتا ہے۔ جتنا بڑا ادیب ہوگا' اس کے تجربے کا تنوع' اس کا شعور وادراک اور اس کا اظہار اتنا ہی بڑا اور آفاقی ہوگا۔

ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربوں میں شریک ہوجاتے ہیں' اسی لیے ادب کی سطح پر ہم اپنی ذات سے بلند ہوجاتے ہیں۔ عمل اور ادراک کی غیر معمولی قوت کے ذریعے ادب ہماری عام ہستی کو بیدار کر کے شعور کی ایسی سطح پر لے آتا ہے جو اس کے بغیر خفتہ رہتی۔ اگر ادب نہ ہوتا اور سعدی' میر' غالب' حافظ' اقبال' شیکسپیئر' گوئٹے' دانتے وغیرہ نہ ہوتے تو انسان آج بھی معصوم بچے کی طرح ہوتا۔ ادب کے ذریعے ہی ہم بلوغت کے درجے پر آئے ہیں۔ زندگی بسر کرتے ہوئے ہم پر بہت سے جذبے گزرتے ہیں' بہت سے ادھورے معنی ہمارے ذہن میں ابھرتے ہیں' نامعلوم احساس سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے' ہم میں بغاوت کا میلان پیدا ہوتا ہے' لیکن یہ سب ہمارے لیے گونگے اور بے نام ہوتے ہیں اور یونہی گزر جاتے ہیں لیکن جب ان سے ہمارا واسطہ ناول' افسانے' شاعری' ڈرامے

یا مضمون میں لفظوں کی حسیں، پُر رس اور جاندار ترتیب و تنظیم کے ساتھ پڑتا ہے، تو ہم ان کا ادراک حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ جذبے، یہ احساس، یہ میلان، یہ تجربے ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس طرح ہم زندگی میں نئے معنی تلاش کر لیتے ہیں۔

ادب زندگی میں نئے معنی تلاش کرنے کا نام ہے اور اسی لیے ادب زندگی کے شعور کا نام ہے۔ اسی شعور کے ذریعے ہم بدلتے ہیں۔ ہم وہ نہیں رہتے جو اس وقت ہیں اور اسی سے ہمارے اندر قوتِ عمل پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے ایسے تجربے جن سے ہمیں واسطہ نہیں پڑا، ادب کے ذریعے براہِ راست ہمارے تجربے بن جاتے ہیں اور ہمیں اور ہمارے اندازِ فکر کو بدل دیتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ادب کے ذریعے ہم دوسروں کے تجربوں میں اس طور پر شریک ہو جاتے ہیں کہ وہ ہمارے تجربے بن جاتے ہیں، تو شاید یہ بات آپ کو پُر اسرار سی معلوم ہو لیکن اسے ایک مثال سے یوں سمجھیئے کہ اپنی محبوبہ کو رقابت یا حسد کی شدت کے زیرِ اثر قتل کرنے کا تجربہ ہمارے لیے حاصل کرنا آسان نہیں ہے، لیکن شیکسپیئر کے اوتھیلو کے ساتھ شریک ہو کر یہ تجربہ ہمارا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح لیڈی میکبتھ کا تجربہ میرا اپنا تجربہ بن جاتا ہے۔ فاؤسٹ کو پڑھ کر گوئٹے کے اور اسی طرح اینا کرینینا پڑھ کر ٹالسٹائی کے تجربات میرے تجربات بن جاتے ہیں۔ مولانا روم کی مثنوی اور گلستان و بوستاں کے تجربے میرے اپنے تجربات بن جاتے ہیں۔ ادب کا یہی کام ہے۔

> کئی سائنس زدہ لوگ جب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آخر ادب کی اہمیت و ضرورت ہی کیا ہے، تو اُن کے باطن میں چھپے ہوئے اس چور سے آمنا سامنا ہوتا ہے، جو اُنہیں سائنس کے زیرِ اثر ادب میں خالص افادیت کی تلاش پر اُکسا رہا ہوتا ہے۔ یہ سوال وہ اِس لیے پوچھتے ہیں کہ اُن کی چھپی ہوئی خواہش ہوتی ہے کہ ادب بھی وہی کام کرے جو کمرہ ٹھنڈا کر کے ائیر کنڈیشنر کرتا، پانی کو ٹھنڈا کر کے ریفریجریٹر کرتا یا جو کپڑوں کی شکنیں دُور کر کے استری کرتی ہے۔ چونکہ ادب اُن کی اس خواہش کو پورا نہیں کرتا، اس لیے کہ یہ ادب کا منصب نہیں ہے، تو وہ ادب کی بنیادی اہمیت ہی سے منکر ہو جاتے ہیں...
>
> (ڈاکٹر سید عبداللہ: سائنس دان نقاد)

اب آپ یہاں یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ آخر کیا ان تجربات کا ادراک کیے بغیر ہم زندگی نہیں گزار سکتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً گزار سکتے ہیں لیکن یہ زندگی حیوانی سطح پر بسر ہوگی۔ اگر ہم زندگی کو صرف اپنے تجربات تک محدود کر لیں تو زندگی اندھا کنواں بن کر رہ جائے اور عین ممکن ہے کہ ہمارے تجربات کوئی خطرناک صورت اختیار کر لیں اور ہمارے اندر ایک ایسا عدم توازن پیدا ہو جائے جو زندگی کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے مثبت راستے سے ہٹا دے۔ ادب کے ذریعے جب دوسروں کے بے شمار چھوٹے بڑے تجربے ہمارے شعور اور ادراک کا حصہ بنتے ہیں تو نہ صرف ہمارا تزکیہ (کیتھارسس) ہو جاتا ہے بلکہ اس سے زندگی کا توازن بھی درست رہتا ہے۔ عام تجربہ گونگا ہوتا ہے۔ ادیب اسے زبان دے کر نہ صرف ہمیں

اس کا ادراک کرا دیتا ہے بلکہ ہمارے باطن کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ ہم نے اکثر یہ کہتے سنا ہے کہ یہ بات حقیقت نہیں، محض شاعری یا افسانہ ہے۔ کہنے والا جب یہ بات کہتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ شاعری اور افسانہ دراصل جھوٹ ہوتے ہیں، لیکن اگر تجربے کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس ''بظاہر'' جھوٹ میں انسانی تجربے کی وہ سچائی چھپی ہوتی ہے جو ہمیں نیا شعور عطا کرتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ ادب ایسا جھوٹ ہے جو ہمیں سچائی کا نیا شعور عطا کرتا ہے اور اسی لیے اب تک انسان اور انسانی معاشرہ زندہ اور باقی ہے۔ ہوا کی طرح ادب کی ضرورت بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ ادب آزادی کی روح کا اظہار ہے۔ ادب سچائی کی تلاش کا مؤثر ذریعہ ہے۔ لفظ چونکہ ہر دوسرے میڈیم سے زیادہ طاقتور چیز ہے، اسی لئے ادب دوسرے فنونِ لطیفہ سے زیادہ مؤثر چیز ہے۔

آج کی جدید زندگی میں سائنس پر غیر معمولی زور ہے۔ سائنس نے اشیاء کو تو ہمارے شعور میں داخل کر دیا ہے، لیکن فکر و احساس کو زندگی سے نکال باہر کیا ہے۔ اسی وجہ سے اس وقت ساری دنیا ایک ہولناک عدم توازن کا شکار ہے۔ زندگی ساری ترقیوں اور حیرت ناک ایجادات و انکشافات کے باوجود معنویت و توازن سے عاری ہوگئی ہے۔ اسی لیے ساری دنیا اس وقت ایک ایسے نظامِ خیال اور تصورِ حقیقت کی تلاش میں ہے جس سے انسان اپنے وجود کو بامعنی بنا سکے۔ یہ کام ادب کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ ادب ایک طرف ہمیں مَسرّت بہم پہنچاتا ہے، احساسِ جمال سے لطف اندوز کرتا ہے، دوسروں کے تجربات سے ہمارا تزکیہ یا کیتھارسس کرتا ہے اور دوسری طرف لفظوں کی جمالیاتی ترتیب سے احساس، جذبے یا خیال کو غیر ضروری عناصر سے پاک کر کے اس طور پر سامنے لاتا ہے کہ ہم اسے پڑھتے ہوئے غیر معمولی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ادب جن دنیاؤں میں ہمیں لے جاتا ہے، وہ حقیقی دنیا سے زیادہ حقیقی ہوتی ہیں۔ پروست نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہماری اصل زندگی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ اسے ہمارے سامنے لے آئے اور اس طرح ہمیں خود ہم سے واقف کرا دے۔ غالب، سرسید، حالی اور اقبال نے اپنی تحریروں سے ہمیں خود ہم سے واقف کرا کر اس طور پر بدلا ہے کہ ہم نے گویا نیا جنم لیا ہے۔ ادب یہی کام کرتا ہے اور یہی اس کا منصب ہے۔

ادب کا حوالہ خود زندگی ہے اور وہ اسے ہی آگے بڑھاتا ہے۔ ادب تو انسانی تجربے کے مکمل علم و آگاہی کا نام ہے اور یہ علم و آگاہی وہ غیر معمولی مرتّب و منظّم صلاحیت ہے جس کے اظہار کی صلاحیت صرف باشعور و دردمند انسان کے پاس ہے۔ وہ انسان جو نہ صرف اس کے اظہار پر قدرت رکھتا ہے بلکہ جس کا اظہار سچا بھی ہے اور حسین بھی، مکمل بھی ہے اور مؤثر و مثبت بھی۔ اس لئے ادب تنقیدِ حیات ہے اور زندگی کے گہرے پانیوں میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کا نام۔

غالب اور قبولِ عام

کلامِ غالب اُردو ادب کا ہمہ پہلو اور جاندار اثاثہ ہے۔اس میں فلسفہ کے پیچیدہ نکات کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو رمز و کنایہ کے حسین پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جو قاری کے تخیّل کو جِلا بخش کر دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ غالب اپنی تشبیہات، الفاظ و تراکیب اور فصاحت و بلاغت کے ذریعے دو مصرعوں کی چھوٹی سی دنیا میں جہانِ معنی آباد کر دیتا ہے۔علامہ اقبالؒ کا یہ شعر غالب کے اسی فن کا اعتراف و اظہار ہے:

نُطق کو سَو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رَفعتِ پرواز پر

غالب کا شمار رومانی شعراء میں ہوتا ہے، مگر اس کی فنکارانہ عظمت معمولی واردات میں کوئی نہ کوئی نرالا نکتہ پیدا کر کے اسے عام فہم اور دل نشیں بنا دیتی ہے۔ بظاہر مشکل پسند اور خواص کے شاعر غالب کا کمال یہ ہے کہ اس کے بے شمار اشعار اور مصرعے زباں زدِ عام ہیں۔قارئین کے ذوق کی تسکین کے لئے چند ایسے ہی اشعار پیشِ خدمت ہیں (ایڈیٹر)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مئے و نغمہ کو اندوہِ ربا کہتے ہیں

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اِس گھر میں لگی ایسی کی جو تھا جل گیا

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میّسر نہیں انساں ہونا

بوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہُوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہُوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل
کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

نے گُلِ نغمہ ہُوں نہ پردۂ ساز
مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دَورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سب کہاں کچھ لالہ وگُل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیاصورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

واں گیا بھی مَیں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

قیدِ حیات و بَندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا' کیجئے ہائے ہائے کیوں

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے

ہر اِک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تُو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہُوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

مَیں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنیٰ نہ سہی

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مِرا جامِ سفال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مِرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مِرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مِرے پیچھے ہے، کلیسا مِرے آگے

بگ رہا ہُوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کیا کِیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مِرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خُلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالب بُرا نہ مان، جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مِری زباں کے لئے

سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

صادق ہُوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہُوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اُردو لشکری زبان ہے جسے بنانے یا ترتیب دینے والوں میں مختلف زبانیں بولنے والے' کئی تہذیبوں کے لوگ شامل تھے' اس لئے اسے لہجے اور تلفظ کے حوالے سے مشکلات کا سامنا ہے۔ مانا کہ اردو کے علاوہ کسی اور زبان میں تلفظ کے اتنے مسائل نہیں ہیں' لیکن اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ خیال رکھا جائے کہ تلفّظ کی خرابی سے معانی و مطالب میں رخنہ پیدا نہ ہو' تاکہ یہ زبان سادگی اور آسانی کی ترجمان ہو اور لوگوں کے لئے کسی طرح کی الجھن پیدا نہ کرے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ الفاظ کا غلَط تلفظ' بولنے والے کی شخصیت کو بُری طرح مجروح کرتا ہے۔ ان صفحات پر اِعراب اور تلفّظ کی نشاندہی یا درستی کا اہتمام فقط اردو کے جلال و جمال کے تحفّظ کے لئے کیا گیا ہے۔ اس اہتمام کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے اُردو کی خامی قرار دینا یا سمجھنا علمی فعل نہ ہوگا۔ انگریزی جیسی زبان میں بھی انہی مسائل کا سامنا ہے۔ لندن کے عوام الناس بھی مکمل انگریزی دان نہیں' انہیں انگریزی زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ گزشتہ صدی میں انگریزی کے ایک مشہور استاد اور ماہرِ لسانیات پروفیسر میکس بیربوم جنہیں انگریزی زبان و ادب کے حلقوں میں MBB کہا جاتا ہے' بغل میں ڈکشنری دبائے گھومتے نظر آتے تھے۔ جو کوئی' جہاں بھی غلَط انگریزی بولتا سنائی دیتا' پروفیسر بروم پہلے تو اس کو سمجھاتے' پھر نہ ماننے والے کے سامنے ڈکشنری کھول کر رکھ دیتے کہ بھائی! (یا بہن) ڈکشنری کے مطابق اپنی انگریزی درست کرلو۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے معروف استاد پروفیسر جیلانی کامران کو انگریزی' اردو اور فارسی پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ وہ اپنی انگریزی زبان و ادب کی ہر نئی کلاس کے طلبہ اور کالج میں انگریزی' اردو' فارسی شعر و ادب کی ترویج کے لئے متحرک مجالس کے شرکاء کو اپنے دل آویز اندازِ بیاں میں انگریزی اور اردو تلفّظ کی اہمیت بتاتے اور پھر انگریز

دانشور پروفیسر ایلین پٹرک ہربرٹ کا مضمون "Invitation to the Word War" پڑھنے کو دیتے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ غلَط زبان اور الفاظ بولنے یا لکھنے والوں کی حوصلہ شکنی ہر پڑھے لکھے فرد کا فرضِ اولیں ہے۔ ہم بھی پروفیسر جیلانی کامران اور پروفیسر ایلین پٹرک ہربرٹ کا مشورہ اردو لکھنے اور بولنے والوں کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کریں گے کہ وہ غلَط اردو بولنے والوں کی رہنمائی کریں کیونکہ زبان سیکھنا، بولنا اور لکھنا مشقّت طلب کام ہے—خاص طور پر اردو زبان۔ بقول استاد داغ دہلوی:

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے (ایڈیٹر)

ابلاغ	اِبْ لَا غ	پہنچانا، جیسے ذرائع ابلاغ	ازالہ	اِزَالَ ہ	توڑ، خاتمہ
اتمام	اِتْ مَ ام	پورا کرنا، جیسے اِتمامِ حُجت	ازدواج	اِزْ دِوَاج	بیاہ، شادی
احتساب	اِحْ تِ سَاب	حساب طلبی	اسلحہ	اَسْ لِ حَ ہ	ہتھیار۔ واحد سلاح
اخراجات	اِخْ رَاجَ ات	مصارف، ادائیگیاں	اعراب	اِعْ رَاب	زیر، زبر، پیش لگانا
ادبیات	اَدَبِ یْ یَ ات	نظم و نثر	اسلوب	اُسْ لُ وْ ب	طور، انداز
ادعیہ	اَدْ عِ یَہْ	دعائیں	اصول	اُصُ ول	قائدہ، ضابطہ
اتصال	اِتِّ صْ ال	ملنے کی جگہ، جُڑا ہُوا	افاقہ	اِفَ اق ہ	مرض میں کمی
استحصال	اِسْ تِ حْ صَ الْ	خدمات یا املاک کا جبری اور ناجائز فائدہ اٹھانا	افطار	اِفْ طَ ار	روزہ کھولنا
			اقلیم	اِقْ لِ یْ م	مِلک، ولایت
استیصال	اِسْ تِ یْ صْ ال	جڑ سے اُکھاڑنا	امارات	اِمَ ارَات	سلطنت، ریاست (امارت کی جمع)
انجمن	اَنْ جُ مَنْ	مجلس یا ادارہ	اکسیر	اِکْ سِ یْ ر	امرت انتہائی پُرتاثیر
انحصار	اِنْ حِ صَ ارْ	دارومدار	ایوان	اَیْ وَان	ہال
انخلاء	اِنْ خِ لَ اءْ	خالی کرنا	آیت	آ یَ ت	نشانی، آسمانی کتب کی عبارت
ارجمند	اَرْ جَ مَنْ د	قیمتی، اعلیٰ	باحسن وجوہ	بِ اَحْ سَ نِ وُ جُ وْ ہ	نہایت عمدگی سے
ارسال	اِرْ سَ ال	بھیجنا	بحیرہ	بَ حَ یْ رَہ	سَمُندر (بَحر کی تصغیر)

بھنک	بَھ نَ ک	سرسری آواز
بیالیس	بَیا لیس	42
پچاسی	پَ چ اسِ ی	85
پچانوے	پِ چ انْ وے	95
پرخچے	پَ رْ خَ چِ ے	پرزے، ٹکڑے
ترجمہ	تَ رْ جَ مَ ہ	ایک زبان سے دوسری زبان میں ڈھالنا، صفت مترجم (مُ تَ رْ جِ م)
تلاوت	تِ لَ اوَ تْ	آواز سے (خصوصاً) قرآن مجید پڑھنا
تندرستی	تَ نْ دُ رُسْ تِ ی	صحت مندی
توجہ	تَ وَ جْ جُ ہ	دھیان، صف متوجّہ (مُ تَ وَجْ جِ ہْ)
توقع	تَ وَقْ قُ ع	اُمّید
تہلکہ	تَ ہَ لْ کَ ہ	(بروزنِ محل کا) ہلچل
تہیہ	تَ ہِ یْ یَ ہ	پکّا اِرادہ
ثبوت	ثُ بُ وْ ت	دلیل
جبلت	جِ بِ لْ لَ تْ	فطرت، سرشت
جلاوطنی	جَ لَ اوَ طْ نِ ی	دیس نکالا
جمادی الاخرہ	جُ م َادَلْ آ خِ رَہ	ہجری سال کا چھٹا مہینہ
جوارِ رحمت	جِ وَارِ رَحْ مَ ت	رحمت کی ہمسائیگی
جہالت	جَ ہَ الَ تْ	علم سے محرومی

[ابوجہل	اَ بُ وْ جَ ہ ل	جاہلوں کا باپ]
جہنم	جَ ہَ نْ نَ م	دوزخ
حبس	حَ بْ س	گھٹن (حَ بَ س غلط ہے)
حلف	حَ لَ ف	قسم کھانا
حضور	حُ ضُ وْ ر	حاضری، کلمۂ خطاب
خاصا	خَ اصْ اُ	اچھا خاصا
خاصہ	خَ اصّ ہ	نمایاں خصوصیت
خضراء	خَ ضْ رَاء	سبز
خلف	خَ لَ ف	بیٹا
خلط	خَ لَ ط	گڈمڈ، مِلا جُلا، (اسی طرح خَلَط مَلَط)
خودکشی	خُ وْدُ کُ شْ شِ ی	اپنے آپ کو قتل کر دینا
خودکُش	خُ ود کُ ش	خود کو قتل کرنے والا
درود	دُ رُ وْ د	سلام وصلٰوۃ برنبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
دیت	دِ یَ ت	خون بہا
ذوالفقار	ذُ ولْ فَ قَ ارُ	حضرت علیؓ کی ایک تلوار
ذبح	ذَ بَ حُ	حلال کرنا
ذبح	ذِ بَ ح	حلال کیا گیا جانور
رضا	رِضَ ا	تسلیم، اجازت
رطوبت	رَ طُ وْ بَ ت	نمی
رجعت پسند	رَ جْ عَ تْ	قدامت پسند
رقم	رَ قَ م	نقدی (جمع رُقُوم)

زاویہ	زَاوِی ہ	کونا
زراعت	زِرَاعَ ت	کھیتی باڑی
زعم	زَعْ م	گھُمنڈ
سہم	سَ ہ م	خوف
سیاحت	سِ یَ احَ ت	سیروتفریح
سدھارنا	سُ دَھارْ نَ ا	اصلاح کرنا
سِدھارنا	سِ دَھارْ نا	روانہ کرنا یا روانہ ہونا
شعار	شِ عَ ار	چلن، طورطریقہ (مثلاً کِفایت شِعار)
شمولیت	شُ مُ وْ لِ یْ یَ ت	شِرکت
طراز	طِ رَ از	مثلاً داستان طِرازی
طمطراق	طُ م طُ رَ اق	سج دھج
عنصر	عُ نْ صُ ر	اصلی جُزو جمع عناصر
عرض	عَ رْض	چوڑائی۔ درخواست (کچھ عَرض کروں)
علانیہ	عَ لَ ن یَ ہ	کھُلم کھُلا
عیوب	عُ یُ وْ بُ	نقائص، واحد عیب
غرض	غَ رَض	مقصد، مدعا
غلط	غَ لَ طْ	جو درست نہ ہو
غلغلہ	غَ لْ غُ لَ ہ	شور، ہلّا گلّا
غلط فہمی	غَ لَ طْ فَ ہْ مِ ی	کچھ کا کچھ سمجھنا
غیض	غَ یْ ض	کچا بچہ
غیظ	غَ یْ ظ	غصہ، غضب

فرار	فَ رْ رَار	تیز دوڑنے والا
فرار	فِ رَار	بھاگ جانا، گریز کرنا
فہم	فَ ہْ م	شعور، سُوجھ بُوجھ
قطعہ	قِ طْ عَ ہ	ٹکڑا، پارہ
قرأت	قِ رَأت	پڑھنا
قماش	قُ مَ اش	وضع، ڈھنگ، ریشمی کپڑا
قصور	قُ صُ وْر	جُرم، خطا
قوس قزح	قَ وسِ قُ زَح	بارش کے بعد آسمان پر نظر آنے والی رنگارنگ کمان
قندیل	قِ نْ دِ یْ ل	فانوس
قہقہہ	قَ ہْ قَ ہَ ہ	زور کی ہنسی
قہر	قَ ہْ ر	شدید غصہ
کان کن	کان کَن	کان کھودنے والا، اسی طرح گورکَن
کھلانا	کھِ لانا	کھانا کھلانا
کھیلانا	کھے لانا	کسی (خصوصاً بچوں) کے ساتھ کھیلنا
لاحق	لَ احِ ق	عارض، لاگو
مبارک	مُ بَ ارَ ک	سازگار، باعثِ برکت
مثبت	مُ ثْ بَ ت	محکم، موافق
مثبت	مُ ثْ بِ ت	ثابت، قائم کرنے والا
مَثل	مَ ثَ ل	کہاوت، مثال (ضربُ المَثَل)
مِثل	مِ ثْل	بدل، نمونہ

مجسمہ	مُ جَ سْ سَ مَ ہ	مصنوعی پیکر
مصنف	مُ صَ نْ نِ ف	کتاب لکھنے والا
مصنّفہ	مُ صَ نْ نَ فَ ہ	تصنیف کردہ
مجلّہ	مَ جَ لْ لَ ہ	علمی ادبی جریدہ
محکمہ	مَ حْ کَ مَ ہ	انتظامی صیغہ
محولہ	مُ حَ وَّ لَ ہ	جس کا حوالہ دیا گیا
محلّہ	مَ حَ لہ	شہر کا حصّہ
محل	مَ حَ ل	بڑی عمارت‘ موقعہ
محفل	مَ حْ فِ ل	اجتماع
مخیّر	مُ خَ یْ یِ ر	بھلائی کرنے والا
مرض	مَ رَض	بیماری
مسافت	مَ سَ افَ ت	دُوری‘ فاصلہ
مسرت	مَ سَ رْ رَ ت	خوشی
منحصر	مُ نْ حَ صِ ر	مبنی‘ موقوف
معذرت	م عْ ذِ رَ ت	اظہارِ مجبوری
موقف	مَو قِف	اختیار
مولد	مَو لِد	جائے پیدائش
ملکہ	مَ لَ کَ ہ	مہارت
ملکہ	مَ لِ کَ ہ	بیگم
میل	مے + ل	گند۔ کدورت
میل	مے + ل	رجحان‘ رغبت

میل	می + ل	آٹھ فرلانگ
نفس	نَ فَ س	سانس
نفس	نَ فْ س	جی‘ من
نقطہ	نُ قْ طَ ہ	صِفر کا نشان
نکتہ	نُ کْ تَ ہ	پُر معنی بات (جمع نُکات)
ناتواں	نَ اتُ وَ اں	کمزور
نُبوت	نُ بُ وْ وَ ت	منصب (اللہ کا پیغام پہنچانا)
نظم ونسق	نَ ظْ مْ و نَ سَ ق	بروزنِ سَبَق
نمو	نُ مُ و	پروان چڑھنا
نمودار	نُ مُ وْ دَ ار	ظاہر
واپس	وَ اپِ س	لَوٹا‘ لَوٹایا ہوا
وِفاق	وِفَ اق	مرکز
ولد	وَ لَ د	بیٹا۔ اسی طرح وَلدِیت
ہجو	ہَ جْ و	بروزنِ لغو اور لفظ ملامتی اشعار
ہجوم	ہُ جُ وْ م	لوگوں کا اجتماع
یکم	یَ کُ م	پہلا
یورش	یُ وْ رِش	یلغار‘ چڑھائی

حوالہ

اس تحریر کی ترتیب و پیشکش کے لئے مقتدرہ قومی زبان پاکستان کی فرہنگِ تلفّظ مرتّبہ شان الحق حقی‘ جناب طالب ہاشمی کی اصلاحِ زباں اور رسیّد بدرالحسن کی صحتِ الفاظ سے استفادہ کیا گیا

گوشۂ علم

انتخاب

یہ نسٹیئن کا مستقل سلسلہ ہے۔ کوئی پُرتاثیر تحریر آپ کی نظر سے گزرے، تو اس کے معنی خیز حصے کتاب یا جریدے، مضمون اور مضمون نگار کے نام کے ساتھ ہمیں بھجوائیے۔ آپ کے حوالے کے ساتھ شائع ہوں گے

اگست 1947ء کے پہلے ہفتے میں گورنر ہاؤس میں کوئی تقریب تھی۔ اُسی روز اعلان ہوا کہ 15 اگست سے مسٹر چندولال تریویدی مشرقی پنجاب کے گورنر ہوں گے۔ اس خبر پر وہ بے حد خوش تھے۔ شراب کا گلاس ہاتھ میں لئے اور ایک موٹا سا سگار کلّے میں دبائے پارٹی میں بلبل کی طرح چہک رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گورمیلے کی طرح میری طرف لپکے اور بڑی بلند آواز میں بولے: ''میں نے سنا ہے تم بھی پاکستان جانے کی تیاری کر رہے ہو۔ بہت خوب! اگر کبھی لاہور کی طرف آنا ہو تو مجھے ضرور ملنا۔ مجھے لاہور کا گورنر ہاؤس خاص طور پر پسند ہے۔ اس کے سامنے لارنس گارڈن کی بڑی اچھی سیر گاہ ہے۔'' بھارتی پنجاب کے نامزد گورنر کی بات سن کر میرا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ میرے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے آثار دیکھ کر تریویدی صاحب نے اپنا بھاری بھرکم بھدا سا ہاتھ میرے کندھے پر زور سے مارا اور قہقہہ لگا کر بولے: ''ہاں ہاں میرے دوست !لاہور، گڈ اولڈ لاہور۔ مشرقی پنجاب کا نیچرل دارالخلافہ لاہور ہی تو ہے۔'' میں نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے پوچھا: ''کیا یہ فیصلہ ہو چکا ہے؟'' وہ جواب دیئے بغیر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔

اس وقت مجھے ریڈکلف ایوارڈ کی قہر سامانیوں کا گمان تک نہ تھا۔ تاہم انتہائی معتبر ذرائع بتاتے تھے کہ کانگریس نے مسٹر ریڈکلف کی خدمت میں دو کروڑ روپے کا نذرانہ چڑھایا ہے۔ ایسی باتوں کا حتمی ثبوت نہیں ملا کرتا۔ رشوت لے کر تو چونگی کا محرر بھی صاف بچ نکلتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن، کانگریس اور ریڈکلف کا گٹھ جوڑ تو بڑی بات تھی۔ برّصغیر میں لارڈ کلائیو اور وارن ہیسٹنگز جیسے مشاہیر باج، خراج اور نذرانہ وصول کرنے کی جو روایات چھوڑ گئے ہیں، ان کے پیشِ نظر اس بات کی کون ضمانت دے سکتا ہے کہ لندن کا ایک غیر معروف وکیل اس زمانے کی دو کروڑ روپے کی خطیر رقم کو ٹھکرا دے گا؟ اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نظر ہی نہیں آتی کہ ریڈکلف ایسے فیصلے کرے جو نہ صرف خلافِ عقل، خلافِ ضابطہ اور خلافِ شہادت ہوں، بلکہ واضح طور پر بدنیتی، ضد اور خودسری پر مبنی ہوں۔ 16 اگست 1947ء کو جب ریڈکلف کے معاندانہ، مفسدانہ اور نامنصفانہ ایوارڈ کا اعلان ہوا، تو مشرقی پنجاب اور دہلی کے مسلمانوں پر قتل و غارت کی قیامت ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مسلّح جتھے فوجیوں اور پولیس کی مدد سے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے جان، مال اور ناموس سے کھیل رہے

تھے۔ کتنے لوگ مارے گئے؟ کتنی عصمتیں لُٹیں؟ کتنے معصوم بچے کٹ چر گئے؟ تاریخ کے حساب دان ان سوالوں کا جواب دینے سے سراسر قاصر ہیں۔ ان کا جواب صرف پاکستان کی بنیادوں میں محفوظ ہے۔ (قدرت اللہ شہاب: شہاب نامہ)

مَیں جرمنی کے ایک قصبے میں ایک بین الاقوامی لاء کانفرنس میں شریک تھا۔ اسی روز یعنی 28 مئی 1998ء کو پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ دھماکہ کی خبر کانفرنس میں پہنچی' تو میں تمام شرکائے کانفرنس کی توجہ کا مرکز و محور بن گیا۔ برطانوی نمائندے نے مجھے گھورتے ہوئے کہا: ''کیا آپ جانتے ہیں کہ ایٹمی ریس میں شامل ہوکر آپ اپنے لئے اقتصادی بدحالی کے سوا کچھ حاصل نہیں کریں گے؟'' جب میں نے ان سے یہ عرض کیا کہ جنگِ عظیم دوم کے آغاز کے وقت کچھ لوگوں نے برطانیہ سے بھی یہ کہا تھا کہ جرمنی سے جنگ لڑ کر برطانیہ اپنی سلطنت کھو بیٹھے گا لیکن آپ نے مسٹر چرچل کی ولولہ انگیز قیادت میں جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا اور سلطنت تو کھو ڈالی لیکن برطانیہ کی آزادی قائم رکھی۔ آپ کو اپنی سلطنت کھونے کا یقیناً افسوس نہ ہوا ہوگا کیونکہ سلطنت کے مقابلے میں آزادی جیسی نعمت قربان نہیں کی جا سکتی۔ جاپان کے نمائندے نے کہا: ''آپ نہیں جانتے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہ کاریاں کس نوعیت کی تھیں۔ ہم ابھی تک اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔'' میں نے ان سے کہا کہ اگر جاپان کے پاس بم ہوتے اور وہ انہیں سان فرانسسکو یا لاس اینجلس پر گرا سکتے تو شاید ناگاساکی اور ہیروشیما بھی بچ جاتے۔ جاپانی وفد بھی اس کے بعد مجھ سے نہیں ملا۔ جرمنی کے نمائندے نے کہا: ''ہم پاکستان کو صدر ایوب خان کے زمانے سے بہت پسند کرتے ہیں بلکہ جتنا استقبال ہم نے صدر ایوب خان کا کیا اور بار بار کیا' اس زمانے میں اس طرح کسی صدر کا استقبال نہیں کیا گیا کیونکہ آپ ایک جری اور بہادر قوم ہیں۔ آپ کو امریکہ سے عام اسلحہ کی رعایت اور گارنٹی لے لینی چاہئے تھی اور ایٹمی دھماکہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' میں نے عرض کیا کہ سننے میں آیا ہے کہ جرمنی ایٹم بم بنانے کے قریب پہنچ چکا تھا اور ناروے میں یورینیم صاف کرنے کا پلانٹ لگایا گیا تھا اگر اتحادی فوجیں امریکہ کی مدد سے جرمنی میں داخل نہ ہو چکی ہوتیں تو شاید وہ بم جو امریکہ نے بعد میں بنائے اور جس سے انہوں نے تمام دنیا پر تسلط قائم کیا' وہ بم جرمنی بنانے میں کامیاب ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو دنیا کا نقشہ کتنا مختلف ہوتا۔ انہوں نے میرا مطلب نہ سمجھتے ہوئے کہا: ''یقیناً بہت بُرا ہوتا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔'' میں نے اپنی دلیل کا تیر چلاتے ہوئے کہا کہ جب بھارت نے پانچ دھماکے کر دیئے تو ہماری سوچ کا وہی عالم تھا جن کا آپ نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا یعنی اگر ہٹلر کے ہاتھ میں ایٹم بم آ جاتے تو دنیا کا کیا نقشہ ہوتا' چنانچہ ہم نے اپنے علاقے میں اس کیفیت کو منفی کرنے کے لئے مجبوراً دھماکہ کیا ہے۔ جرمن نمائندہ ''مَیں سمجھ گیا'' کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ (ایس ایم ظفر: مشاہدات)

بھارت کے دفترِ خارجہ نے بلوچستان کے حوالے سے ایک انتہائی اشتعال انگیز بیان دیا جس پر پاکستانی دفترِ خارجہ نے ردِعمل ظاہر کیا۔ اس ردِعمل پر اپنا ردِعمل ظاہر کرتے ہوئے بھارت کی خفیہ ایجنسی ''را'' کے سابق سربراہ بی رامن نے

بلوچستان کو تقسیمِ ہند کا نامکمل ایجنڈا قرار دیا اور بلوچستان میں برپا دہشت گردی کو تحریکِ آزادی سے تعبیر کیا۔ یوں بلوچستان کی صورتِ حال کو بھارت کا اندرونی مسئلہ سمجھتے ہوئے انہوں نے بھارت کو بلوچستان کے دہشت گردوں کی حمایت کا فرض یاد دلایا ہے۔ بلوچستان کے وزیرِ اعلیٰ نے دسمبر 2008ء میں انکشاف کیا تھا کہ ''را'' نے بلوچستان میں دہشت گردی کے چالیس کیمپ قائم کر رکھے ہیں جہاں پر دہشت گرد کو دس ہزار ماہانہ رقم ادا کی جارہی ہے۔ (ڈیلی ٹائمز' 31 دسمبر 2008ء) حکومتِ پاکستان نے بلوچستان میں بھارت کی مداخلت کے ثبوت باضابطہ طور پر بھارت کو فراہم کئے ہیں۔

بی رامن کے اس بیان سے یہ حقیقت پھر بے نقاب ہوگئی ہے کہ بھارت صرف بلوچستان ہی نہیں' پورے پاکستان کو آزادیٔ ہند کا نامکمل ایجنڈا سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تحریکِ آزادی کی تکمیل اکھنڈ بھارت کے قیام سے عبارت ہے۔ اس ایجنڈے کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے نقشے سے مٹ کر بھارت کے نقشے میں تحلیل ہو جائے۔ بھارت کے حکمران طبقے کی ''پاکستان دوستی'' کا یہ انکشاف بھارت کی دوستی میں مبتلا پاکستانی دانشوروں کے لئے ناقابلِ یقین حد تک حیرت انگیز ہے۔ یہ تو ہے وہ خواب جسے حقیقت بنانے کی خاطر بھارت دامے' درمے' سخنے کوشاں ہے۔ باقی رہی وہ حقیقت جسے نصف صدی کی بے عملی نے دُھندلا کر رکھ دیا' جاننا چاہئے کہ بھارت نے حیدرآباد' جونا گڑھ اور دیگر متعدد ریاستوں پر مسلح فوجی جارحیت کے ذریعے قبضہ کیا تھا۔ اس کے برعکس بلوچستان نے شفاف جمہوری اصولوں پر عمل کرتے ہوئے آئینی طور پر پاکستان میں شمولیت کی تمنا پوری کی تھی۔

برطانوی سامراج نے بلوچستان میں سیاسی اور جمہوری عمل صرف کوئٹہ میونسپلٹی تک محدود کر رکھا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ سالہا سال تک اپنے ہر سالانہ اجلاس میں یہ مطالبہ کرتی رہی کہ سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کا دائرہ پورے بلوچستان تک پھیلا دیا جائے۔ قائدِاعظمؒ کے مشہورِ زمانہ چودہ نکات میں بھی ایک نکتہ اسی مطالبے سے پھوٹا تھا۔ برطانوی حکومت اور کانگرسی قیادت' ہر دو' اس مطالبے کی مخالفت میں سرگرمِ عمل رہیں۔ قراردادِ پاکستان سے فقط چار ماہ بعد آل انڈیا مسلم لیگ کی بلوچستان شاخ کا پہلا سالانہ اجلاس جولائی 1940ء میں خان لیاقت علی خان کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں بھی یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ سیاسی اور تمدنی اصلاحات کو کوئٹہ میونسپلٹی تک محدود رکھنے کی روش کو ترک کر کے پورے بلوچستان میں سیاسی عمل کی اجازت دی جائے۔ مرکزی قیادت کی رہنمائی میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے بڑی سرگرمی کے ساتھ تحریکِ پاکستان کا پیغام عام کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ اکتوبر 1945ء میں قائدِاعظمؒ نے دورۂ بلوچستان کے دوران اصلاحات کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے کانگرس نواز سرداروں کے پراپیگنڈے کو غیر موثر بنانے کی خاطر کوئٹہ' فورٹ سنڈے مین' نوشکی اور دیگر مقامات پر جلسے کئے اور مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں۔ 30 جون 1947ء کو شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے ارکان کا اجلاس اس سوال کا فیصلہ کُن جواب حاصل کرنے کی خاطر منعقد ہوا کہ بلوچستان کو پاکستان میں شامل ہونا چاہئے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اجلاس میں موجود چوّن کے چوّن ارکان نے ''ہاں'' میں دیا اور یوں بلوچستان نے آئینی اور جمہوری

انداز میں پاکستان میں شمولیت اختیار کرلی۔ برطانوی مصنف Ian Talbot نے اپنی کتاب بعنوان ''صوبائی سیاست اور تحریکِ پاکستان'' (1988ء) میں اس جمہوری اور آئینی عمل پر درج ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"The Congress had played on the fear that Pakistan would be too poor to support the deficit province, its delegation had also attempted to set Baluchis off against Pathans, whilst holding out the hope of evntual independence. The League counteracted this 'bitter' propaganda by taking out a huge procession in Quetta on 23rd June, 1947.To further impress the tribal elders of the *Shahi Jirga* who were in the city, the League persuaded Nawab Jogazai, the scion of a former ruling family of Baluchistan, to place himself at its head. On the day on which the vote was to take place,the League gathered a huge crowd outside the Town Hall. Inside it all the 54 members present, voted to join the Pakistan Constituent Assembly, mindful of the emotions and feelings of the people of Baluchistan."

یہ عجب اتفاق ہے کہ تحریکِ پاکستان کے دوران انڈین نیشنل کانگرس غربت' پسماندگی اور بلوچ پشتون منافرت کے جس استدلال کے ساتھ بلوچستان کو پاکستان میں شامل نہ ہونے کا درس دے رہی تھی' نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد آج پھر اسی استدلال کو بلوچستان کی پاکستان سے علیحدگی کے لئے استعمال کررہی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ صورتِ حال خراب ہے۔ بھارت اس صورتِ حال کا اسی طرح سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے' جس طرح اُس نے مشرقی پاکستان میں ہماری مشکلات سے ناجائزہ فائدہ اُٹھا کر پاکستان کے خلاف مسلح فوجی جارحیت کا ارتکاب کیا تھا۔ آج وقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کے خوابوں کو حقیقت بنانے کا آغاز کیا جائے۔

(پروفیسر فتح محمد ملک: فتنۂ انکارِ پاکستان)

امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ ایک صحابیؓ نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے قیامت کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے کہ اس کی آمد کا پوچھ رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ تیاری تو کوئی نہیں کی' لیکن اتنا ہے کہ آپؐ سے محبت کرتا ہوں۔ نبی کریمؐ نے خوش ہوکر فرمایا: ''قیامت کے دن وہ اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ دنیا میں محبت کرتا تھا۔''

ثابت ہوگیا کہ مسلمان کا قیمتی ترین سرمایہ حبِّ نبی کریمؐ ہے' لیکن بات اتنی ہی نہیں۔ رسولِ کریمؐ کے ساتھ محبت آپؐ پر ایمان کا لازمی تقاضا بھی ہے اور یہ وہ وصف ہے جو مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر دیگر اقوام اور ان کے افراد سے ممتاز کرتا ہے۔ انفرادی حیثیت میں حضورِ اکرمؐ کے ساتھ محبت

کے معاملے میں تمام مسلمان برابر نہیں ہو سکتے۔ بعض مسلمان جذبۂ حُبِّ رسولِ مقبولؐ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت غازی علم الدین شہیدؒ کی طرح اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ دوسرے ان پر رشک کرتے رہ جاتے ہیں، لیکن جب کبھی مسلمانوں پر اجتماعی آزمائش کا وقت آتا ہے، تو امتِ محمدیہ کا ہر فرد قطع نظر اس کے کہ وہ عالم فاضل ہو یا جاہلِ مطلق، متقی پرہیزگار ہو یا گنہگار، فوجی ہو یا شہری حُبِّ رسولِ مقبولؐ کے پیشِ نظر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے معاملے میں برابر ہو جاتا ہے۔ روحِ محمد مصطفیٰؐ پورے مسلمان معاشرے میں اس طرح رواں ہو جاتی ہے کہ مسلمان بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے وقت ہندوستان کی ملتِ اسلامیہ اجتماعی طور پر اسی کیفیت سے سرشار تھی۔ کسی مسلک یا کسی فقہ کا امتیاز نہ تھا۔ امیرِ ملت حضرت جماعت علی شاہؒ محدث علی پور نے قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کو تمام مسلمانوں کی طرف سے قیادت کا جھنڈا عطا کیا، تو نابغۂ عصر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے خواب میں حضور سرورِ کائناتؐ کے قدموں میں قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کو بیٹھے دیکھ کر برملا اس کا اظہار و اعلان فرمایا۔ ملتِ اسلامیہ کے ہر فرد نے وقت آنے پر جان و مال کی قربانی اور ہجرت جیسے غیر معمولی ایثار کو معمولی بات سمجھا۔ یہ سب کچھ حُبِّ رسول کریمؐ کا اعجاز تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے برِّصغیر کے مسلمانوں کو نبی کریمؐ سے جس قدر محبت اور آپؐ کی ناموس سے جتنا گہرا لگاؤ ہے، دنیا بھر کے مسلمان اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی قوت اور غیرت سے خائف طاقتوں نے برِّصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں موجزن حُبِّ رسول مقبولؐ کے سمندر کو محدود کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ناکام و نامراد کیا۔ انگریز و ہندو کی تمام رکاوٹوں اور مسلمانوں کی معاشی کمزوری کے باوجود پاکستان کا قیام اللہ تعالیٰ کی جانب سے برِّصغیر کے مسلمانوں کے لیے محبوبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے کنار محبتوں کا اجر ہے۔

آج پاکستانی قوم جس اجتماعی امتحان سے دوچار ہے، اس کا سِرا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اور ان تعلیماتِ رسولِ مقبولؐ سے جا ملتا ہے جن میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ اور خود اپنے دشمنوں اور اپنی صفوں میں موجود دشمن کے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک طرف جدید ترین اسلحۂ جنگی صلاحیت اور پیشہ ورانہ مہارت سے لیس مجاہدوں کو ہر دم تیار رکھنے کا حکم دیا گیا۔ دوسری جانب ہر شہری کو اپنے اپنے شعبے میں اپنے فرائض کی دیانتداری سے ادائیگی، وطن دشمنوں پر کڑی نظر رکھنے اور ان کی سرکوبی کیلئے ہر ممکن کوشش و تعاون کو فرضِ لازم قرار دیا ہے۔ پاکستانی قوم پر لازم ہے کہ اپنے ایمان، اپنے پیارے نبیؐ سے محبت اور اپنی آزادی و سلامتی کے تحفظ کے لیے پاکستان کی دفاعی صلاحیت کو کسی بھی صورت میں کمزور نہ ہونے دے۔ جو قوم بے سروسامانی کے عالم میں ایٹمی میدان میں اتر کر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسے کی بدولت اپنی کامیابی سے دنیا کو حیران کر سکتی ہے، بین الاقوامی دباؤ، عالمی تخریب کاری اور اقتصادی مشکلات کا پہاڑ سر کرنا بھی اس کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ موجودہ اور آئندہ آنے والے امتحانوں میں کامیابی کیلئے اسی جذبۂ عشقِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت دلوں اور دماغوں میں

موجزن تھا۔ (سید ریاض الحسن گیلانی: استحکامِ پاکستان)

اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں قائم ہونے والی پہلی اسلامی ریاست' مدینہ طیّبہ کے نام سے 622ء میں قائم ہوئی تھی۔ مدینہ طیّبہ اور 14 اگست 1947ء کو قائم ہونے مملکتِ خداداد پاکستان کے درمیان کچھ مماثلتیں ہیں جن کی بناء پر ان دونوں کے مسائل ایک ہو گئے ہیں۔ مسائل ایک ہوں تو ان کے حل کرنے کا طریقِ کار بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ مماثلتیں تاریخی تقاضے نے پیدا کی ہیں' سیاسی اور معاشی مفاد پرستوں نے نہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا پاکستان کی بقاء کی شرائط کو نظر انداز کرنا ہے۔ ان دونوں ریاستوں کے بلاامتیاز جدید و قدیم ہونے کی وجہ سے ان کے مسائل کو حل کرنے کے طریقِ کار کا ایک ہونا بھی لازمی ہے مثلاً

☆ مدینہ طیّبہ کی مملکت کے وجود میں آنے سے پہلے مشرکینِ مکہ اس کے خلاف تھے۔ مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے مشرکینِ ہند اس کے خلاف تھے۔

☆ مملکتِ مدینہ طیّبہ کے قیام کے وقت کچھ مسلمان مکہ میں باقی رہ گئے تھے جن کی جان' مال اور آبرو خطرے میں تھی۔ مملکتِ پاکستان کے وجود میں آنے کے وقت بھی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہندوستان میں رہ گئی جن کی جان و مال اور آبرو آج بھی ہر وقت خطرے میں ہے۔

☆ مملکتِ مدینہ طیّبہ دوسری ہم عصر ریاستوں کے مقابلے میں ایک جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی' کیونکہ وہ نظریاتی اساس پر وجود میں آئی تھی اور دوسری ریاستیں جغرافیائی یا نسلی یا معاشی مفاد کی وحدت پر قائم تھیں۔ مملکتِ پاکستان بھی تمام دوسری ہمعصر ریاستوں کے مقابلے میں ایک جزیرے کی حیثیت رکھتی ہے' کیونکہ یہ نظریاتی بنیاد پر وجود میں آئی ہے اور دوسری تمام ہمعصر ریاستیں جغرافیائی یا نسلی یا معاشی مفاد کے ایک ہونے کی بنیاد پر قائم ہیں۔

☆ مملکتِ مدینہ طیّبہ کے قیام کے وقت بھی دنیا کی دو سُپر طاقتوں (قیصر و کسریٰ) کے عناد کی وجہ سے امنِ عالم کو خطرہ درپیش تھا اور مملکتِ پاکستان کو بھی یہی مسئلہ درپیش رہا۔ امریکہ اور روس کی وجہ سے امنِ عالم کو خطرہ لاحق رہا اور یہی مسئلہ درپیش رہا کہ ان باہم مخالف طاقتوں میں سے کسی میں بھی اپنے آپ کو ضم کئے بغیر اس منصب کو کیسے پورا کیا جائے جس کے لیے پاکستان وجود میں آیا۔

ازل سے ابد تک انسانیت کا ایک ہی مسئلہ ہے کہ اپنی حرص و ہوس اور دوسروں کی حرص و ہوس کے شر سے نجات کیسے ملے؟ آج ہمیں درپیش کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو کل درپیش نہیں تھا اور ہر مرض اور مسئلے کا علاج یہ ہے کہ اس انحراف اور بدعہدی سے واپس لوٹا جائے جو قیامِ پاکستان کے بعد روا رکھی گئی' کیونکہ دنیا کی کوئی قوم اپنی نظریاتی اساس سے ہٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ بے مقصدی زوال اور مسائل کا سبب ہے۔ نظریاتی مقصود کو اپنا کر اس کے حصول کی جدّ و جُہد ہر مسئلے کا حل ہے۔

(ڈاکٹر بُرہان احمد فاروقی: قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل)

گلوبل وارمنگ

ابرار حسین

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اکیسویں صدی موسموں کی تبدیلی کی صدی ہے۔ اب موسمِ سرما کی مدت کم ہوتی جارہی ہے اور موسمِ گرما کی طوالت اور شدت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اس سے گلوبل وارمنگ کی صورت پیدا ہوگئی ہے یعنی کرۂ ارض گرم ہوتا جارہا ہے۔اب پوری دنیا کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہونے لگا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے زیرِ اہتمام ''گلوبل وارمنگ کانفرنس'' منعقد ہوئی جس میں نامور ماہرینِ موسمیات و ماحولیات نے صورتِ حال کی تصویر اور اس کی اصلاح کے لئے تجاویز پیش کیں۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ سورج کی شعاعیں تیزی سے زمین پر پڑنے لگی ہیں۔ بالائی فضا میں موجود اوزون لیئر (Ozone layer) میں جگہ جگہ شگاف یا سوراخ پڑ گئے ہیں۔ روشنی ان سوراخوں میں سے گزرتی ہوئی زمین پر پڑتی ہے تو گرم موسم کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔

اوزون زمین کے گرد ایک تہہ کا نام ہے جس میں O_3 کے مالیکیولز کی بڑی مقدار پائی جاتی ہے۔ یہ حفاظتی تہہ سورج سے آنے والی خطرناک الٹراوائیلٹ شعاعوں کو 93 سے 99 فیصد تک جذب کر لیتی ہے۔ واضح رہے یہی شعاعیں زمین پر موجود انسانی، حیوانی اور نباتاتی حیات کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ زمین پر موجود 91 فیصد اوزون اسی تہہ میں ہے۔ یہ تہہ سطحِ زمین سے 10 سے 15 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود سٹریٹوسفیئر (stratosphere) کا نچلا حصہ ہے جس کی موٹائی محلِ وقوع کی مناسبت سے مختلف ہوتی ہے۔ اوزون کی سطح 1993ء میں فرانسیسی سائنسدان چارلس فیبری اور ہینری بوئیس نے دریافت کی۔ ایک برطانوی ماہرِ موسمیات جی ایم بی ڈوبسن نے اپنے ایجاد کردہ سپیکٹروفوٹو میٹر (اب اسے ڈوبسنو میٹر کہا جاتا ہے) کے ذریعے اس کی خصوصیات کا جائزہ مرتب کیا۔ یہ آلہ سٹریٹوسفیئر کی سطح پر موجود اوزون کا مشاہدہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ 1928ء سے 1958ء کے درمیان ڈوبسن نے دنیا بھر میں اوزون مانیٹرنگ سٹیشنوں کا ایک جال بچھادیا، جو آج بھی متحرک ہے۔ ڈوبسن یونٹ سطحِ زمین سے اوپر موجود اوزون کی مقدار معلوم کرنے کا یونٹ ہے جو اِسی

برطانوی سائنسدان کے نام پر ہے۔

دنیا میں سبزہ زاروں کی بھی کمی ہوتی جارہی ہے۔نہروں اور دریاؤں میں پانی کی مقدار میں تیزی سے کمی آرہی ہے جس کی وجہ سے سبزہ زار کم تر ہوتے جارہے ہیں۔پہاڑوں اور میدانوں میں جنگل تیزی سے کاٹے جارہے ہیں کیونکہ مکانوں کی تعمیر کے لئے استعمال ہونے والی لکڑی مہنگے داموں فروخت ہوتی ہے۔

سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ الاسکا سے لے کر انڈیز کے پہاڑی علاقوں تک گرمی میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ایک صدی گزرنے کے بعد جب انسان دوسری صدی میں داخل ہوتا ہے' تو گرمی میں کئی سینٹی گریڈ اضافہ ہو چکا ہوتا ہے۔دنیا کے سرد ترین علاقوں میں بھی' جو دُور دراز حصوں میں واقع ہیں' موسمِ گرما شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔موسمِ گرما کی وجہ سے پہاڑوں پر جمی برف تیزی سے پگھل رہی ہے' اس کے باوجود دریاؤں میں پانی کی کمی ہے۔ساحل کم ہوتے جارہے ہیں۔کیونکہ انسانوں کے لئے رہائش کی زمین کم پڑنے لگی ہے۔

قریباً ایک ہزار سال پہلے یورپ میں بہت سردی پڑتی تھی۔دریائے ٹیمز میں پانی کا بہاؤ رُک جاتا تھا کیونکہ سردی کی وجہ سے پانی برف کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔اب دریا میں برف میں اضافہ نہیں ہورہا کیونکہ سورج کی شعاعیں حدت زدہ ہیں جو پانی کو برف میں تبدیل نہیں ہونے دیتیں۔

اندر کی بات

پروفیسر نعیم احسن اس موضوع پر گہری نظر رکھتے ہیں' ان کے کئی مقالے معروف جریدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ملاحظہ کیجئے گلوبل وارمنگ پر ان کے فکرانگیز اور معلومات افزا خیالات:

موسم کی تبدیلی کا جن چیزوں پر انحصار ہے ان میں بنیادی چیز طول بلد ہے۔اسی کے سبب یہ طے پاتا ہے کہ کسی خطے کا موسم گرم ہوگا یا ٹھنڈا۔دوسری چیز خطے میں ہواؤں کا چلنا ہے۔یہ ہوائیں اپنی اصل میں خالصتاً مقامی بھی ہوسکتی ہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی خطے میں چلنے والی ہوائیں ہزاروں کلومیٹر دُور سے آئی ہوں۔گرمی' سردی' خشکی اور رطوبت کا دارومدار کافی حد تک ان پر بھی ہوتا ہے۔ایک اور اہم عنصر جس کے سبب موسموں میں تبدیلی آسکتی ہے' وہ کسی خطے کی جغرافیائی حالات بھی ہوتے ہیں۔اس میں خشکی اور سمندر کی باہمی تقسیم' سطح سمندر سے بلندی' خطے کے قرب و جوار میں جنگلات' جھیلوں' وادیوں' گلیشیئرز کی موجودگی کے علاوہ کئی دیگر طبعی عوامل شامل ہیں۔مؤخرالذکر میں انسانی بے اعتدالیوں کے سبب خطرناک تبدیلیاں ہورہی ہیں اور ان میں سرِفہرست جنگلات کی کمی ہے۔انسان اپنی تمدنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے مسلسل ان میں کمی کا موجب بن رہا ہے۔ہمارا طرزِ زندگی دوسرا بڑا سبب ہے۔جس کی وجہ سے گرین ہاؤس گیسوں کا اخراج ہوتا ہے جو موسموں پر بھی اثرانداز ہورہا ہے۔

سال بھر میں زمین پر چار موسم سردی' بہار' گرمی اور خزاں گزرتے ہیں' موسموں کے بدلنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین سورج کے گرد اپنے مدار میں چکر لگاتے ہوئے ایک خاص زاویہ پر

جُھکی رہتی ہے۔

جغرافیائی تقسیم کے حوالے سے زمین کے مختلف خطوں میں موسموں کو تین بڑے گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ طول بلد کے حساب سے پہلا گروپ ٹروپیکل کلائی میٹس کا ہے۔ یہ عام طور پر گرم اور خشک سمجھا جاتا ہے جس میں سال بھر استوائی ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ دوسرا گروپ ٹمپریٹ کلائی میٹس ہے جس میں وسطی عرض بلد کے علاقے آتے ہیں۔ یہ متغیّر موسموں کا گروپ ہے۔ تیسرا پولر کلائی میٹس ہے جو بلند طول بلد کے خطّوں پر آتا ہے اور اس میں موسم ہمیشہ سرد رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا شمار اول الذکر یعنی ٹروپیکل کلائی میٹس کے گروپ میں ہوتا ہے۔ روزانہ مسلسل دھوپ چمکنے کے سبب استوائی اور ٹروپیکل خطوں میں پورا سال موسم گرم ہی رہتا ہے اور ان خطوں میں چلنے والی ہوائیں بھی گرم ہی ہوتی ہیں جو موسموں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوں میں گرمی کا موسم زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اسی گروپ میں برِّ اعظم پاک و ہند شامل ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں چین کے علاقوں میں مون سون کلائی میٹ کی بدولت موسمی ہوائیں تقریباً مخالف سمت سے چلتی ہیں۔ گرم مرطوب ہوائیں گرم اور خشک ہواؤں میں بدل کر بادلوں اور گیلی گرمیوں اور خشک سردیوں کا سبب بنتی ہیں۔ خشک ٹروپیکل کلائی میٹ خطِ استوا کے دونوں جانب 15 سے 30 ڈگری تک وسیع علاقوں میں ہوتا ہے۔

گرمی تو ہر سال آتی ہے لیکن کچھ عرصے سے ہر سال اس کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ صرف ہمارے ہاں نہیں ہے بلکہ عالمی سطح پر زمین کے درجۂ حرارت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ درجۂ حرارت بڑھنے کے ذمہ دار بھی ہم خود ہیں۔

زمین نظامِ شمسی کا واحد سیارہ ہے جس پر زندگی موجود ہے۔ زمین ہمارا گھر ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ حیات کا سارا سلسلہ اس کے ساتھ مربوط ہے۔ یہ پانی، آکسیجن اور نائٹروجن سے تشکیل پانے والی بھرپور فضا اور متغیّر موسموں کا ایک ایسا خوبصورت اور متوازن امتزاج ہے جو مختلف النوع نباتات اور حیوانی زندگی کی بقا کے لئے بنیادی عناصر مہیا کرتا ہے۔ سائنسی تحقیقات کے مطابق زمین پر زندگی کی شروعات پودوں سے ہوئی جو ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ لیتے تھے اور

1997ء میں جاپان کے شہر کیوٹو میں طے پانے والے عالمی معاہدے کے تحت قرار پایا کہ ''گرمی کو جذب کرنے والی گیسوں کے بحران پر قابو پا کر 2008ء سے 2012ء تک کاربن آلود گیسوں کے اخراج میں 2.5 فیصد کمی کی جائے۔'' اس کے لیے پیمانہ 1990ء کی دہائی کو بنایا گیا۔ یہ بیسویں صدی کی گرم ترین دہائی اور 1998ء کا سال گرم ترین سال تھا۔ 38 صنعتی ترقی یافتہ ملکوں کو پابند کیا گیا کہ وہ 2010ء تک ان گیسوں کی مقدار کم کر کے 2.5 فیصد تک لے آئیں۔ لیکن آسٹریلیا کو اس پابندی سے خارج کر دیا گیا کیونکہ وہاں دنیا میں ایک فیصد سے ذرا سی زیادہ کاربن آلود گیس خارج ہوتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے لیے کوئی کوٹا مقرر نہیں کیا گیا۔ مارچ 2010ء میں امریکہ یہ کہہ کر معاہدے سے مکر گیا کہ اس پر عمل کرنے سے ہماری معیشت کو شدید نقصان پہنچے گا۔ امریکہ جس کی آبادی دنیا کی ایک چوتھائی ہے، کاربن آلود گیس کے اخراج کا سب سے بڑا ذمہ دار ہے، دنیا کی پچھتر فیصد گیسیں امریکہ ہی سے خارج ہوتی ہیں۔ ایک جانب چین، بھارت، میکسیکو، برازیل اور ارجنٹینا جیسے ترقی پذیر ملکوں نے ایسی پالیسیاں اپنائی ہیں کہ کاربن آلود گیسوں کا اخراج ان کے ہاں کم ہوا ہے جبکہ امریکہ میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ (سید راشد اشرف: دوہرا معیار)

فوٹوسنتھے سز کے عمل کے دوران آکسیجن پیدا کرتے تھے۔حیوانی زندگی کا آغاز اس وقت ہُوا جب فضا میں آکسیجن اس مقدار کو پہنچ گئی جو زندگی کی نمو کے لئے ضروری تھی۔

زمین کے اردگرد فضا کا یہ کرّہ تقریباً ایک ہزار کلو میٹر (600 میل) تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہے اور ہمیں سورج کی ریڈی ایشن کے نقصان دہ اثرات سے بھی بچاتا ہے۔ یہ کرۂ فضا کئی پرتوں یا تہوں پر مشتمل ہے۔زندگی کی بقاء کے لئے جو پرت ضروری ہے اسے ٹروپوسفیئر کہتے ہیں اور اس کا پھیلاؤ زمین کی سطح کے اردگرد تقریباً دس کلومیٹر یعنی چھ میل تک ہے۔فضا کی نشوونما کرنے والے کیمیکل اسی وقت ظاہر ہونا شروع ہوگئے تھے جب زمین کی تشکیل ہوئی۔ لاکھوں سال قبل کی زمین پر موجود کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بھاری مقدار میں قابلِ ذکر کمی ہوئی۔اسی تناسب سے نائٹروجن میں اضافہ ہوا اور اسی عرصہ کے دوران آکسیجن کے درجوں میں تبدیلی آتی گئی۔

ذمہ دار کون؟

ماہرینِ ارضیات کا خیال ہے کہ زمین کی تاریخ میں اس کو اتنا نقصان کسی مخلوق نے نہیں پہنچایا جتنا آج کا انسان پہنچا رہا ہے۔ آج سے ساڑھے چھ کروڑ سال قبل پائی جانے والی دیوہیکل مخلوق ڈائنوسارز زمین میں ہونے والی تبدیلیوں کا شکار ہوکر معدوم ہوگئی جبکہ آج انسان ماحول کی تباہی میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔اس وقت دنیا کی آبادی ساڑھے چھ ارب سے زائد ہے۔ جیسے جیسے آبادی بڑھ رہی ہے اسی قدر آلودگی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔گرین ہاؤس افیکٹ کی بدولت کرۂ ارض کا درجہ حرارت بڑھ رہا ہے بعض کیمیکل جو اوزون کی تہہ کو نقصان پہنچا رہے ہیں ان کا سبب بھی حضرتِ انسان ہے۔آبی حیات کو تباہ کرنے کی ذمہ داری بھی انسان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اوزون کی تہہ جو زمین پر پائی جانے والی مخلوق کو الٹراوائلٹ ریڈی ایشن کے مہلک اثرات سے بچاتی ہے کی شکست وریخت کا ذمہ دار بھی صرف انسان ہے۔ہم آج اس بات کو بھول گئے ہیں کہ زندگی کے مختلف کرداروں کے لئے یہ سٹیج پودوں اور درختوں نے تیار کیا ہے اور آج اس کا صلہ ہم درختوں کو کاٹ کر دے رہے ہیں۔ اسی چیز کو بے تحاشا ختم کر رہے ہیں جس نے زندگی کی نمو کے لئے بنیادی کردار ادا کیا۔اسی شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر ہمارا آشیانہ ہے!

کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین کو ''گرین ہاؤس گیسز'' کہا جاتا ہے اور گلوبل وارمنگ کی ذمہ دار بھی یہی ہیں۔ سائنس دانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسان صنعتی پھیلاؤ کے ذریعے زیادہ مقدار میں گرین ہاؤس گیسز خارج کر کے گلوبل وارمنگ میں اضافہ کر رہا ہے۔

گلوبل وارمنگ میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کا انتہائی اہم کردار ہے۔ ہم گھر میں یا سفر کے دوران توانائی استعمال کر رہے ہوتے ہیں تو کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں بھی اضافے کا باعث بن رہے ہوتے ہی۔ کچھ ایسے طریقے ہیں

جو انتہائی آسان اور سستے ہیں لیکن اس کے لئے ہمیں اپنے طرزِ زندگی میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہوگی۔

ہم اپنے گھر میں روشنی کے لئے استعمال ہونے والی لائٹ سے شروع کرتے ہیں۔عام فلامنٹ والے بلب استعمال کرنے کی بجائے فلوریسینٹ بلب استعمال کرنے سے استعمال ہونے والی توانائی میں کافی حد تک کمی آ جاتی ہے۔ امریکہ میں ہونے والے ایک تجزیاتی مطالعے کے مطابق اگر امریکہ کے ہر گھر سے ساٹھ واٹ کے تین بلب ہٹا دیئے ہیں تو اس سے آلودگی میں اتنی کمی آئے گی جتنی ساڑھے تین لاکھ کاروں کو سڑکوں سے ہٹا دینے سے آ سکتی ہے۔

گرمیوں میں ایئر کنڈیشنر سے صرف اتنی ٹھنڈک حاصل کریں جس سے گزارا ہو سکے۔تھرموسٹیٹ کو صرف دو درجے کم کرنے سے گھر سے پیدا ہونے والی کاربن ڈائی آکسائیڈ میں ہم سالانہ چھ فیصد تک کمی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ریفریجریٹر کے استعمال کو محدود کر کے بھی ہم گلوبل وارمنگ کا سبب بننے والی گیسوں کے اخراج میں کمی کر سکتے ہیں۔ بیس سال پرانے ریفریجریٹر کا استعمال ترک کر کے ایسے ریفریجریٹر استعمال کریں جو توانائی کے لحاظ سے باکفایت ہیں اور مضر گیسوں کا اخراج بھی کم کرتے ہیں۔ گاڑیوں میں استعمال ہونے والا ایندھن جلنے پر گرین ہاؤس گیسز کی بڑی مقدار خارج کرتا ہے۔شہر میں رہتے ہوئے گاڑی کا استعمال کم سے کم کر دیں۔ اس کے بجائے پیدل چلنے یا سائیکل چلانے کو ترجیح دیں۔ ہمارے ہاں بلامقصد یا معمولی کاموں کے لئے جو بڑی آسانی سے پیدل بھی کئے جاسکتے ہیں' گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔ یہ نہ صرف فضول خرچی ہے بلکہ اپنی اگلی نسلوں کے مستقبل سے کھیلنے والی بات بھی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ انسان خود ایک ارضیاتی ایجنٹ بن کر زمین کی زندگی کو تیزی سے نقصان پہنچا رہا ہے۔ظاہر ہے اس کے بڑھتے ہوئے قدم رکیں گے تو پھر ہی اصلاحِ احوال کی کوئی صورت سامنے آئے گی۔

عالمی ماحولیاتی کانفرنس منعقدہ سڈنی (20 نومبر 1989ء) میں پہلے اور دوسرے سیشن کے درمیانی وقفہ میں ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران ڈنمارک کے مندوب نے نفرت انگیز لہجے میں کہا کہ مسلمان ممالک اوزون کی فکر کرنے سے پہلے اپنے ملکوں میں شورشرابے کے ہاتھوں ماحول کی تباہی کو روکیں۔ گفتگو پھیلتی گئی تو اُن کا لہجہ تلخ اور ناگوار ہوتا گیا اور وہ چیخ چیخ کر باتیں کرنے لگے۔ترکی کے ممتاز سائنس دان فضیلت محمد اوزال جو حافظ قرآن ہیں' نے اُنہیں ٹوکتے ہوئے کہا: ''جناب! اسلام میں آپ کی طرح بولنے اور چیخنے والوں کو بدتمیز' اَن پڑھ اور ذہنی مریض قرار دیا جاتا ہے' اسلام انسان کو چال ڈھال' روّیے اور بات چیت میں نرم خوئی اور میانہ روی کی ہدایت کرتا ہے' تاکہ اِن اعمال کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شور سے کسی دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔چیخنی آواز کو گدھے کی آواز سے تعبیر کیا گیا۔قرآن پاک کی سورۃ لقمان کی آیت 19 کا ترجمہ ہے: ''اور میانہ چال چال چل اور اپنی آواز آہستہ رکھ۔ بے شک سب آوازوں میں بُری آواز گدھے کی ہے۔'' یہ سن کر وہاں موجود تمام اہلِ علم چودہ سو سال پہلے نازل ہونے والی قرآنی ہدایت کی حکمت پر جھوم اُٹھے۔

(حکیم محمد سعید: ماحولیات کی حفاظت — ہمارا دینی فریضہ)

چین کی قدیم حکایات

اُسامہ حسن

یہ حکایتیں توجہ سے پڑھیں، تو اس سوال کا جواب مل جائے گا کہ باوفا دوست اور گرانقدر ہمسایہ، عوامی جمہور یہ چین کی ہر شعبۂ زندگی میں دوستوں کو شادماں اور دشمنوں کو پریشاں کر دینے والی ترقی کا راز کیا ہے؟

کوہِ تھائی ہانگ اور کوہِ وانگ دو کا احاطہ تقریباً سات سو 'لی' (ایک 'لی' نصف کلو میٹر کے برابر ہوتا ہے) ہے اور یہ ہزاروں فٹ اونچے ہیں۔

ان پہاڑوں کے شمال میں ایک بوڑھا رہتا تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ نوے برس تھی اور سب اسے بیوقوف کہتے تھے۔ اس کے گھر کا رخ ان پہاڑوں کی سمت تھا اور اسے کہیں آنے جانے میں ہر بار لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک روز اس نے سارے کنبے کو اکٹھا کیا اور اس معاملے پر غور و خوض شروع کر دیا۔

''کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم ان پہاڑوں کو کھود کھود کر زمین کے برابر کر دیں؟'' اس نے تجویز پیش کی۔ ''اس طرح ہم جنوب کی طرف دریائے ہان تک راستہ بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' سب نے رائے سے اتفاق کیا، مگر اس کی بیوی نہ مانی۔ ''تم میں ایک چھوٹا سا ٹیلا کاٹنے کی تو ہمت نہیں، اتنے بڑے پہاڑ کیسے کاٹو گے؟'' اس نے اعتراض کیا۔ ''اور چلو، تم نے پہاڑ کاٹ بھی لئے تو ملبہ کہاں پھینکو گے۔''

''ملبہ ہم سمندر میں پھینکیں گے۔'' بوڑھے نے جواب دیا۔ اس کے بعد بوڑھا اپنے بیٹے اور پوتے کو ساتھ لے کر کام میں جُٹ گیا۔ ان کے پاس بہنگیاں تھیں۔ وہ مٹی اور پتھر کھودتے اور ٹوکریوں میں رکھ کر سمندر کی طرف چل دیتے۔ ان کے پڑوس میں چینگ نامی ایک بیوہ رہتی تھی، اس کا سات آٹھ سال کا ایک لڑکا تھا۔ یہ بیٹا بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ انہیں پہاڑ سے سمندر تک ایک پھیرے میں کئی ماہ لگ جاتے تھے۔ دریا کنارے ایک شخص رہتا تھا جسے لوگ دانا کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ اُن کی ہنسی اڑاتا اور اس ''بے فائدہ مشقت'' سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔

''ختم کرو اب یہ مورکھ پن!'' اس نے چلّا کر کہا۔ ''تم کس قدر احمقانہ کام میں لگے ہوئے ہو۔ تم اتنے بوڑھے اور نحیف ہو کہ ان پہاڑوں کا ایک کونا بھی نہیں ہٹا پاؤ گے... یہ ڈھیروں مٹی اور پتھر لے جا کر سمندر میں پھینکنا تمہارے بس کا روگ نہیں۔''

بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا:''تم کتنے کوڑھ مغز اور ناسمجھ ہو۔ بیوہ کا بیٹا تم سے زیادہ عقلمند ہے۔ میں مرجاؤں گا' تو میرا بیٹا اور پھر میرے بیٹے کا بیٹا یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔ یوں نسل درنسل کھدائی کا کام ہوتا رہے گا' مگر پہاڑ اس سے زیادہ بڑے نہیں ہوسکتے۔ ایسے میں ہم انہیں کھود کر برابر کیوں نہیں کر سکتے؟''

یہ سن کر دانا بغلیں جھانکنے لگا۔

وہم

ایک شخص کی کلہاڑی کھوگئی تو اس کے دل میں شک بیٹھ گیا کہ کلہاڑی پڑوسی کے بیٹے نے چُرائی ہے۔ اس نے لڑکے کی چال کا بغور جائزہ لیا تو اس کی چال بالکل چوروں کی سی لگی۔ اس نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات دیکھے' وہ بھی چوروں جیسے تھے۔ اس نے لڑکے کا اندازِ گفتگو دیکھا' وہ بھی بالکل چوروں جیسا تھا۔ مدعا یہ کہ لڑکے کی ساری حرکات وسکنات چور ہونے کی چغلی کھاتی تھیں۔ لیکن ایک دن وہ کسی کام سے باہر نکلا تو راستے میں کلہاڑی پڑی مل گئی اور تب سے اسے لڑکے کی تمام حرکات وسکنات میں معصومیت نظر آنے لگی۔

بہت سے راستے

یانگ زی کے ایک پڑوسی کی بھیڑ کھوگئی تو اس نے سارے نوکروں کو حکم دیا کہ بھیڑ ڈھونڈ کر لائیں اور یانگ زی نے بھی اپنے نوکر سے بھی کہا کہ وہ بھیڑ تلاش کرے۔

''ہائیں!'' یان زی حیرت زدہ ہوگیا۔''ایک بھیڑ ڈھونڈنے کے لئے تم اتنے سارے آدمیوں کو بھیج رہے ہو؟'

''دیکھئے نا' اتنے بہت سے راستے ہیں۔ جانے بھیڑ کس راستے پر چل پڑی ہو؟'' پڑوسی نے وضاحت کی۔ نوکر لوٹ کر آیا تو یانگ زی نے پوچھا:''کہو بھیڑ ملی؟''

اس نے نفی میں جواب دیا تو یانگ زی نے ناکامی کی وجہ پوچھی۔ نوکر نے جواب دیا''اتنے بہت سے راستے ہیں۔ ایک راستہ دوسرے راستے سے جاملتا تھا اور ہم فیصلہ نہ کر پائے کہ کون سے راستے پر تلاش کریں' چنانچہ لوٹ آئے۔''

یہ سن کر یانگ زی کسی سوچ میں غرق ہوگیا۔ وہ دیر تک چپ چپ سا رہا اور دن بھر مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے غائب رہی۔

اس کے شاگرد بڑے حیران ہوئے۔

''بھیڑ کی گمشدگی معمولی سی بات ہے۔'' انہوں نے کہا۔ ''اور پھر وہ بھیڑ آپ کی تھی بھی نہیں۔ آپ نے کیوں چپ سادھ لی اور مسکرانا بند کردیا؟''

یانگ زی نے کوئی جواب نہ دیا اور شاگرد مزید مخمصے میں پڑ گئے۔ ایک شاگرد جس کا نام منگ شنگ یانگ تھا' شین توزی کے پاس پہنچا اور سارا واقعہ بیان کردیا۔

شین توزی نے جواب دیا:''جب بہت سے راستے ہوں تو آدمی اپنی بھیڑ نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اسی طرح جب شاگرد طرح طرح کی دلچسپیاں اپنالیں تو محنت سے جی چرانے لگتے ہیں۔

سارے علم کا منبع ایک، مگر علم کی شاخیں بے شمار ہیں۔ انسان بنیادی سچائی کی طرف رجوع کے بعد ہی گمراہی سے بچ سکتا ہے۔ تم یانگ زی کے شاگرد ہو اور اس سے علم حاصل کرتے ہو، پھر بھی لگتا ہے تم اسے پوری طرح سمجھ نہیں پائے۔''

تحفہ

ہان تان میں رواج تھا کہ لوگ فاختائیں پکڑ کر سالِ نَو پر بادشاہ کو تحفے میں پیش کرتے تھے۔ فاختاؤں کا تحفہ پا کر بادشاہ بے حد خوش ہوتا اور تحائف لانے والوں کو خوب انعام واکرام سے نوازتا۔ کسی نے بادشاہ سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے جواب دیا: ''مَیں رحمدلی کے اظہار کی خاطر سالِ نَو پر فاختاؤں کو آزاد کر دیتا ہوں۔''

''آپ کی رعایا اس بات سے بخوبی واقف ہے، وہ فاختائیں پکڑنے میں لگی رہتی ہے۔'' معترض نے کہا۔ ''اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہت سی فاختائیں ماری جاتی ہیں۔ اگر آپ سچے دل سے فاختاؤں کو بچانا چاہتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ فاختائیں پکڑنے پر پابندی لگا دیں۔ آپ فاختاؤں کو آزاد کرنے کے لئے پکڑواتے ہیں، مگر رحمدلی آپ کے ہاتھوں ہونے والے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی۔''

بادشاہ نے معترض کی بات مان لی۔

مغرور کوچبان

ریاست چھی کا وزیرِ اعظم یئن زی ایک دن بگھی میں سوار کہیں جا رہا تھا۔ کوچبان کی بیوی نے اپنے دروازے سے جھانکا تو دیکھا کہ اس کا شوہر سینہ پھیلائے بڑے تکبر سے چار گھوڑوں والی بگھی ہانک رہا ہے۔ کوچبان گھر آیا تو بیوی نے کہا کہ وہ اس سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی ہے۔

کوچبان نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا: ''یئن زی ریاست چھی کا وزیرِ اعظم ہے اور ساری دنیا میں اس کا شہرہ ہے۔ اس کے باوجود آج میں نے دیکھا تو وہ گہری سوچ میں تھا اور اس کے چہرے مہرے سے کسی تکبر کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ تم ایک معمولی کوچبان ہو مگر بے حد تکبر وغرور میں رہتے ہو۔ یہی سبب ہے کہ میں تم سے علیحدگی چاہتی ہوں۔''

پیار

نواب شیہہ کو اژدھوں سے اس قدر پیار تھا کہ اس نے ساری حویلی میں ان کی تصویریں بنوا رکھی تھیں، بلکہ کندہ بھی کروا دی تھیں۔ آسمانوں پر اصل اژدھے کو پتا چلا تو وہ اُڑتا ہُوا نواب شیہہ کی حویلی کے سامنے اتر آیا اور دروازے سے سر اور ایک کھڑکی سے دم اندر داخل کر کے بیٹھ گیا۔ نواب شیہہ نے جب اصلی اژدھا دیکھا تو حواس باختہ ہو کر بھاگ نکلا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نواب شیہہ کو حقیقی معنوں میں اژدھوں سے پیار نہ تھا۔ اسے اصلی اژدھے نہیں، اژدھوں سے ملتی جلتی چیزیں پسند تھیں۔

دولت اور یقین

ریاست چھی کا ایک استاد تون کو چھانگ بڑا لالچی تھا۔

اسے ایک ہوس یہ بھی تھی کہ اس کے پاس دس ہزار اونس سونا جمع ہو جائے۔

ایک بے حد غریب شاگرد نے، جو تون کی یہ خواہش جانتا تھا، تون سے کچھ رقم بطورِ قرض مانگی۔

تو نگ نے انکار کرتے ہوئے کہا: ''رقم کی مجھے خود ضرورت ہے، کیونکہ اس سے مَیں سرکاری عہدہ خریدنا چاہتا ہوں۔''

شاگرد خفا ہو کر ریاست سونگ میں چلا گیا۔ مگر جانے سے قبل استاد سے کہا: ''آپ جو دولت اور عہدہ چاہتے ہیں، اس میں میرا کوئی حصہ نہیں، مَیں کہیں اور جا کر قسمت آزمائی کرنے والا ہوں۔ مجھے یقین ہے میں آپ سے پہلے ہی حصولِ مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

چھوٹا پرندہ اور دیوقامت رخ

کسی زمانے میں رخ نامی ایک پرندہ ہُوا کرتا تھا۔ اس کی پشت کوہِ تھائی جتنی اور پَر اتنے بڑے تھے کہ بادلوں کی مانند آسمان کو ڈھانپ دیتے تھے۔ جب وہ پر پھیلا کر فضا میں بلند ہوتا تو ایک طوفان سا آ جاتا۔ وہ بلندیوں پر اُڑتا ہوا ایک روز میں نوّے ہزار لی کا فاصلہ طے کر لیتا تھا۔ ایک بار وہ جنوبی سمندر تک جانے کے لئے اُڑ رہا تھا کہ نیچے ایک چھوٹے پرندے نے اسے دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا: ''یہ کہاں جا رہا ہے؟ میں سو دو سو فٹ اڑتا ہوں اور زمین پر اتر کر مزے سے جھاڑیوں میں دانا دنکا چننے لگتا ہوں۔ میرے لئے تو اتنا ہی کافی ہے۔ اسے بھی اس کے علاوہ اور کیا چاہئے؟''

ایک مردِ دانا نے یہ سُن کر کہا: ''تیری بات سے ہم بڑے اور چھوٹے نقطۂ نظر میں فرق کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

مرہم

ریاست سونگ میں ایک کنبہ پھٹے ہوئے ہاتھوں کے لئے بڑی عمدہ مرہم بناتا تھا۔ یہ کنبہ کئی نسلوں سے دھوبیوں کا کام کرتا چلا آ رہا تھا۔ ایک شخص نے اس مرہم کا سنا تو نسخے کے عوض سو اونس سونے کی پیش کش لے کر آ گیا۔

افرادِ خانہ میں بحث شروع ہو گئی۔ انہوں نے سوچا کہ ہم کئی نسلوں سے دھوبیوں کا کام کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن کبھی چند اونس سے زیادہ سونا نہ کما سکے۔ آج صرف نسخے کا سو اونس سونا مل رہا ہے۔ ہمیں نسخہ بیچ دینا چاہئے۔

ان دنوں ریاست یوئے نے ریاست وو پر حملہ کیا ہوا تھا۔ اس آدمی نے نسخہ خرید کر وو کے باشاہ کو پیش کر دیا اور بادشاہ نے خوش ہو کر اسے فوج کے بڑے عہدے پر فائز کر دیا۔ اسی سال سردیوں میں اس کی فوج نے ایک بحری لڑائی میں یوئے کی فوجوں کو تہس نہس کر دیا اور بادشاہ نے اسے جاگیر دے کر نواب بنا دیا۔

مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی مرہم سے کوئی تو جاگیر پا لیتا ہے اور کوئی محض دھوبی رہتا ہے۔ اس کا سارا دارومدار صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے والے پر ہے۔

نادان دوست

ایک بحری بگلا ریاست لو کے دارالحکومت کے نواح میں اُترا تو لو کے بادشاہ نے اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے مندر میں

ضیافت کا اہتمام کیا۔اس نے بہترین موسیقی اور اشیائے خورد و نوش کا حکم دیا' لیکن پرندہ انتہائی بے بسی کی حالت میں مغموم بیٹھا رہا۔اس نے گوشت کا ایک چوگا لیا' نہ شراب چکھی اور تین دن بعد مر گیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ اپنی پسند کے مطابق بگلے کی تواضع کرنا چاہتا تھا' نہ کہ بگلے کی پسند کے مطابق۔

اژدھا کاٹنے کا فن

چو پھینگ مان دسترخوان پر اژدھا کاٹنے کا فن سیکھنے چی لی ای گیا۔اس نے تین سال تک خاصی بڑی جائیداد بیچ کر اس فن میں دستگاہ حاصل کی' لیکن اسے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کبھی کوئی اژدھا نہ ملا۔

سوکھی جھیل میں مچھلی

چوانگ زی کو مفلسی نے آلیا تو وہ کچھ اناج ادھار مانگنے دریا کے نگرانِ اعلیٰ کے پاس گیا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں'' نگرانِ اعلیٰ نے جواب دیا۔''میں جلد ہی اپنی جاگیر سے لگان وصول کرنے والا ہوں' اس کے بعد تمہیں تین سو طلائی سکے دے دوں گا۔کہو ٹھیک ہے ناں؟''

چوانگ زی کو بے حد غصہ آیا اور جواباً اسے یہ کہانی سنا دی:''مَیں کل ادھر آ رہا تھا کہ کسی کو پکارتے سنا۔مڑ کر دیکھا تو سوکھی جھیل میں ایک مچھلی پڑی تھی۔''مچھلی! تم یہاں کیسے آ پہنچیں؟''میں نے پوچھا۔

''میں مشرقی سمندر کی رہنے والی ہوں۔کیا تم میری جان بچانے کے لئے پانی کی ایک بالٹی مہیا کر سکتے ہو؟''اس نے جواب دیا۔

''ضرور' ضرور'' میں نے کہا۔''میں جلد ہی جنوب میں ریاست وو اور ریاست یوئے کے بادشاہوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ان سے کہوں گا کہ دریائے مغرب سے کچھ پانی تمہارے لئے چھوڑ دیں۔کہو ٹھیک ہے ناں؟''

مچھلی تلملا کر بولی:''میں پانی کے بغیر مر رہی ہوں اور تم ہو کہ خالی خولی باتوں پر ٹرخا رہے ہو۔بعد میں مجھے ڈھونڈنے نکلو گے تو کسی مچھلی بازار میں پاؤ گے۔''

تین یا چار

ریاست سونگ میں ایک بندر سدھانے والا رہتا تھا۔اسے بندروں سے بہت پیار تھا اور بندر بھی بہت سے تھے۔وہ ان کا مزاج سمجھتا تھا اور بندر اس کی طبیعت سے واقف تھے۔سچ تو یہ کہ وہ اپنے کنبے کا پیٹ کاٹ کر بندروں کو پالتا تھا۔تاہم ایک وقت ایسا آیا کہ گھر میں اناج کم پڑ گیا اور وہ بندروں کا راشن گھٹانے پر مجبور ہو گیا' مگر اسے یہ خدشہ بھی تھا کہ بندر راضی نہ ہوں گے۔اس نے بندروں کو جھانسہ دینے کی ترکیب سوچی۔

''میں تمہیں تین سنگھاڑے صبح اور چار شام کو دیا کروں گا۔بتاؤ کافی رہیں گے؟''اس نے بندروں سے پوچھا' تو سارے بندر اُٹھ کر غصے سے خوخیانے لگے۔

''اچھا چلو' چار صبح اور تین شام کو کیسے رہیں گے؟''یہ سن کر بندر مطمئن ہو گئے۔

گوشۂ تحقیق

عالمی معاشی بحران

عبداللہ مسعود

حالیہ عالمی معاشی بحران کا آغاز امریکہ کی مورگیج (Mortgage) مارکیٹ سے ہوا۔ مورگیج جسے ہم رہن یا گروی کہتے ہیں، مخصوص شرح سود پر قرض لے کر بطورِ ضمانت اپنی جائیداد اس ادارے یا فرد کو، جس سے قرض لیا گیا ہو، سونپنے کا نظام ہے۔ یہ کاروبار کرنے والے بنک یا مالیاتی ادارے مورگیج ہاؤس بھی کہلاتے ہیں۔ یہ لوگوں کو گھر خریدنے کے لئے قرض دیتے ہیں۔ گھر کو رہن رکھ کر 10 یا 20 فیصد کی جزوی ادائیگی (Downpayment) اور باقی رقم سود سمیت قسطوں میں ادا کرنے کی سہولت۔

امریکہ میں کم از کم 80 فیصد گھر اسی نظام کے تحت خریدے گئے ہیں۔ اگر کوئی دس لاکھ ڈالر کا گھر خرید سکتا تھا تو وہ ایک کروڑ ڈالر کا گھر خریدتا، اس خیال سے کہ 10 لاکھ ڈالر تو خود ادا کرے گا، باقی 90 لاکھ ڈالر کا قرض لے گا۔ چنانچہ لوگوں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر گھر لئے۔ اس مورگیج مارکیٹ کا حجم (Volume) تیرہ ٹریلین ڈالر یعنی تیرہ ہزار ارب ڈالر تھا۔

شروع شروع میں گھر خریدنے والوں کی تحقیق کی جاتی کہ قسطیں ادا کرنے کے قابل ہیں بھی یا نہیں؟ 20 سے 30 فیصد لوگوں نے جو ذرا خوشحال تھے، گھر مورگیج پر لے لئے۔ جب پتہ چلا کہ مورگیج میں مزید پھیلاؤ کی گنجائش نہیں، تو سوال پیدا ہوا کہ اب سود یا منافع کس سے بٹورا جائے؟ فیصلہ ہوا کہ شرائط میں تھوڑی سی لچک پیدا کی جائے تاکہ جو ابھی تک اس مارکیٹ کا حصہ نہیں بنے، انہیں بھی اس میں لا پھنسایا جائے۔

شرائط میں لچک کے ساتھ منافع کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس پر بنک بغیر تحقیق کئے قرضے دینے لگے۔ اس صورت میں ایک نئی اصطلاح نے جنم لیا جسے ''سب پرائم مورگیج'' (Sub-prime) کہا گیا، یعنی کسی کو یہ جانے بغیر قرض دینا کہ وہ ادائیگی کی صلاحیت رکھتا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے پس منظر میں یہ سوچ کارفرما تھی کہ گھروں کی دستاویزات ہمارے پاس ہیں، اگر ادائیگی نہ بھی ہوئی تو یہ گھر ہمارا ہو جائے گا، اس کو اسی قرض سمیت کسی اور کو بیچ دیا جائے گا اور بنک کو کسی صورت نقصان نہیں ہوگا۔ نتیجتاً امریکی مورگیج مارکیٹ جس کی

مالیت تیرہ ٹریلین ڈالر تھی' اس میں دس سے بیس فیصد معلوم شدہ حصہ سب پرائم مورگیج کا ہوگیا۔

جب کسی بینک یا مورگیج ہاؤس کی سرمایہ کاری کی گنجائش ختم ہوگئی تو اس نے دوسروں کے پیسوں سے سرمایہ کاری کا سوچا۔ ان مورگیجز کا ایک بنڈل یا پورٹ فولیو بنایا گیا۔ مثلاً یہ ایک ہزار مورگیجز ہیں' ان کی قیمت اتنی ہے' ان کے بدلے ہر مہینے اتنی قسطیں اور اتنا سود یا منافع آنا ہے۔ پھر اس کے بدلے ایک بانڈ یا سیکورٹی بنا دی گئی اور وہ سیکورٹی کسی دوسرے بنک' مالیاتی ادارے یا کسی بھی ایسے شخص کو بیچ دی گئی جس کے پاس فاضل پیسہ ہے۔ اسے مورگیج بیکڈ سیکورٹی (Mortgage-backed Security) کہتے ہیں۔ اصل میں جو پیسہ مورگیج سے آتا تھا' وہ اس سیکورٹی ہولڈر کو جانے لگا اور بنک محض ایک درمیانی واسطہ یا رابطہ بن کر رہ گیا۔

افغانستان اور عراق میں امریکی فوجوں پر اخراجات بڑھے' معیشت کو جھٹکا لگا تو لوگوں کی مورگیج کی اقساط ادا کرنے کی صلاحیت متاثر ہوئی۔ وہ سارے ادارے ڈوبنے لگے جنہوں نے امریکی مورگیج مارکیٹ میں سرمایہ کاری کی تھی۔

اس بحران کی دوسری وجہ غیر یقینی صورتِ حال تھی۔ یہاں تیل کی مثال زیادہ مناسب رہے گی۔ عالمی منڈی میں تیل کی قیمت 147 ڈالر فی بیرل تک گئی اور پھر 34 ڈالر فی بیرل پر آ گری۔ تیل کی قیمت میں ایک دم اتنے اضافے اور پھر کمی کی وجہ کیا تھی؟ اس میں تیل کی حقیقی ٹریڈنگ سے زیادہ آئندہ تجارتی سودے یا معاہدے (Future Contracts) بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کاروبار میں کسی چیز کو حقیقتاً خریدے بغیر بیچ دیا جاتا ہے' اس کو مستقبل میں خریدا جاتا ہے۔ جب قبضہ لینے اور ادائیگی کا وقت آتا ہے' تو اس وقت اس کو کسی دوسرے فرد کو بیچ کر لین دین کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ اسے ڈیریویٹو (Derivative) یعنی کسی اصل سے حاصل کردہ یا آپشن (Option) کہتے ہیں۔ اس قسم کے کاروبار میں صرف علامتی یا یقینی کم سے کم (Marginal) پیسہ لگایا جاتا ہے' لیکن ٹریڈنگ پوری ہوتی ہے۔ مثلاً میں نے روپے دیئے نہیں اور معاہدہ کیا کہ آپ سے اتنے عرصے بعد ایک سو بیرل تیل خریدوں گا۔ جب خریدنے کا وقت آیا تو میں نے وہ ایک سو بیرل تیل کسی اور کو بیچ دیا۔ یہ سارا کاروبار ایک کماڈیٹی ایکس چینج (Commodity Exchange) پر ہو رہا تھا' وہ لین دین ایک دوسرے کے برابر ہوگیا اور مجھے دونوں معاہدوں کی قیمتوں کا فرق (Price differential) لینا یا دینا پڑا۔ اعداد و شمار کے مطابق آئل کی ڈیریویٹو مارکیٹ دنیا میں حقیقی آئل مارکیٹ سے چھ گنا ہے۔ یعنی جتنا تیل زمین سے نکلتا ہے' وہ لگ بھگ چھ دفعہ بکا ہوا ہے اور ہر بار اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس طرح تیل کی قیمتیں اس حد تک بڑھیں کہ پوری دنیا کی معیشت پر اثر انداز ہوئیں۔

جب گھروں' عمارتوں یا جائیداد (ریئل اسٹیٹ) کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں' تو بنکوں نے یہ دیکھے بغیر کہ کسی میں

ادائیگی کی گنجائش ہے یا نہیں' ان کو فنانس کر دیا اور اس فنانسنگ کے بدلے مورگیج بیکڈ سیکورٹی بھی بنائی۔ پورے پورے پورٹ فولیو ایک بنک نے دوسرے بینک کو بیچ دیئے' تو ان کو مورگیج مارکیٹ سب سے زیادہ منافع بخش لگی۔ لیکن جب رئیل اسٹیٹ کی قیمتیں نیچے آنا شروع ہوئیں تو بنکاروں کو احساس ہوا کہ ان کی سیکورٹی کمزور پڑنے لگی ہے۔ گھروں کی قیمت نیچے جانے لگی' تو دیوالیہ پن یعنی قرض لے کر بھاگنے یا ادائیگی سے انکار (ڈیفالٹ) کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس سے کاروبار کو دھچکا لگا' تو بے روزگاری کا سلسلہ زور پکڑنے لگا۔ جو بے روزگار ہوا' اس نے ڈیفالٹ کیا' جو بے روزگار نہیں تھا مگر ادائیگی کی گنجائش نہیں تھی' وہ بھی ڈیفالٹ ہوا اور جس کا ادائیگی کا ارادہ نہیں تھا' اس نے بھی ڈیفالٹ کیا۔ لاکھوں لوگ تھے جو ادائیگی کرنے کی نیت سے مورگیج نہیں کرواتے تھے بلکہ یہ سوچتے تھے کہ ہم نے دس لاکھ ڈالر میں ایک کروڑ ڈالر کا گھر مورگیج کرالیا ہے' اب قسطیں ادا نہیں کریں گے اور سال بعد جب گھر کی قیمت بڑھے گی' تو ایک کروڑ دس لاکھ ڈالر میں یہ گھر بیچ دیں گے۔

یہ سارا وہی سلسلہ ہے کہ کسی نے ایک چیز خریدی' صرف اس کا مارجن ادا کیا اور اس مارجن کی بنیاد پر بیچی' اسے اس پر منافع ملے گا۔ ڈیفالٹ کا سلسلہ شروع ہوا' ایک مرحلہ ایسا آیا کہ بنک معاملات کو سنبھال نہ سکے۔ تو انہوں نے جن کو مورگیج بیکڈ سیکورٹی بیچی ہوئی تھیں' وہاں انہوں نے ڈیفالٹ کیا۔ اس کے ساتھ ہی تیل کی قیمتیں بڑھیں اور دوسرے عناصر بھی ساتھ شامل ہوئے تو معیشت کی صورتِ حال خراب ہونا شروع ہوگئی۔ اس کاروبار میں کئی معاملات کی انشورنس بھی ہوئی تھی' مگر بگڑتے معاشی حالات میں انشورنس کمپنیاں بھی ڈیفالٹ کر گئیں۔

لیہمن برادرز ڈیڑھ سو سال پرانا' دنیا کے بڑے انویسٹمنٹ بنکوں میں سے ایک اور امریکہ کا تیسرا بڑا انویسٹمنٹ بنک تھا۔ ان حالات میں وہ بھی ڈیفالٹ کر گیا اور اپنے دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی۔ میرل لنچ بِک گیا۔ پھر سی یو اے تباہ ہوگیا تو یوں محسوس ہونے لگا کہ سب انویسٹمنٹ بنک اور مالیاتی ادارے ڈیفالٹ کر جائیں گے۔ بے یقینی اس قدر بڑھی کہ کوئی مالیاتی ادارہ نہ جانتا تھا کہ اس نے جو مورگیج دی ہے' اس میں سے کس کے پیسے آئیں گے اور کس کے نہیں۔ نتیجتاً

آسٹریلیا کے 39 سالہ مسٹر جولیان اسانج (Julian Asange) رازداری کے قانون کی آڑ میں سب کچھ کر گزرنے کی مخالفت کے دعوے دار ہیں۔ وہ اور ان کے ساتھی چاہتے ہیں کہ حکمرانوں، عوامی نمائندوں اور سرکاری اہل کاروں کے بارے میں عوام سے کوئی بات پردہ راز میں نہ رہے جن کے ادا کردہ ٹیکسوں سے تنخواہیں اور مراعات حاصل کرتے ہیں۔ جولیان نے 2007ء میں وکی لیکس (Wikileaks) نامی ویب سائٹ قائم کر کے دنیا بھر کی مختلف حکومتوں اور حکمرانوں کے راز کھولنا شروع کیا تو بڑی افسوس ناک، حیران کن اور دلچسپ باتیں سامنے آئیں۔ سب سے پہلا اور انتہائی اہم راز عراق کی جنگ میں امریکی انسانی جرائم کے متعلق تھا جس کی بعد میں امریکی حکمرانوں کو تصدیق کرنا پڑی۔ جولیان ایک ماہر کمپیوٹر ہیکر ہیں جو حکومتوں، حکمرانوں اور محکموں حتیٰ کہ واحد سپر پاور کے سفارتی اور دفاعی اداروں کے انٹرنیٹ سلسلوں میں گھس کر دستاویزات اڑا لیتے ہیں۔ وکی لیکس کی یہ واردات سائنس دانوں خصوصاً کمپیوٹر ماہرین کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے!

امریکی سٹاک مارکیٹ ڈوبی' امریکی بنک ڈوبے' امریکی معیشت ڈوبی حتیٰ کہ ہر وہ معیشت جو امریکہ پر انحصار کرتی تھی' ڈوبتی چلی گئی۔ پوری دنیا میں اقتصادی بے حالی پھیل گئی۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے امریکی حکومت نے سات سو بلین ڈالر کا ایک بیل آ ؤٹ پلان منظور کیا' مگر یہ ناکافی نکلا۔

پاکستان میں تصویر قدرے مختلف انداز میں ابھری۔ پاکستان کی سٹاک مارکیٹ میں کمپنیوں کی تعداد تو وہی تھی' مگر مصنوعی طریقے سے کمپنیوں کی کارکردگی بڑھائی گئی۔ مثلاً اگر مارکیٹ میں ایک سو شیئرز ہیں اور ہم سب خریدنے پہنچ جائیں تو آہستہ آہستہ ان کی قیمت طلب و رسد کے اصول کی وجہ سے بڑھنا شروع ہو جائے گی۔ بڑے بروکرز نے پیسہ کمانے کے لئے قیمتیں بڑھا دیں۔ اس سے سٹاک مارکیٹ کا انڈیکس بڑھ گیا۔ پاکستان میں کیپیٹل گین ٹیکس فری ہے' یعنی سٹاک مارکیٹ میں کوئی جتنا کمائے' اسے کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بھی یہ تصویر دکھائی گئی کہ پاکستان کی سٹاک مارکیٹ بڑی تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ ترقی کسی نئی کمپنی کے آنے سے نہیں ہوئی تھی بلکہ شیئرز کی قیمتیں بڑھنے سے ہوئی۔ جو شیئر دو سو روپے کے تھے' وہ چار سو کے ہو گئے۔ اس پر غیر ملکی سرمایہ کار بھی کھنچے چلے آئے جس سے قیمتیں اور بڑھ گئیں بلکہ حقیقی قیمتوں سے بھی اوپر چلی گئیں۔ جب حالات خراب ہونا شروع ہوئے تو غیر ملکی سرمایہ کار بھی اپنے پیسے نکالنے لگے۔ لوگوں نے شیئرز بیچنا شروع کئے تو ان کی قیمتیں تیزی سے نیچے آنے لگیں۔ مارکیٹ سولہ سترہ ہزار پوائنٹس کے انڈیکس سے گر کر نو ہزار پوائنٹس پر آ گئی اور سٹاک ایکسچینج کا ممبر شپ کارڈ جو چودہ کروڑ کا تھا' لوگوں نے سات کروڑ میں بیچ کر اپنے قرضے اتارے۔

اکثریت جو کاروبار کرتی ہے' وہ پندرہ بیس فیصد روپے اپنے ڈالتی ہے اور اسّی' پچاسی فیصد کی ادائیگی باقی رہ جاتی ہے۔ اختتامِ کاروبار (Day- end) سے پہلے لین دین ختم کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کی فنانسنگ کروائی جاتی ہے' جس کو بدلہ یا CFS کہتے ہیں۔ مثلاً اگر میں نے ایک ہزار روپے کے شیئرز خریدے اور ان کی قیمت پچاس ساٹھ روپے بڑھ گئی تو بجائے اس کے کہ پچاس ساٹھ روپے لے کر مَیں کام ختم کر دوں' میں نے اس امید پر کہ ابھی قیمت مزید بڑھے گی' بروکر سے کہا کہ مجھے اس کا بدلہ کروا دو' مَیں منافع بھی دوں گا اور کل ٹرانزیکشن بند یا ختم کروں گا۔ اس طرح بہت سے لوگوں کا پیسہ اس ٹرانزیکشن میں پھنس گیا۔ اس پر سٹاک مارکیٹ کو فریز کیا گیا جس کے تحت شیئرز کی قیمت مزید نیچے نہیں جا سکتی۔ یعنی اگر ہم ایک سو روپے کا شیئر بیچنے جائیں تو ممکن ہے وہ پچاس کا بھی نہ بکے کیونکہ یہ ایک مصنوعی پابندی (Lock) ہے۔

جب قرضے ری شیڈول کروا لئے گئے اور کچھ غیر ملکی امداد بھی مل رہی تھی' تو ڈالرز کا ان فلو یعنی داخلی بہاؤ اچھا تھا۔ کسی نے توجہ نہ دی کہ توازنِ تجارت یا بیلنس آف ٹریڈ بری طرح

سے خراب ہورہا ہے۔ بیلنس آف ٹریڈ کا مطلب ہے کہ کتنی درآمدات اور کتنی برآمدات ہورہی ہیں۔ برآمدات میں اضافہ تو نہ ہونے کے برابر تھا' مگر درآمدات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں ماس ٹرانزٹ سسٹم پر توجہ دینے کے بجائے گاڑیوں اور ائرکنڈیشنرز کی امپورٹ پر توجہ دی گئی۔ اسی وجہ سے توانائی کا بحران پیدا ہوا۔

ان چیزوں کو سپورٹ کرنے کے لئے بنکوں کی توجہ کنزیومر فنانسنگ پر رہی۔ کسی کے گھر' گاڑی یا چھوٹے موٹے اخراجات کو مختلف طریقوں سے فنانسنگ کرنے کو کنزیومر فنانسنگ کہتے ہیں۔ کنزیومر فنانسنگ سے عارضی طور پر ڈیمانڈ بڑھتی ہے اور معاشی پہیہ تیز ہوتا نظر آتا ہے مگر حقیقت میں توازنِ تجارت خراب ہو چکا ہوتا ہے ۔ جب تیل کی قیمت 50 ڈالر فی بیرل سے 147 ڈالر فی بیرل ہوگئی تو تیل درآمد کرنے کی وجہ سے ہماری معیشت پر منفی اثر پڑا۔

عالمی معیشت میں خرابی کا باعث بنے والے اسباب بیشمار ہیں' مگر اصل بات وہ ہے جو امریکہ کے فیڈرل بنک کے ایڈوائزر اور ممتاز ماہرِ مالیات ڈاکٹر کریس شیروَل نے 27 مئی 2009ء کو سی این این کو انٹرویو دیتے ہوئے کہی ۔ ان کا کہنا تھا: ''ضروری احتیاطی اقدامات کو سامنے رکھے بغیر' زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانے کے لئے بنکوں کی تباہ کُن دوڑ نے صرف امریکی اور پھر عالمی معیشت ہی کی نہیں' بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کی جڑیں بھی ہلا دی ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو اس پر انسانی' حیوانی اور نباتاتی زندگی کے لیے ہوا کے بعد سب سے اہم عامل پانی کا نظام قائم کیا۔ اس نظام کا بڑا ذریعہ دریا ہیں۔ قدرت نے دریاؤں کی گزرگاہوں پر زمین کی ساخت ہی اس طور ڈیزائن کی کہ انسان آنے والے وقتوں میں دریاؤں کی طغیانی اور ضرورت سے وافر پانی کو روک کر ذخیرہ کر سکے اور کمی کے وقت اِس ذخیرہ شدہ پانی کو استعمال کر سکے۔ آبادی بہت کم تھی تو لوگ جوہڑ بنا کر بارش کے پانی کا ذخیرہ کرتے تھے۔ آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب انسان نے آبی انجینئرنگ میں بھی ترقی کی تو اس نے دریاؤں پر ڈیم تعمیر کر کے پانی کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا اور عین اُنہی مقامات پر بند باندھے جو اللہ تعالیٰ نے اِس مقصد کے لیے تخلیق کیے تھے۔ آج ہم پانی کی کمیابی کے جس بحران سے دوچار ہیں' وہ اس حقیقت سے واضح ہے کہ 1951ء میں قوم کے ہر فرد کے لیے 5000 مکعب میٹر پانی دستیاب تھا' یہ مقدار اب 1000 مکعب میٹر فی پاکستانی رہ گئی ہے۔ جہاں تک بجلی کے بحران کا تعلق ہے' اس کی سنگینی اس سے واضح ہے کہ شہروں میں 12 سے 18 گھنٹے روزانہ اور دیہات میں لگاتار کئی کئی روز کی لوڈ شیڈنگ سے قوم کا ہر فرد' ہر گھر' ہر کھیت' ہر فیکٹری اور ہر شعبہ بُری طرح متاثر ہے۔ بجلی و پانی کا یہ بحران تھرمل پاور لابی کا پیدا کردہ ہے تاکہ مرضی کی قیمت پر تیل فروخت کرنے کی منڈی ہاتھ سے نہ نکلے۔ یہ زرعی و معاشی لحاظ سے ضرب لگا کر پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنے کی بین الاقوامی سازش ہے' تاکہ پاکستان عالمی مالیاتی اداروں کا محتاج رہے۔ ہائیڈل یعنی پانی سے بنی بجلی کی پیداوار میں اضافے سے ہی عالمی منڈیوں میں مقابلے اور اہلِ وطن کو سستی اشیاء فراہم کرنے کا سامان کیا جاسکتا ہے۔ تھرمل بجلی جب واپڈا کو 4 روپے فی یونٹ پڑتی تھی تو پانی سے بنی بجلی کی لاگت 35 پیسے فی یونٹ تھی۔ بڑے ڈیم کی تعمیر کے بغیر پاکستان کو خشک سالی اور قحط سالی کا ایتھوپیا بنانے کی سازش کو ناکام بنانا ممکن ہی نہیں...

(انجینئر شمس الملک' سابق چیئرمین واپڈا: 'روزنامہ ڈان' 14 مارچ 2010ء)

نوبل پرائز

میربابر مشتاق

نوبل انعامات سویڈن کے موجد اور صنعت کار الفریڈ نوبل (Alfred Nobel) کی وصیت کے مطابق اس کے ترکے سے دیئے جاتے ہیں۔ 1895ء میں تحریر کی گئی اس کی وصیت کے مطابق ترکے سے ایک فنڈ قائم کیا گیا۔ نوبل فاؤنڈیشن کا قیام 10 دسمبر 1896ء کو عمل میں آیا۔ نوبل کے ترکے کا انتظام سنبھالنا اور اس کی وصیت پر عملدرآمد ممکن بنانا اس فاؤنڈیشن کی ذمہ داری تھا۔ نوبل فاؤنڈیشن فنڈوں کی قانونی مالک ہے۔ یہ ان کا انتظام و انصرام کرتی ہے اور یہ انعام دینے والی تنظیموں کا جوائنٹ اینڈ منسٹریٹو ادارہ بھی ہے' لیکن نوبل فاؤنڈیشن انعام دینے کے فیصلوں پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ یہ معاملہ چار متعلقہ اداروں تک محدود رہتا ہے۔ فنڈ حاصل ہونے والی سالانہ آمدن کو انسانیت کے مفاد میں کام کرنے والوں کو سالانہ پانچ انعامات دینے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ وصیت میں طبعیات' کیمیا' فزیالوجی یا علم العلاج' ادب اور امن پانچ میدانوں میں انسانی خدمات پر پانچ انعامات مذکور تھے۔ پہلے نوبل انعامات 10 دسمبر 1901ء کو نوبل کی پانچویں برسی کے دن تقسیم کئے گئے۔ 1968ء میں بنک آف سویڈن نے ''نوبل انعام برائے اقتصادی علوم'' قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اقتصادیات پر پہلا انعام 1964ء میں دیا گیا۔

نوبل انعام کے حقداروں کا تعین کرنے کے لئے حد درجہ محنت سے تحقیقی کام کیا جاتا ہے۔ نوبل انعام کے وقار اور اعتبار کی بنیاد اسی تحقیق پر ہے۔ انعامات کا اعلان ہر سال اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں کیا جاتا ہے۔ انعام یافتگان کے انتخاب کا کام ایک سال پہلے شروع کیا جاتا ہے۔ موسمِ خزاں میں دنیا بھر کے چھ ہزار افراد کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اگلے سال کے نوبل انعام یافتگان نامزد کریں۔ ہر انعام کے لئے تقریباً ایک ہزار افراد اپنی سفارشات داخل کرتے ہیں۔ ان نامزدگان میں طبعیات' کیمیا' فزیالوجی و علم العلاج کے نوبل انعام یافتگان' انعام اور ایوارڈ دینے والے دیگر اداروں کے اراکین' علمی اکیڈمیوں کے اراکین اور مختلف یونیورسٹیوں میں تعلیم و تحقیق سے منسلک افراد شامل ہوتے ہیں۔ سفارشات بھیجنے والوں

سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی تجاویز تحریری شکل میں بھیجیں اور اپنے فیصلے کی مفصل وجوہات درج کریں۔ ذاتی نامزدگی پر مشتمل سفارش ازخود منسوخ ہوجاتی ہے۔ کسی سال کے نوبل یافتگان کے متعلق سفارشات اس سال 31 جنوری تک پہنچ جاتی ہیں۔ ہر نامزد کے کام کی اہمیت کے تعین میں ہزاروں افراد کام کرتے ہیں۔ اس کام میں کمیٹیوں سے باہر موجود ماہرین کی آراء بھی حاصل کی جاتی ہیں۔

ستمبر سے اوائل اکتوبر تک کمیٹیاں' رائل سویڈش سائنس اکیڈمی اور انعام دینے والے دوسرے اداروں کو پیش کرنے کے لیے اپنی سفارشات تیار کر لیتی ہیں۔ اگرچہ انعام دینے والے ادارے ان سفارشات کو قبول کرنے کے پابند نہیں' لیکن شاذ و نادر ہی ان سے ہٹ کر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ انعامات دینے والے اداروں میں ووٹنگ کو ہر مرحلہ پر خفیہ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان اداروں کو بہرصورت 15 نومبر تک اپنا فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ سوائے امن انعام کے' باقی سب انعام افراد کو دیئے جاتے ہیں۔ امن کا انعام اداروں کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ کسی شخص کو موت کے بعد انعام کے لیے نامزد نہیں کیا جاسکتا لیکن انعام کے لئے تجویز ہو جانے کے بعد مرنے کی صورت میں انعام انتقال کے بعد بھی دیا جاسکتا ہے۔ انعام پر نظرثانی کی اپیل نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ انعام دینے والے ادارے حکومتی اثر و رسوخ سے آزاد ہیں' اس لئے اصولی طور پر سیاسی یا سفارتی سطح پر کسی شخص کے لئے کی جانے والی کوئی کوشش کارگر نہیں ہوتی۔

ہر نوبل انعام ایک گولڈ میڈل' ایک ڈپلومے اور نقد رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔ رقم کا انحصار نوبل فاؤنڈیشن کی اس سال کی آمدن پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 1996ء میں ہر انعام میں گیارہ لاکھ بیس ہزار ڈالر کی رقم شامل تھی۔ نوبل انعام ایک شخص کو بھی دیا جاسکتا ہے اور تین اشخاص میں بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ جب انعام تین اشخاص میں تقسیم کیا جاتا ہے' تو اس کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انعام تینوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے۔ دوسری صورت میں نصف انعام ایک وصول کنندہ کو دیا جاتا ہے جبکہ باقی نصف دو میں برابر برابر بانٹ دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات انعام اگلے سال تک روک لیا جاتا ہے اور پھر بھی نہ دیا جاسکے تو اس کی رقم واپس فنڈ میں چلی جاتی ہے۔ اگر انعام کا مستحق کسی کو بھی قرار نہ دیا جائے اور نہ ہی اسے آئندہ سال کے لیے محفوظ کیا جائے' تب بھی یہی ہوتا ہے۔ اگر پچھلے سال مختص کیا گیا انعام موجود ہو تو ایک سال میں اس ذیل میں دو انعامات بھی دیئے جاسکتے ہیں۔ اگر انعام ایک مقررہ تاریخ تک قبول نہ کیا جائے تو اس کی رقم واپس فنڈ میں چلی جاتی ہے۔

انعامات لینے سے انکار کیا جاتا رہا ہے اور بعض اوقات حکومتیں بھی اپنے شہریوں کو انعام لینے سے منع کر دیتی ہیں۔ تاہم انعامات کے حقدار قرار دیئے جانے والوں کے ناموں کے آگے لکھ دیا جاتا ہے ''انعام قبول کرنے سے انکاری''۔

اگرچہ انعام قبول نہ کرنے کے محرکات مختلف ہوسکتے ہیں لیکن بیشتر اوقات اصل وجہ بیرونی دباؤ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر 1937ء میں ہٹلر نے اپنے شہریوں کو انعام قبول کرنے سے روک دیا۔ اس کی وجہ نازی حکمتِ عملی پر تنقید کے جرم میں پابندِ سلاسل صحافی Carlvon Ossietzky کو دیا جانے والا 1935ء کا نوبل انعام برائے امن تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ انعام قبول کرنے سے انکار کرنے والوں میں سے کچھ نے بعد میں صورتِ حال کی وضاحت کی اور انہیں درخواست دینے پر ڈپلومہ اور میڈل دے دیا گیا' لیکن فنڈ میں واپس چلا جانے والا نقد انعام ادا نہ کیا گیا۔ بعض اوقات نوبل کی وصیت کے معنوں میں انعام کا حقدار سامنے نہیں آپاتا' تب انعام نہیں دیا جاتا۔ مخصوص عالمی حالات کے باعث امیدوار کا تعین ممکن نہ ہوسکے' تو بھی انعام نہیں دیا جاتا۔ پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران یہی ہوا تھا۔

کسی شخص کو ایک سے زیادہ بار بھی نوبل انعام کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔ طبعیات' کیمیا' فزیالوجی یا علم العلاج 'ادب اور اقتصادیات کے انعامات کی تقریب دس دسمبر کو سٹاک ہوم میں منعقد کی جاتی ہے۔ امن انعام دینے کے لیے تقریب کا اہتمام اوسلو (ناروے) میں کیا جاتا ہے۔ انعام یافتگان اپنا انعام عموماً ذاتی طور پر وصول کرتے ہیں۔ ہر انعام یافتہ لیکچر بھی دیتا ہے۔ طبعیات' کیمیا' فزیالوجی یا علم العلاج میں دئے گئے انعامات عموماً غیر متنازعہ ہوتے ہیں۔

امن وادب کے حوالے سے انعامی فیصلوں پر اختلافی تنقید دیکھتے ہوئے اس طرح کی صورتِ حال غیر متوقع نہیں ہے۔ اس کی تازہ ترین مثال 2009ء میں امریکی صدر اوبامہ کو دیا جانے والا انعام ہے۔ اس پر اظہارِ اختلاف کرنے والوں کا کہنا ہے کہ صدر اوبامہ کے دور میں فلسطین' عراق اور افغانستان کی جنگ میں شدت آئی ہے دُور دُور تک قیامِ امن کی اُمید نظر نہیں آتی' تو انہیں نوبل پرائز کس خوشی میں دیا گیا!

انٹرنیٹ کی بائیسویں سالگرہ

22 مارچ 2011 -- World Wide Web یعنی www کی بائیسویں سالگرہ! برطانوی کمپیوٹر سافٹ ویئر جینئس ٹم برنرلی اور یورپ کی فزکس لیبارٹری CERN کے سائنسدانوں کی کاوشوں سے یہ الیکٹرانک کرامت انسانی زندگی میں رونما ہوئی۔ اس دریافت کے ساتھ ہمارا روزمرہ کا طرزِ زندگی ہی بدل گیا۔ یہ مارچ 1989ء کی بات ہے' نوجوان برنرلی نے جینوا میں اپنے سپروائزر کو ایک ڈاکومنٹ دیا جس کا عنوان تھا – Information Managment A Proposal۔ سپروائزر نے تجویز پر لکھا Vague but exciting اور CERN لیبارٹری کے سائنس دانوں کو تجویز پر کام کرنے کی ہدایت دی۔ برنرلی نے Global Hyper Text Language بنائی۔ آج Hyper Text Transfer Protocol (http) کے تحت ہی ویب سائٹ کا پتہ جانا جاسکتا ہے۔ مارچ 1990ء میں پہلا Web Browser تیار ہُوا جو بڑی حد تک وہی ہے جو آج بھی استعمال ہورہا ہے۔ 22 مارچ 1990ء کو www ٹیکنالوجی کو اس مثالی فیصلہ کے ساتھ بڑے پیمانے پر انٹرنیٹ پر مہیا کر دیا گیا کہ اسے کسی کو بھی کسی بھی قسم کی رائلٹی یا فیس کے بغیر استعمال کرنے کی اجازت ہوگی۔

(سہ ماہی سائنسی اُفق' نئی دہلی' فروری 2011ء)

ٹکٹ کہانی

سفیان ناصر خان

ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا مشغلہ ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں مقبول ہے۔ سربراہانِ مملکت سے لے کر عام انسان تک اس مشغلہ میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کے کئی فائدے ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ شوق کسی بچے کو ہو تو وہ اپنی عمر کے ابتدائی مراحل میں اپنی معلومات میں اضافہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح ڈاک کے ٹکٹ کسی بھی ملک کے ''خاموش سفیر'' ہونے کا درجہ بھی رکھتے ہیں اور بظاہر یہ کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کسی بھی ملک کی جغرافیائی، سیاسی اور معاشی معلومات کے لئے رہنما ثابت ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس کسی ملک کے کئی ڈاک ٹکٹ موجود ہیں تو آپ بآسانی اس ملک کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرسکتے ہیں۔

ڈاک کے ٹکٹ کی تاریخ سے آگہی حاصل کرنے کے لئے ہمیں ماضی میں جانا ہوگا۔ ڈاک ٹکٹ کے اجراء سے قبل خط سپردِ ڈاک کرنے سے پہلے ڈاک خرچ کی مطلوبہ رقم کی نقد ادائیگی کرنا ہوتی تھی، پھر لفافے پر مہر لگادی جاتی جس کا مطلب یہ ہوتا کہ ڈاک خرچ وصول کرلیا گیا ہے۔ اس طریقہ کار میں تبدیلی مئی 1840ء میں آئی جب برطانیہ میں ڈاک کا پہلا ٹکٹ فروخت کے لئے منظرِ عام پر آیا۔ اِس پر اُس وقت کی برطانوی ملکہ وکٹوریہ کی شبیہہ تھی۔ دنیا کے اس پہلے ڈاک ٹکٹ کے خالق برطانیہ کے پوسٹ ماسٹر جنرل رولینڈ ہل تھے۔ اس ڈاک ٹکٹ کے پیچھے بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ سر رولینڈ ہل نے ایک مقابلے کا اہتمام کرایا جس کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح برطانیہ کا پہلا ڈاک ٹکٹ پیش کیا جائے لیکن سر رولینڈ ہل کو اس وقت شدید مایوسی ہوئی جب اس مقابلے کا کوئی بھی مصوّر ان کے ذہن میں بیٹھے ہوئے خیال کو کاغذ پر منتقل کرنے میں ناکام رہا۔ مجبوراً انہوں نے ایک میڈل کو بنیاد بنایا جس پر تاجدارِ برطانیہ ملکہ وکٹوریہ کی شبیہہ تھی۔ سر رولینڈ ہل نے اس ڈاک ٹکٹ کو نقل سے بچانے کے لئے اپنے ہاتھ سے ملکہ کی شبیہہ پر لکیریں کھینچیں اور اسے منظرِ عام پر لائے۔ اس ٹکٹ کی قیمت ایک پینی تھی اور یہ سیاہ رنگ کا تھا، اس لئے ڈاک کا پہلا ٹکٹ ''بلیک پینی'' کے نام سے مشہور ہوا۔ لہٰذا ڈاک کا یہ نظام

پینی پوسٹ کے نام سے جانا جائے گا۔ اس پہلے ٹکٹ پر غلطی سے برطانیہ کا نام شائع ہونے سے رہ گیا' لیکن بعد میں یہی کوتاہی یا غلطی برطانیہ کے ٹکٹوں کی پہچان بن گئی۔ ایک طویل عرصے تک برطانیہ دنیا میں واحد ملک تھا جس کے ٹکٹوں پر ملک کا نام نہیں لکھا جاتا تھا۔ گزشتہ صدی کے آخری عشرے میں سعودی عرب نے بھی اپنے کچھ ڈاک ٹکٹوں کے لئے یہی طریقہ اپنایا۔ اس کے ڈاک ٹکٹوں پر ایک کونے میں اس کا سرکاری نشان (کوٹ آف آرمز) چھپا ہُوا ہوتا ہے۔

برطانیہ نے ڈاک خرچ کی وصولی کے لئے ڈاک کے ٹکٹ کا جو نظام متعارف کرایا' وہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی خاصا پسند کیا گیا اور کئی ملکوں نے اس طریقۂ کار کے تحت ڈاک ٹکٹوں کا اجراء کیا۔ برطانیہ کے بعد ڈاک کا دوسرا ٹکٹ فروری 1842ء میں امریکہ کے شہر نیویارک سے شائع کیا گیا۔ اس ڈاک ٹکٹ پر جارج واشنگٹن کی تصویر تھی۔ درحقیقت یہ ٹکٹ امریکی حکومت نے سرکاری طور پر جاری نہیں کیا تھا بلکہ نیویارک میں ڈاک کا انتظام سنبھالنے والے ایک نجی ادارے نے دو سینٹ کی مالیت کا یہ ٹکٹ متعارف کرایا تھا۔ امریکی حکومت نے 1844ء میں باقاعدہ طور پر اپنا ڈاک ٹکٹ جاری کیا۔ اس کے بعد برازیل' ماریشس' باویریا' فرانس' بلجیم' سوئٹزرلینڈ' جاپان اور چین وغیرہ نے اپنے اپنے ڈاک ٹکٹوں کا اجراء کیا۔

ایشیا کا پہلا ٹکٹ

ایشیا میں سب سے پہلے ڈاک کے ٹکٹ جاری کرنے کا اعزاز موجودہ پاکستان بالخصوص سندھ کو حاصل ہوا ہے۔ یہ ٹکٹ 1852ء میں سرخ' سفید اور نیلے' تین علیحدہ علیحدہ رنگوں میں شائع کیے گئے۔ برِاعظم ایشیا کا یہ پہلا ڈاک ٹکٹ ''سندھ ڈاک'' کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ٹکٹ آدھا آنہ کا تھا جو اُس وقت کے سندھ کے کمشنر سر بارٹل فیرئر کی محنت اور لگن سے وجود میں آیا۔ سندھ ڈاک کے اجراء کے ایک سو سال مکمل ہونے پر 1952ء میں حکومتِ پاکستان نے تین آنے کا ایک یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا جس پر سندھ ڈاک کے ٹکٹ کی شبیہہ تھی۔

نرالی شکلیں

ڈاک کے ٹکٹ عموماً مستطیل شکل کے ہوتے ہیں لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ جیومیٹری کی تقریباً ہر شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں مربع' مثلّث' گول' بیضوی' ہشت پہلو اور ہیرے سے مشابہ ٹکٹ شامل ہیں۔ دنیا کے پہلے تکونے ڈاک ٹکٹ ستمبر 1853ء میں جنوبی افریقہ سے شائع ہوئے تھے اور ان کی قیمت ایک اور چار پنس تھی۔ جہاں تک ان ٹکٹوں کے تکون ہونے کا تعلق ہے' تو اس زمانے میں جنوبی افریقہ میں ایک بڑی تعداد کم تعلیم یافتہ افراد کی تھی اور انہی افراد کی سہولت کے پیشِ نظر تکونے ٹکٹ شائع کیے گئے تھے تاکہ خطوط کی چھانٹی میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ واضح رہے کہ برِاعظم افریقہ کی کسی مملکت کا پہلا ڈاک ٹکٹ یہی تھا۔ بعد میں دنیا کے کئی ممالک نے تکونے ٹکٹ جاری کیے۔

نواسکوٹیا نے ستمبر 1851ء میں تین پنس، چھ پنس اور ایک شلنگ کی مالیت کے ڈاک ٹکٹ متعارف کرائے۔ڈاک کے اُن ٹکٹوں کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ہیرے کی شکل کے تھے۔ ان ٹکٹوں میں پھولوں کے درمیان شاہی تاج کو نمایاں جگہ دی گئی تھی۔اسی طرح دنیا کا پہلا بیضوی ڈاک ٹکٹ ہندوستان کی ریاست بہور سے 1879ء میں جاری کیا گیا تھا۔وہ ٹکٹ سرخ رنگ کا تھا جس کی قیمت آدھا آنہ تھی۔1964ء میں سیرالیون نے ایک ایسا ڈاک ٹکٹ جاری کیا جو اس ملک کے نقشے کی شکل کا تھا۔ٹونگا نامی ملک نے ڈاک ٹکٹوں میں مزید جدّت پیدا کرتے ہوئے گول شکل کا ٹکٹ متعارف کرایا جو خاصا مقبول ہوا۔

اتنے بڑے سائز کے ٹکٹ بھی جاری ہوتے ہیں کہ انہیں استعمال کرنے کے لئے بڑے سائز کے لفافے درکار ہوتے ہیں۔ایسے ٹکٹ جاری کرنے والے ملکوں میں ہنگری سرِ فرست ہے۔جہاں تک دنیا کے سب سے بڑے ڈاک ٹکٹ کا تعلق ہے، تو وہ چین کا ہے جو 1913ء میں شائع کیا گیا۔اس ڈاک ٹکٹ کا سائز 247.5x69.8 ملی میٹر تھا اور وہ پانچ حصوں پر مشتمل تھا۔اسی طرح دنیا کا سب سے چھوٹا ڈاک ٹکٹ جنوبی امریکہ کے ملک کولمبیا نے جاری کیا۔وہ دو ٹکٹ ہیں اور ان کا سائز 8x9.5 ملی میٹر ہے۔

عالمی ریکارڈ کی اندرونی کہانی

دنیا کا سب سے قیمتی ڈاک ٹکٹ گیانا (سابق برٹش گیانا) کا ہے جو ''ون سینٹ بلیک اون میگنیٹا'' کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔وہ ٹکٹ 1856ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس کی طباعت کے پسِ پردہ دلچسپ کہانی ہے۔ہُوا یوں کہ اس وقت وہاں جو ٹکٹ جاری تھے، ان کے ذخیرے میں کمی واقع ہوگئی۔اس لئے جارج ٹاؤن کے پوسٹ ماسٹر نے ایک طباعتی ادارے سے ایک اور چار سینٹ مالیت کے ڈاک ٹکٹ چھپوائے جو اصل ٹکٹوں کی نقل تھے۔اس طرح ٹکٹوں کی وقتی کمی پر قابو پالیا گیا۔1873ء میں ایک طالب علم کو اپنے خاندان کے پرانے خطوط میں سے ایک خستہ حال ٹکٹ ملا جس پر اس کے سنِ اجراء (1856ء) کی مہر لگی ہوئی تھی۔اس طالب علم نے یہ ٹکٹ ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے ایک شخص میکی نون کو چھ شلنگ کے عوض فروخت کر دیا۔جب یہ راز کُھلا کہ وہ ٹکٹ ہنگامی بنیاد پر شائع ہُوا تھا، تو اس کی قیمت بڑھتی چلی

بھوٹان میں 1973ء میں گلابوں کے ڈاک ٹکٹ کا سیٹ رائج کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی، تو خاص اہتمام کیا گیا کہ یہ ڈاک ٹکٹ ایسے کاغذ پر شائع ہوں جن میں گلاب کی خوشبو رچی بسی ہو۔یہ تجربہ کامیاب رہا۔لوگوں کی بڑی تعداد نے اس طرز کے ڈاک ٹکٹوں کو پسند کیا۔ڈاک کے ٹکٹوں میں جدت پیدا کرنے کی غرض سے حکومتِ بھوٹان نے ''بولتے ڈاک ٹکٹ'' بھی متعارف کرائے۔''بولتے ڈاک ٹکٹ'' کے ایک سیٹ میں سات ڈاک ٹکٹ شامل تھے جو گراموفون ریکارڈ کی شکل کے تھے۔اس ٹکٹ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ ریکارڈ باقاعدہ بجایا جاسکتا تھا۔اس میں قومی ترانے کے ساتھ ساتھ بھوٹان کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی تھی۔

(تنویر احمد خان: ''چھوٹا ملک، بڑے کام''، ڈیلی نیشن لاہور، 13 جون 2010ء)

گئی اور وہ پہلے سے زیادہ قیمت میں فروخت ہونے لگا۔ 1980ء میں امریکہ کے شہر نیو یارک میں اس ٹکٹ کا نیلام ہوا' تو اس کی بولی 8 لاکھ پچاس ہزار امریکی ڈالر لگی جو ایک عالمی ریکارڈ ہے۔

سب سے زیادہ مالیت کا ڈاک ٹکٹ 1925ء میں افریقی ملک کینیا نے شائع کیا۔ سرخ اور سیاہ رنگ کے اس ٹکٹ پر انگلستان کے بادشاہ جارج پنجم کی شبیہہ تھی۔ اسی طرح سب سے کم مالیت کے ڈاک ٹکٹ کا تعلق یورپ کے ملک ہنگری سے ہے۔ وہ ٹکٹ 1946ء میں شائع کیا گیا تھا' اس کی قیمت صرف تین ہزار پینگو تھی۔

انوکھے تجربے

دنیا کے مختلف ممالک نے ڈاک ٹکٹوں کے سلسلے میں بے شمار تجربات کیے ہیں۔ دیکھا جائے تو ان ٹکٹوں کی اشاعت صرف کاغذ تک محدود نہیں رہی ہے۔ اب دھات' پلاسٹک' سلک ریان وغیرہ پر شائع ہونے والے ڈاک ٹکٹ بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ اس ضمن میں بھوٹان کے ڈاک ٹکٹ قابلِ ذکر ہیں جو اپنی منفرد و مختلف طباعت کے باعث بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ حکومتِ بھوٹان نے پلاسٹک' دھات اور سلک ریان پر بھی ڈاک ٹکٹ چھاپے ہیں۔

مناکو' پٹ کیرن آئی لینڈ' بھوٹان وغیرہ کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جو اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ تعداد میں ڈاک ٹکٹ چھاپتے ہیں۔ ان ملکوں کے ٹکٹ رنگا رنگ اور مختلف موضوعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ ملک ٹکٹ جاری کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ عام خیال تو یہ ہے کہ ان ملکوں کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ڈاک کے انہی ٹکٹوں کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے۔ بعض ایسے ملک بھی ہیں جن کا نام دنیا کے نقشے میں تلاش کرنے کی کوشش کریں تو شاید ہی کامیاب ہوسکیں' لیکن یہ ملک اتنی بڑی تعداد میں ڈاک ٹکٹ شائع کرتے اور بیچتے ہیں کہ کوئی بڑا ملک کیا کرتا ہوگا۔ مثال کے طور پر جزیرہ پٹ کیرن ایک برطانوی نو آبادی ہے۔ اس کا کُل رقبہ صرف اٹھارہ مربع میل اور کُل آبادی تقریباً 61 نفوس پر مشتمل ہے' لیکن ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے بیشتر افراد کی البم میں اس مختصر سے جزیرے کے اَن گِنت ٹکٹ موجود ہوتے ہیں۔

حیران کُن باتیں

ابتدائی دور میں ڈاک کے جو ٹکٹ متعارف کروائے گئے' ان کا بنیادی مقصد یہی تھا کہ ڈاک خرچ ان ٹکٹوں کے ذریعے وصول کیا جائے' لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ ڈاک کے ٹکٹ چونکہ بہت زیادہ لوگوں کے استعمال میں آتے ہیں اور بہت بڑی تعداد ان ٹکٹوں کو دیکھتی ہے اس لئے انہیں اپنے ملک کے تعارف' بعض مقامات سے لوگوں کو رُوشناس کرانے اور کسی پیغام کی تشہیر کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختلف ممالک نے یادگاری ٹکٹوں کے اجراء میں اپنی دلچسپی ظاہر کی اور اس وقت تک کئی ایسے ڈاک ٹکٹ جاری ہو چکے ہیں جن میں خوبصورت مناظر' قابلِ احترام شخصیات اور

مختلف کھیلوں کے مقابلوں کو نمایاں جگہ دی گئی ہے اور اسی وجہ سے لوگوں میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق پروان چڑھا ہے۔ یہ مشغلہ پہلے ڈاک ٹکٹ کے اجراء کے تقریباً دس سال بعد ہی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں اب ڈاک ٹکٹوں کے باقاعدہ عجائب گھر قائم ہیں۔ ڈاک کے ٹکٹوں کا پہلا عجائب گھر جرمنی کے شہر برلن میں 1872ء میں قائم ہوا۔ دورِ حاضر میں ان عجائب گھروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے اور ایسے ایسے جدید وضع کے عجائب گھر معرضِ وجود میں آئے ہیں جہاں اکثر و بیشتر نایاب ڈاک ٹکٹوں کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ 1941ء میں لندن کے روزنامہ ٹائمز نے ایک خاتون کی طرف سے اشتہار شائع کیا۔ اس میں اخبار کے قارئین سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ انہیں ڈاک کے استعمال شدہ ٹکٹ بھیجیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان رنگ برنگ ٹکٹوں کے ذریعے وہ اپنے کمرے کی دیوار سجانا چاہتی ہیں۔ اسی طرح 1965ء میں ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے والے ایک صاحب ریگلنا لڈفلپس نے نجی طور پر لندن میں ڈاک ٹکٹوں کا ایک میوزیم قائم کیا۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہاں ٹکٹوں کا بہترین ذخیرہ موجود ہے۔

دنیا بھر میں ڈاک ٹکٹوں کا بہترین ذخیرہ کس کے پاس ہے؟ اس کے متعلق حتمی رائے نہیں دی جا سکتی کیونکہ ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والے اپنے ٹکٹوں کی تفصیلات سے کم ہی کسی کو آگاہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے انتقال کے بعد ہی ان کے ٹکٹوں کے ذخیرے کے بارے میں اطلاعات منظرِ عام پر آتی ہیں۔ بہرحال ڈاک ٹکٹوں کے بڑے اور اچھے ذخیرے جن لوگوں کے پاس تھے، ان میں مصر کے شاہ فاروق، برطانیہ کے شاہ جارج پنجم، فرانس کے فلپ فیراری، برونئی کے سلطان (موجودہ سلطان برونئی کے والد) اور پاکستان کے نواب بہاولپور کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نواب بہاولپور کے ٹکٹوں کا ذخیرہ اس لحاظ سے

پاکستان کا چوتھا ابتدائی ٹکٹ مصوّرِ مشرق عبدالرحمٰن چغتائی نے تخلیق کیا تھا۔ ایک روپے مالیت کے اس ڈاک ٹکٹ پر خوب صورت پتیوں کے ڈیزائن میں ''پاکستان'' تحریر تھا۔ اس ٹکٹ کا شمار دنیا کے دس خوب صورت ترین ڈاک ٹکٹوں میں کیا گیا جو ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ پاکستان کی پہلی مکمل ڈاک سیریز وطنِ عزیز کی پہلی سالگرہ پر 14 اگست 1948ء کو پیش کی گئیں۔ ان میں شامل چاند تارے والا ٹکٹ وہ واحد ٹکٹ ہے جس کا ڈیزائن قائدِاعظم محمد علی جناحؒ نے ذاتی طور پر منظور کیا تھا۔ اسی طرح 1976ء میں قائدِاعظمؒ کے صدسالہ جشنِ پیدائش کے موقع پر پاکستان کے تخلیق کاروں نے ڈاک ٹکٹوں میں مزید ندرت اور جدت پیدا کرتے ہوئے دس روپے مالیت کا ایک خصوصی ٹکٹ تیار کیا۔ اس میں قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی شبیہہ کو بڑی خوبصورتی اور مہارت سے اجاگر کیا گیا۔ یہ سلک اسکرین کے طریقۂ کار کے تحت چھاپا جانے والا دنیا کا پہلا ڈاک ٹکٹ ہے۔ اس میں 23/24 قیراط سونے کا 25 ملی گرام پاؤڈر بھی استعمال کیا گیا۔

(بشکریہ: ماہنامہ رابطہ، کراچی، دسمبر 1985ء)

منفرد ومختلف خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں ایسے ٹکٹ بڑی تعداد میں تھے جن میں کوئی نہ کوئی غلطی رہ گئی تھی۔ ان کے ٹکٹوں کا یہ ذخیرہ بھاری رقم کے عوض فروخت کر دیا گیا۔

1840ء سے 1857ء کے دوران جاری کئے جانے والے بیشتر ڈاک ٹکٹ نادر ونایاب ہونے کا درجہ رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان میں سے بہت سے ٹکٹوں کی قیمت لاکھوں روپے سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جن کے پاس اس دور کے ڈاک ٹکٹ موجود ہیں۔ برطانیہ اور جرمنی میں ڈاک ٹکٹ جمع کرنے والوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ خیال ہے کہ یہاں ہر دوسرا یا تیسرا شخص ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کے مشغلے سے وابستہ ہے۔

پاکستان اور ڈاک ٹکٹ

دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ڈاک ٹکٹ بڑی تعداد میں جاری کئے جاتے ہیں۔ ان کے ذریعے پاکستان اپنی ثقافت اور ترقی کی عکاسی میں پیش پیش ہے۔ پاکستان کے ٹکٹوں کی رنگارنگ طباعت اور دیدہ زیب نقش ونگار اسے دیگر ممالک کے ٹکٹوں سے ممتاز بنائے ہوئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ڈاک کا نظام قائم کر دیا گیا تھا۔ ابتداء میں پاکستان میں صرف 3,036 ڈاک خانے تھے جو کہ بڑے شہروں اور قصبوں میں ہی قائم تھے۔ پاکستانی ٹکٹوں کی چھپائی جس سیکورٹی پرنٹنگ پریس میں ہونا تھی، قیامِ پاکستان کے باعث وہ بھارت کی تحویل میں چلا گیا۔ یکم اکتوبر 1947ء کو غیر منقسم ہندوستان کے ڈاک ٹکٹوں پر لفظ ''پاکستان'' کی طباعت ہوئی اور پھر اگلے کئی ماہ تک یہی ٹکٹ زیرِ استعمال رہے۔ اسی دوران پاکستان ڈاک کے نظام کے بین الاقوامی ادارے ''یونیورسل پوسٹل یونین'' سے وابستہ ہوگیا۔

پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ لندن میں واقع ایک ادارے ٹامس ڈی لارو میں شائع کئے گئے۔ یہ 9 جولائی 1948ء کو منظرِ عام پر آئے۔ چار مختلف ڈیزائن کے یہ ٹکٹ پچیس پچیس لاکھ کی تعداد میں چھاپے گئے۔ ان پر قومی علامت چاند تارا اور ''پاکستان زندہ باد'' کے الفاظ تحریر تھے۔ تنسیخی مہر پر بھی یہی الفاظ کندہ تھے۔ ڈیڑھ آنے، ڈھائی آنے اور تین آنے مالیت کے یہ ڈاک ٹکٹ مصور رشید الدین اور محمد لطیف نے ڈیزائن کئے تھے۔

پاکستان کے پہلے دارالحکومت کراچی میں 10 اپریل 1952ء کو ''پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ پریس'' کا افتتاح کیا گیا۔ یہ پرنٹنگ پریس ٹامس ڈی لارو کے تعاون سے قائم کیا گیا تھا۔ اس میں حکومتِ پاکستان کا حصہ ساٹھ فی صد اور ٹامس ڈی لارو کا چالیس فی صد تھا۔ یہاں ڈاک ٹکٹ سمیت کرنسی نوٹ، پاسپورٹ، چیک، پرائز بانڈ، سیونگ سرٹیفکیٹس اور دیگر خفیہ دستاویزات چھاپی جاتی تھیں۔ 1971ء میں اس ادارے کو قومی ملکیت میں لے کر ''پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن'' کا نام دیا گیا۔ یہاں شام، ایران اور انڈونیشیا کے کرنسی نوٹوں کے علاوہ کئی ممالک کے ڈاک ٹکٹ بھی چھاپے جاتے ہیں۔

متفرقات

• پنڈورا باکس • آکوپنکچر • فلوٹیلا • ویٹ • ڈرون • شناختی نشان

عام بات چیت اور علمی تحریر و تقریر میں ایسے الفاظ اور تراکیب بکثرت زیرِ استعمال ہیں جو سننے اور پڑھنے کی حد تک تو مانوس ہیں مگر ان کے حقیقی پس منظر سے آگہی صاحبانِ علم تک محدود ہے۔ اس مضمون میں ایسے ہی چند عناوین پیش کئے جا رہے ہیں۔ اس نوعیت کی تحریریں آپ کے مطالعے میں آئیں، تو مستند حوالے کے ساتھ نسٹیئن کے انگریزی یا اُردو حصے کے لئے بھجوایئے۔ آپ کے تذکرے کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں گی

پنڈورا باکس

پنڈورا یونانی دیومالا میں ایک کردار کا نام ہے جو عورت ہے۔ دیومالائی کہانی کے مطابق پرومیتھیس نے دیوتا زیوس کے ساتھ ایک دھوکہ کیا تھا اور آسمانوں سے آگ چُرا کر بنی نوعِ انسان کو دی تھی جس کی سزا کے طور پر زیوس نے حکم دیا کہ آگ جلانے کا فن بنی آدم سے چھین لیا جائے مگر پرومیتھیس نے زیوس کے حکم کے برعکس آگ جلانے کا فن خفیہ طور پر واپس اولادِ آدم تک پہنچا دیا۔ طیش میں آئے زیوس نے ہفاسٹس کو حکم دیا کہ ایک خاتون کی تخلیق کرے تا کہ اولادِ آدم کو سزا دی جا سکے۔ دیومالا کے مطابق ہفاسٹس نے مٹی سے کائنات کی پہلی عورت پنڈورا تخلیق کی، جس کو ایک بڑا مرتبان نما برتن دیا گیا۔ زیوس نے اسے ہدایت کی کہ اس مرتبان کو کبھی نہ کھولے۔ ساتھ ہی ساتھ پنڈورا کو حد درجہ تجسس اور شوقِ تحقیق بھی ودیعت کیا گیا تھا۔ اس کے باعث اس نے اپنے مرتبان یا باکس کو کھول ڈالا جس پر اس میں موجود تکالیف، آلام، دُکھ، درد، بیماریوں، جرائم، آفات، بُرائیوں، مشقتوں اور اموات نے انسانوں پر حملہ کر دیا جن سے وہ اس سے قبل یکسر ناواقف تھے۔ دیومالا کے مطابق پنڈورا باکس کے کھولنے کی وجہ پنڈورا کی بدنیتی کی بجائے اس کا تجسّس تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اس کو احساس ہوا کہ اس کے ہاتھوں نوعِ انسان پر کیسی آفت نازل ہوگئی ہے تو اس نے فوراً اپنا مرتبان یعنی باکس بند کر دیا۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ باکس میں جو چیز باقی بچی، وہ امید تھی۔ اس کہانی نے انگریزی ادب میں Pandora's Box کا اضافہ کیا۔ اس کے اصطلاحی معنی ہیں ''غیر متوقع اور گمبھیر مسائل کا منبع۔''

آکوپنکچر

چین کے اس کلاسیکی طریقِ علاج کی تاریخ ساڑھے چار ہزار سال سے بھی پرانی ہے۔ یہ طریقِ علاج روایتی، فطری اور روحانی غلاف میں لپٹا ہُوا ہے۔ آکوپنکچر لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی سوئی چبھونا کے ہیں۔ اس طریقِ علاج میں جسم

کی بیرونی سطح پر موجود خاص پوائنٹس کو سوئی لگا کر تحریک دی جاتی ہے' اس سے مریض کو درد نہیں ہوتا' حتیٰ کہ بعض دفعہ بوڑھے مریضوں کو آکوپنکچر علاج کے دوران اتنا سکون محسوس ہوتا ہے کہ وہ سو جاتے ہیں اور تروتازہ ہو کر اٹھتے ہیں۔ یہ علاج ہر جگہ' ہر وقت دستیاب ہوسکتا ہے' یہاں تک کہ اگر آکوپنکچر نیڈل دستیاب نہ ہو تو آکوپنکچر کرنے کا ماہر اپنے ہاتھ کے ناخن کے دباؤ (آکوپریشر) سے بھی مطلوبہ نتائج حاصل کر کے کسی کی جان بچا سکتا ہے۔ حادثات کے ان زخمیوں کو جنہیں طبی امداد اور انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہو' ہسپتال پہنچنے تک ابتدائی طبی امداد کے طور پر آکوپنکچر سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ آثارِ قدیمہ سے ملنے والے نقشہ جات اور اوزار اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ طریقِ علاج اس وقت شروع ہوا جب لوگ غاروں میں رہتے تھے اور پتھروں' جانوروں کے سینگوں اور نوک دار لکڑیوں کو انسانی جسم میں چبھو کر بیماریوں کا علاج کرتے تھے۔

1971ء میں کئی امریکی ڈاکٹروں نے چین جا کر کلاسیکی آکوپنکچر طریقِ علاج کی کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آکوپنکچر طریق علاج کو اب امریکہ میں بھی سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ اب یہ علاج پوری دنیا میں مقبول ہو چکا ہے۔ اس سے صرف امراض کا علاج ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس سے اِنس تھیز یا بھی دیا جاتا ہے۔ یعنی جب مریض کی جراحی کرنا ہو تو آکوپنکچر کی سوئیاں لگا کر آپریشن کے لئے مطلوبہ جگہ سُن کر دی جاتی ہے اور سرجن با آسانی آپریشن کر لیتا ہے' لیکن مریض ہوش میں رہتا ہے۔

کلاسیکل آکوپنکچر طریقِ علاج کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی جسم میں گردش کرنے والی توانائی چی (CHI) یعنی روح کی کمی بیشی سے پیدا ہونے والا بگاڑ بیماری کا سبب بنتا ہے۔ اس علاج کی بنیاد قدیم چینی نظریے کے مطابق کائنات میں موجود قوتیں ہیں۔ ایک قوت منفی ہے جسے ین (YIN) کہا جاتا ہے اور دوسری مثبت جو ینگ (YANG) کہلاتی ہے۔ کسی بھی ایک قوت کی کمی یا زیادتی ان دونوں قوتوں کے درمیان توانائی کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ یہ زیادتی یا کمی ہی بیماری ہے۔ انسانی جسم میں موجود 361 نمایاں آکوپنکچر پوائنٹس میں سے متعلقہ پوائنٹس پر سوئی چبھو کر تحریک دینے سے اندرونی توانائی یعنی چی کی کمی و زیادتی کو کنٹرول کر کے متوازن کیا جاتا ہے۔

فریڈم فلوٹیلا

غزہ کے علاقے میں آباد 15 لاکھ فلسطینیوں میں مسلمان' عیسائی اور یہودی سبھی شامل ہیں۔ ان سب کا صرف ایک قصور ہے کہ قومی لحاظ سے یہ سب کے سب فلسطینی ہیں اور اسرائیل کے نام پر اپنی سرزمین پر اگنے والے ناسور کا وجود تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ غزہ کی پٹی کی سرحد اسرائیل کے علاوہ صرف مصر سے ملتی ہے۔ 2006ء میں غزہ میں ہونے والے انتخابات میں اسرائیل کی ازلی دشمن حماس کی فتح نے اسرائیلی حکومت کو چکرا کر رکھ دیا۔ اس نے غزہ پر اقتصادی پابندیاں عائد کر کے علاقے کی بحری ناکہ بندی کی' تو خود عرب ممالک' جن میں مصر

پیش پیش رہا' اسرائیل سے بھی بڑھ کر علاقے کی ناکہ بندی میں حصہ دار بنا جسے غزہ میں ہونے والی غیر انسانی ہلاکتوں کا اسرائیل سے زیادہ ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ لوگوں نے غزہ سے ملنے والے مصری علاقے میں سرنگیں کھود کر سپلائی بحال کی تو مصر نے اپنی سرحد پر 90 فٹ گہری اور 18 فٹ چوڑی فولادی دیوار تعمیر کر کے یہ سلسلہ بلند کر دیا۔

2006ء سے اب تک غزہ کے محصورین کے لیے جو امداد اقوام متحدہ کے ذریعے سپلائی ہو رہی ہے' وہ ناکافی ہے۔ ان کی حالت زار کے پیش نظر مختلف بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں نے ''فری غزہ موومنٹ'' کے نام سے ایک تحریک کا آغاز کیا جس کے محرکین میں ممتاز سکالر نوم چومسکی کا نام بھی آتا ہے۔ اس تحریک کے زیر اہتمام پہلی بار اگست 2008ء میں غزہ کے متاثرین کو امدادی سامان کی دو کشتیاں روانہ کی گئیں لیکن اسرائیل نے انہیں راستے میں روک لیا۔ یہ امدادی سامان بھیجنے والی انسانی حقوق کی علمبردار تنظیموں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ ساتھ یہودی تنظیمیں بھی شامل تھیں۔ اسرائیل نے اس امدادی کھیپ کو ضبط لیا۔ اکتوبر 2008ء میں 26 افراد پر مشتمل مختلف تنظیموں کے نمائندہ وفد نے امدادی سامان کی کھیپ سے لدی کشتی غزہ کی بندرگاہ تک لے جانے کی کوشش کی جسے ابتدا میں روک لیا گیا' بعد ازاں اسے لنگر انداز ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ تمام 26 افراد کو حراستی تحویل میں لے لیا گیا' عالمی مداخلت پر انہیں رہائی نصیب ہوئی۔

31 مئی 2010ء کو فریڈم فلوٹیلا کے پرچم تلے چھ بحری جہازوں کا جو قافلہ غزہ کی بندرگاہ سے دور کھلے پانیوں میں اسرائیلی کمانڈوز کی جارحیت اور دہشت کا شکار ہوا' اسے روانہ کرنے کی تیاریاں ایک سال سے ہو رہی تھیں۔ اس قافلے میں امریکہ' برطانیہ' اسرائیل' ترکی اور جرمنی سمیت 37 ممالک کے امدادی کارکنوں' سابق سفارت کاروں' ممتاز صحافیوں' اراکین پارلیمنٹ اور نمایاں مفکرین سمیت آٹھ سو افراد شامل تھے۔ فلوٹیلا کا اہتمام کرنے والوں میں ترکی کی انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیم ''آئی ایچ ایچ'' جو ایک سو ممالک میں امدادی خدمات فراہم کر رہی ہے' کے ساتھ ساتھ ''فری غزہ مومنٹ'' نے بھی حصہ لیا۔ فریڈم فلوٹیلا میں دونوں تنظیموں کے تین تین جہاز شامل تھے جن میں دو کروڑ ڈالر کی مالیت کا دس ہزار ٹن امدادی سامان لے جایا جا رہا تھا۔ جس میں خوراک' ادویات' بچوں کے کھلونے' لباس اور تعمیرات کا سامان شامل تھا۔ فریڈم فلوٹیلا کی قبرص سے غزہ روانگی کی خبریں سرسری طور پر یا اطلاعاً نشر ہوئیں۔ لیکن جب بیڑے کے سب سے بڑے جہاز ''ماوی مرمرا'' پر اسرائیلی کمانڈوز نے حملہ کر دیا تو پھر ایکدم یہ خبر بریکنگ نیوز بن گئی۔ اسرائیلی کمانڈوز نے قافلے میں شامل تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا جبکہ ابتدائی طور پر بولے گئے ہلّے میں فائرنگ سے 22 افراد کو ہلاک اور درجنوں کو زخمی کر دیا۔ پہلے مرحلے میں بحری جہاز کو ہی جیل خانہ بنا دیا گیا اور کسی کو اپنی جگہ سے ہلنے تک کی اجازت نہ دی۔ قافلے

میں شامل برطانوی اخبار ''گارڈین'' کے نمائندے نے اس حوالے سے خبر دی کہ اسرائیلی کمانڈوز نے جن لوگوں کو ہلاک کیا' ان میں سے اکثر کے سر کی پچھلی جانب بہت قریب سے گولی ماری گئی تھیں۔ ان ہلاک شدگان میں ایک امریکی نوجوان بھی تھا جسے پیٹ میں گولیاں ماری گئی تھیں' اس کی شناخت ہوجانے کے باوجود اسے طبی امداد کے لیے نہ بھجوایا گیا کیونکہ وہ یہودی نہیں بلکہ عیسائی تھا... پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق نوجوان کی لاش پر فوجی بوٹوں کی ضربوں کے نشان تھے...'' (3 جون 2010ء)

بے شک فلوٹیلا کا خیال سمندری محاصرہ توڑنے کا ذہانت سے بھرپور اقدام تھا۔ جس نے پوری دنیا میں اسرائیل کا چہرہ کالا کر دیا۔ معروف اسرائیلی اخبار ''بدیعوت احرونوت'' کا فلسطین اور مسلمان دشمن ایڈیٹر سمڈار بیری بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوگیا..''فلوٹیلا والے جیت گئے' حماس جیت گئی' ہم ہار گئے... دنیا کی کوئی طاقت سمندری بارودی سرنگوں (نئے آنے والے امدادی بحری قافلوں) کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اگر کسی کو پاگل پن کا دورہ نہیں پڑا تو اسے آنے والی ہولناک جنگ پر غور کرنا چاہیے... علاقے میں مستقل امن کا قیام ناکہ بندی سے نہیں' فلسطینیوں کی الگ ریاست کے قیام ہی سے ممکن ہے۔ (20 جون 2010ء)۔ اِس واقعہ پر ترکی کی حکومت اور عوام نے ایمان افروز ردِعمل کا اظہار کیا ہے۔ ترک وزیراعظم طیب اردگان نے پارلیمنٹ میں کہا ''اسرائیل کسی اور کا عادی ہے' ہم اِس کا عملی جواب دیں گے' مسلمانوں خدا کیلئے اپنے مظلوم فلسطینی بھائیوں کی آزادی کیلئے نکلو۔ اب امدادی سامان کا قافلہ لے کر میں خود جاؤں گا' ناکہ بندی کی غنڈہ گردی ختم ہونی چاہیے۔'' (جسارت' 4 جون 2010ء)

ویکلی "ٹائم" کے سالانہ آن لائن پول میں ترک وزیر اعظم اس جرات مندانہ اقدام پر سال 2010ء کی دوسری بااثر ترین عالمی شخصیت قرار پائے۔ وکی لیکس کے بانی جولیان اسانج پہلے نمبر کے حقدار ٹھہرے (بی بی سی اردو سروس، لندن، 16 دسمبر 2010)

آر جی ایس ٹی

آر جی ایس ٹی (ریفارمڈ جنرل سیلز ٹیکس) نے میڈیا اور عوامی اور علمی محفلوں میں خوب خوب جگہ پائی اس کی جڑیں ویٹ (ویلیو ایڈڈ ٹیکس) سے جا ملتی ہے جو کئی ممالک میں مختلف شرح اور نام سے نافذ ہے۔ یہ سیلز ٹیکس کی ہی ایک قسم ہے۔ یہ ٹیکس اشیا کی پیداوار اور ترسیل کے ہر مرحلے پر لگتا ہے۔ جوائنٹ ڈائریکٹر آف فرنچ ٹیکس اتھارٹی میورک لائیر نے ویلیو ایڈڈ ٹیکس 10 اپریل 1954ء کو متعارف کروایا۔ اس کا نظریہ جرمن بزنس مین ڈاکٹر ولیم جان سیمس نے 1918ء میں دیا تھا۔ پہلے پہل اس کا نفاذ بڑے کاروبار پر کیا گیا' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف کاروباری نوعیت کے تمام سیکٹرز شامل کر دیئے گئے۔ اس ٹیکس کا نظریہ اس لیے دیا گیا کہ اکثر اشیاء سمگل ہو جاتی تھیں۔ سیلز ٹیکس جو ویٹ ہی کی ایک شکل

ہے' اشیاء کی تیاری کے بعد خریدار انہیں خریدتا ہے تو سیلز ٹیکس وصول کیا جاتا ہے' لیکن اشیاء کے سمگل ہو جانے کی وجہ سے حکومت صحیح طریقے سے یہ ٹیکس وصول نہیں کر پاتی' اس لیے ویٹ متعارف کروایا گیا کیونکہ یہ واحد ٹیکس ہے جو اشیاء کی تیاری کے ہر مرحلے پر وصول کیا جاتا ہے۔

یہ ٹیکس اکثر کئی ممالک میں نافذ ہے لیکن اس کی شرح مختلف ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا نفاذ ہر چیز پر کیا جائے۔ مثال کے طور پر بلجیم کے اخبارات اور رسائل پر یہ لاگو نہیں ہوتا۔ اسی طرح کئی ممالک میں پرائیویٹ یا پبلک ٹرانسپورٹ' صحت کی سہولیات' تعلیمی سامان پر نافذ نہیں۔ ویٹ ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی پذیر ممالک میں بھی نافذ ہے' مگر عوام کی قوتِ برداشت کے مطابق منصفانہ شرح کے ساتھ۔

پاکستان وجود میں آیا تو سیلز ٹیکس کمرشل سرگرمیوں تک محدود تھا' لیکن 1951ء میں یہ صوبائی ٹیکس میں بدل گیا۔ پاکستان میں سیلز ٹیکس کا نفاذ 1990ء میں ہوا جس کا نام بعد میں بدل کر جنرل سیلز ٹیکس (جی ایس ٹی) رکھ دیا گیا۔

نومبر 2008ء میں آئی ایم ایف نے پاکستان کے لیے قرضے کی منظوری دی' جس کی ایک شرط یہ تھی کہ پاکستان میں بہرحال یکم جولائی 2010ء کو ویٹ نافذ کر دیا جائے گا۔ حکومت نے آر جی ایس ٹی کے نام سے اس کے نافذ کی پوری کوشش کی ہر پلیٹ فارم سے بھرپور مزاحمت دیکھ کر آئی ایم ایف نے سٹینڈ بائی ارینجمنٹ پروگرام (SBA) کے تحت اس ملک میں

> 21 جولائی 2009ء کو سی این این کے ایک پروگرام میں امریکی وزیرِ دفاع نے یہ بتا کر ایک عالَم کو حیران کر دیا کہ اس وقت امریکہ میں جو فائٹر جیٹ طیارے تکمیل کے مرحلے میں ہیں' ان کی تیاری کے بعد کوئی ایسا فائٹر جیٹ نہیں بنایا جائے گا جسے اُڑانے کے لئے پائلٹ کی ضرورت ہو۔ مستقبل میں بمبار طیارے ڈرون اُڑانے اور کنٹرول کرنے والی ٹیکنالوجی کے مطابق کارروائی کریں گے۔

30 ستمبر 2011 تک کا اضافہ کر دیا ہے۔ پاکستان آئی ایم ایف کے دباؤ کے تحت مزید 150 ارب روپے کے ٹیکس لگانے پر مجبور ہے جو آئندہ چند سال میں 450 ارب روپے تک بڑھ جائیں گے۔

ڈرون

شہد کی مکھیوں کو ایک پونڈ شہد کے لئے بیس لاکھ کے قریب پھولوں کا رس چوسنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وہ تقریباً تیس لاکھ اُڑانیں بھرتی اور اس دوران مجموعی طور پر 50 ہزار میل کا سفر طے کرتی ہیں۔ مکھیوں کا چھتہ بھی ان کی کاریگری کا شاہکار ہے۔ ہر مکھی کا اپنا خانہ (گھر) ہوتا ہے جس کی تزئین اور آرائش اس کی ذمہ داری ہے۔ ان میں کبھی ایک دوسرے کی حق تلفی کا تنازع پیدا نہیں ہوتا۔ عدل و انصاف کے لئے مکھیوں کی رانی موجود ہوتی ہے۔ مکھیوں میں کمال درجے کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک مخصوص مدت میں چھتے میں شہد جمع کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے پیٹ کے اندر ایسی

ننھی سی فیکٹری لگادی ہے کہ اس میں پھولوں کا رس مصفّٰی ہو کر شہد میں بدل جاتا ہے جسے وہ اپنے اپنے خانے میں بھرتی رہتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کا خاندانی نظام اپنی جگہ ایک عجوبہ ہے۔ کارکن مکھیاں اپنی ملکہ کے احکام بجالانے میں مصروف رہتی ہیں جب کہ نر چھتے کے گرد دفاعی فورس کے طور پر ڈیوٹی دیتے ہیں' یہ نکھٹو کہلاتے ہیں۔ انہیں انگریزی میں ڈرون (Drone) کہتے ہیں۔ ملکہ مکھی چھتے میں انڈے دیتی ہے جن سے ان کی نسل چلتی ہے۔ مکھیوں کی فیض رسانی کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے ہزاروں گُنا زیادہ شہد تیار کرتی ہیں۔

حیرت ہے کہ امریکیوں نے پائلٹ کے بغیر اُڑنے' فوٹوگرافی' جاسوسی اور میزائل داغنے والے جہاز کا نام ڈرون (نکھٹو) کیوں رکھا؟ حالیہ دنوں اس کی قیامت خیز کارکردگی حیران کُن ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق یہ دس ہزار میل دُور بیٹھے ماہرین کے سامنے رکھے کمپیوٹر کی ایک کلک پر مطلوبہ نشانے پر ضرب لگاتا ہے۔

منفرد شناختی نشان

انگلی کا نشان جو انگلی کے سرے پر بنا ہوا ہوتا ہے اور جس کا ایک خاص نمونہ جلد کے اوپر دکھائی دیتا ہے' انگلی کے مالک کے لیے بے مثال ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں ہر انسان کی انگلیوں کے نشانات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی بڑا زخم نہ آجائے' انگلیوں کے نشانات کسی شخص کی زندگی میں کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نشانات کو ایک نہایت اہم شناختی علامت تصور کیا جاتا ہے اور یہ دنیا بھر میں اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم دو سو سال پہلے انگلیوں کے نشانات اس قدر اہم نہ تھے کیونکہ انیسویں صدی کے آخر میں یہ بات دریافت ہوئی تھی کہ انسانوں کی انگلیوں کے نشان ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ 1880ء میں ایک انگریز سائنسدان Henry Faulds نے اپنے ایک مقالے میں جو ''نیچر'' نامی جریدے میں شائع ہوا' اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ لوگوں کی انگلیوں کے نشان عمر بھر تبدیل نہیں ہوتے اور ایسے مشتبہ لوگ جن کی انگلیوں کے نشان کسی شے مثلاً شیشے وغیرہ پر رہ جاتے ہیں' ان کی بنیاد پر ان پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔ 1884ء میں پہلی بار انگلیوں کے نشانات کی شناخت کی بنا پر قتل کے ایک ملزم کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس دن سے انگلیوں کے نشانات شناخت کا نہایت عمدہ ذریعہ بن گئے ہیں۔ 19ویں صدی سے قبل غالباً لوگوں نے بھول کر بھی نہ سوچا ہوگا کہ ان کی انگلیوں کے نشانات کی لہر دار لکیریں بھی کچھ معنی رکھتی ہیں اور ان پر بھی غور کیا جا سکتا ہے' لیکن ساتویں صدی میں قرآن حکیم میں اس بات کا ذکر کیا گیا تھا کہ انسانی انگلیوں کے نشانات اہم خاصیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ سورۃ القیٰمۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اُس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔ (آیات:4,3)

گوشۂ خیال

نوعِ انسانی کا فکری اِرتقا

نوید انجم

کائنات کی تخلیق کے لئے خالقِ کون ومکان نے ایک ایسا نظام بنانے کا فیصلہ کیا جہاں روشنی ہو اور اندھیرا بھی، دن ہو اور رات بھی، محبت ہو اور نفرت بھی، خوشی ہو اور غم بھی، الغرض خالقِ کائنات نے اس تضاد کو کائنات کی تخلیق کی بنیاد بنا دیا۔ یوں اس کائنات کو ایک مقصد کے تحت پیدا کیا، اسی طرح حرف وصوت اور آب و گِل کے تضاد کو اس کائنات کی بنیاد بنانے میں بھی ایک حکمت پوشیدہ ہے۔

یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اندھیرے کے بغیر روشنی، رات کے بغیر دن، نفرت کے بغیر محبت اور غم کے بغیر خوشی کا مفہوم سمجھنا مشکل ہے۔ اِسی عقدۂ اضداد کی کشائی رازِ وحدت تک رسائی کا سبب ہے۔ الغرض خالقِ کائنات نے کُن کہا، تو کائنات تخلیق ہوگئی مگر حرف وصوت اور آب و گِل کے تضاد سے جس کو رازِ وحدت سمجھانا مقصود تھا، اُس کی تخلیق ابھی نہ ہوئی تھی۔ ایک طویل مدت تک انسان عدم میں ہی اپنی تخلیق کا انتظار کرتا رہا۔ آخر وہ وقت آن پہنچا اور خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کیا، فرشتوں سے سجدہ کروایا، ابلیس نے انکار کیا تو اسے اپنی بارگاہ سے نکال دیا__ نہ جانے اپنی نافرمانی کی وجہ سے یا انسان کی عظمت کا اقرار نہ کرنے کی وجہ سے۔ خیر، انسان جنت میں رہنے لگا اور یہیں سے بنی نوعِ انسان کا فکری ارتقا شروع ہوگیا۔

جنت میں روشنی تھی مگر اندھیرا نہ تھا، دن تھا مگر رات نہ تھی، محبت تھی مگر نفرت نہ تھی، خوشی تھی مگر غم نہ تھا۔ جنت میں تضاد نہ ہونے کی وجہ سے رازِ وحدت کا ادراک اپنے کمال کو نہ پہنچ سکتا تھا، اس لئے اللہ ربُ العزت نے انسان کو زمین پر بھیج دیا اور انسان کے شایانِ شان بھی یہی تھا کہ بقول علامہ اقبالؒ

جچتے نہیں بخشے ہُوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خُونِ جگر میں

زمین پر آ کر جب انسان نے اپنے گردونواح پر غور کرنا شروع کیا تو اس کے ذہن میں نادانستہ طور پر یہ سوال پیدا ہُوا کہ آخر اس تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ قدرت نے انسان کو اِس غور وفِکر کے مرحلے سے گزار کر اس کو اپنی حقیقت سے آشنا کرانا تھا:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبالؔ اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہُوں مَیں

اس لئے قدرت نے انسان کو چشمِ ظاہر عطا کی' ظاہر دیکھنے کے لئے اور چشمِ باطن عطا کی باطن دیکھنے کے لئے۔ قدرت نے کائنات کی بنیاد تضاد پر رکھی اور انسان کو مشاہدے کے لئے تضادی آلات یعنی چشمِ ظاہر و باطن اور عقل و عشق عطا کئے۔انسان نے جب کائنات میں طرح طرح کے مناظر دیکھے تو عقل و عشق کو لئے اِن مناظر کے اسرار و رموز کے عمیق و دقیق نکات کی عقدہ کُشائی میں ضم ہونے لگا۔عقدہ کُشائی کا یہ سفر انتہائی طویل اور روح پرور ہے:

کِس قدر لذت کشودِ عقدۂ مشکل میں ہے
لطفِ صد حاصل ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

اسی عقدہ کشائی کے بارے میں علامہ اقبالؒ بانگِ درا میں پھُول کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تُو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دِل نہیں

زیبِ محفل ہے شریکِ شورشِ محفل نہیں
یہ سعادت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں

عقل اور عشق کن کن مراحل سے گزر کر اپنی منزل کے قریب ہوتے گئے؟ اب ان کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

عقل نے دیکھا کہ کائنات میں روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی' مگر عشق نے دیکھا کہ کائنات میں صرف روشنی ہے' اندھیرے کا کوئی وجود نہیں۔اندھیرا روشنی کی عدم موجودگی کا نام ہے۔روشنی اور اندھیرے کا فلسفۂ وجود و عدم یہی ہے۔عقل نے دیکھا کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے' مگر عشق نے دیکھا کہ وجود صرف دن کا ہے اور رات' دن کی عدم موجودگی کا نام ۔ شب و روز کا فلسفۂ وجود و عدم یہی ہے۔عقل نے محبت و نفرت میں امتیاز کیا مگر عشق نے محبت کی عدم موجودگی کو نفرت جانا اور محبت کی انتہا پر اپنی بنیاد رکھی۔عقل خوشی اور غم میں بھی امتیاز کرتی رہی مگر عشق غم و طرب کے فلسفے کو بھی پا گیا۔اس طرح کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں جن سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔ایک یہ کہ عقل ہمیشہ کائنات کے تضاد میں اُلجھ کر امتیاز کرتی رہی اور دوسری یہ کہ عشق ہمیشہ کائنات کے تضاد میں وجود و عدم کے فلسفے سے آشنا ہو کر رازِ وحدت کے قریب تر ہوتا چلا گیا۔عقل کی ناکامی و محرومی اور عشق کی کامیابی و کامرانی کو علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے:

پُختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عشق فرمُودۂ قاصد سے سبُک گامِ عمل
عقل سمجھی ہی نہیں معنیِ پیغام ابھی

شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی
تُو ہے زنّاریِ بت خانۂ ایام ابھی

چشمِ ظاہر و باطن اور عقل و عشق کے اس فرق کو مَیں نے اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کیا ہے:

یہاں بیٹھ کر مَیں جہاں دیکھتا ہوں
وہاں تک کہاں اس نظر کی رسائی

یہ محتاج ہے روشنیِ سحر کی
وہ ہے مرکز و محورِ کبریائی
حجاب اس کو ہیں یہ زمیں آسماں بھی
اُسے تو ہے بالواسطہ آشنائی

رازِ وحدت پا لینے کے بعد فی البدیہہ مَیں پھر بول اُٹھا:

چمک تیری عیاں بجلی میں، آتش میں، شرارے میں
جھلک تیری ہویدا چاند میں، سُورج میں، تارے میں

بلندی آسمانوں میں، زمینوں میں تری پستی
روانی بحر میں، اُفتادگی تیری کنارے میں

گویا عشق کو اب رازِ وحدت پا لینے کے بعد ہر شے میں ایک ہی رنگ نظر آنے لگا جس کی آرزو کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے
حُسنِ عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

اب چونکہ عشق رازِ وحدت کو پا گیا اور عقل راستوں کے پیچ و خم میں اُلجھ کر رہ گئی، اس لئے علامہ اقبالؒ عقل کی بجائے عشق کا سہارا لینے کی تلقین کرتے ہیں۔ چونکہ عقل کا محور چشمِ ظاہر اور عشق کا چشمِ باطن، اس لئے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

بالِ جبریل میں ایک مقام پر کہا:

ترے سینے میں دم ہے، دل نہیں ہے
ترا دم گرمیِ محفل نہیں ہے

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

- علم عمل سے حاصل ہوتا ہے — ماؤزے تنگ
- دولت سے کتابیں خرید سکتے ہو، علم نہیں — شیکسپیئر
- پوچھنے میں شرم نہ کرو، جہالت شرم سے بدتر ہے — ملٹن
- چاند کے بغیر رات ادھوری اور علم کے بغیر ذہن — خلیل جبران
- جو نہیں سیکھنا چاہتا، اُسے کوئی نہیں سکھا سکتا — برنارڈ شا
- اپنی مرضی سے غلام بننے والوں کو کوئی آزاد نہیں کرا سکتا — ہٹلر
- اللہ پر بھروسے کے ساتھ بندوق بھی تیار رکھو — کراموویل
- سست آدمی کبھی بھی خوش نہیں رہتا — نیلسن منڈیلا
- مسکراہٹ محبت کی زبان ہے — ہومر
- جسے شوہر بننا ہے، اس کے لیے مرد بننا ضروری ہے — چرچل
- ماہر آدمی چھوٹی نہیں، بڑی غلطیاں کرتا ہے — کولرج
- بے عزتی کو بھول جانا انتہائی مشکل کام ہے — گوئٹے
- غربت جرائم کو جنم دیتی ہے — ارسطو
- غریب وہ ہے جسے زیادہ سے زیادہ کی خواہش ہو — ایلبیٹ
- سننے میں جلدی کرو، بولنے اور غصہ کرنے میں تاخیر — جیمز اول
- حلیہ خراب رکھو گے تو ذہانت ماند پڑ جائے گی — جانسن
- اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی خوشی کو برباد نہ کرو — ڈیل کارنیگی

انسان کے فکری ارتقا کا سفر جنت سے شروع ہوا تھا اور بعد میں رازِ وحدت کے ادراک کے لئے زمین پر پہنچا۔ انسان نے رازِ وحدت پالیا۔

یہاں سے انسان کے فکری ارتقا کا دوسرا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ رازِ وحدت کا ادراک مقصد ضرور تھا مگر منزل نہیں۔ اس لئے ایک مقصد حاصل ہو جانے کے بعد انسان نے اپنی منزل کی طرف دوسرا قدم اُٹھایا۔ دوسرا قدم کیا ہے' کس طرح اُٹھا؟ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رازِ وحدت کے بعد انسان قرآن وحدیث کے اسرار ورموز میں غوطہ زن ہُوا اور وہ نایاب موتی نکالے کہ مہرِ عالَم تاب بھی جن کی تابانی کے آگے ماند پڑ گیا۔ انسان نے وہ طاقتیں حاصل کر لیں کہ اس کی انگلی کے اشارے سے تقدیر کے فیصلے بدلنے لگے۔ اس نے نگاہ جھکائی تو وہ تحت السریٰ تک جا پہنچی اور جب اوپر اُٹھائی تو عرش العلیٰ پر جا اٹکی۔ الغرض فکری ارتقا کے دوسرے مرحلے میں معجزات وکرامات انسان کے ہاتھ آنے لگے۔ انسان نے رازِ وحدت پالیا۔ معجزات وکرامات ہاتھ آ گئے۔

دو مقاصد کے حصُول کے بعد انسان نے اپنی منزل کی طرف تیسرا قدم اُٹھایا۔ تیسرا قدم کیا تھا؟ کس طرح اُٹھایا؟ یہ مراحل کتنے ہیں؟ منزل کیا ہے؟ کب ملتی ہے؟ فکری ارتقا کی تکمیل کے لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کائنات کی تخلیق سے پہلے صرف اللہ ربُ العزت کی ذات تھی' کائنات کی تخلیق

جدید ترین سائنسی تحقیق کے مطابق دماغ کو جتنا زیادہ استعمال کریں' اُتنا ہی اس کی قوت بڑھتی ہے۔ جسم میں دماغ ہی وہ واحد عضو ہے جو بدن کے دیگر اعضاء کی طرح کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ بڑھتی عمر کے منفی اثرات اس پر نہیں پڑتے بشرطیکہ اس سے مسلسل کام لیا جاتا رہے۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ انسان اپنے دماغ سے پورا کام نہ لے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی دماغی صلاحیتیں زنگ آلود ہونا شروع ہو جاتی ہیں' اُس کی یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے۔ آخر کار وہ بھول جانے (نسیان) کے مرض کا مستقل مریض بن جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق مندرجہ ذیل طریقوں پر عمل کر کے دماغ کی صحت اور کارکردگی بہتر بنا سکتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے ذکر' تلاوت اور درود شریف کو معمول بنا لینے سے دماغ روشن اور متحرک رہتا ہے۔ اس سے دماغ میں ایسا صحت منداور مثبت مادہ پیدا ہوتا ہے جو ذہنی دباؤ اور پریشانی کم کرتا ہے۔ حافظِ قرآن لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ لائق اور ذہین ہوتے ہیں۔ اُنہیں اللہ کی جانب سے مشکل اور پیچیدہ ترین مسائل کا حل ڈھونڈنے کی خصوصی قوت ملتی ہے۔ اُن کھیلوں میں حصہ لیں جن سے دماغ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لائے۔ مثلاً تصویریں اور تصوراتی مہم میں تدبیر لڑانا' الفاظ کی شکلیں تبدیل کرنا (سکریبل)۔ اچھی اچھی کتب کے مطالعہ کی عادت اپنائیں۔ اِس سے یادداشت قوت پکڑتی اور تیز ہوتی ہے۔ ورزشیں دورانِ خون کو تیز کر کے زیادہ آکسیجن فراہم کرتی ہیں۔ اِسی طرح سوچ بچار کرنا بھی دماغ کی زرخیزی اور آئی کیو میں بہتری کا باعث بنتا ہے۔ اِس سے دماغ کا وہ حصہ بہت رفتار پکڑتا ہے جو ہنگامی حالات میں فوراً سوچنے اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت کا ذمہ دار ہے۔

(طلحہ علی: اپنا دماغ استعمال کیجئے' قومی ڈائجسٹ' جون 2010)

کے بعد بھی ذات صرف اُسی کی ہے! بقول علامہ اقبالؒ:

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجُودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

کاغذی کارروائی

حامد افتخار

یونیورسٹی کے تھکا دینے والے معمول کے بعد ہاسٹل کے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ کاغذ کے نفیس لفافے میں لپٹی ڈاک پر میری نگاہ پڑی۔ دن بھر کی سرگرمیوں کے بعد اتنا حوصلہ باقی نہ تھا کہ ڈاک کھولتا اور پڑھتا' لہٰذا ڈاک اُٹھا کر میز پر رکھی اور بستر پر لیٹ گیا۔ چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ محسوس ہوا قمیض کی جیب میں کچھ موجود ہے۔ ہاتھ ڈال کر ٹٹولا تو پتہ چلا کہ کاغذ کے چند ٹکڑے ہیں۔ غور سے دیکھنے کے بعد یاد آیا کہ دراصل اُس صفحے کے ٹکڑے ہیں جس پر میری مصروفیات تحریر تھیں۔ بدن چونکہ تھکاوٹ سے چور تھا' لہٰذا اُن صفحات کو کوڑے دان کی نذر کیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

کافی دیر تک سونے کی ناکام کوشش کے بعد یہ واضح ہوا کہ نیند آنکھوں سے روٹھ چکی ہے۔ کئی کروٹیں بدلنے کے باوجود بھی کیفیت وہیں ٹھہری ہوئی تھی جہاں چند لمحے پہلے تھی' لہٰذا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور نیند کے انتظار میں کمرے میں رکھی چیزوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ سامنے ہی ایک اور میز پر میرا کمپیوٹر پڑا تھا۔ غالباً دسویں جماعت کے نتیجے پر والد صاحب نے تحفے میں دیا تھا۔ اب اس کے اور میرے ساتھ کو بھی تین سال کا عرصہ ہونے کو تھا۔ کمپیوٹر کی میز کے عین اوپر کتابوں کا ایک ریک لگا تھا۔ اُس ریک میں پہلے سیمسٹر سے لے کر اب تک کی تمام کتب قرینے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خانے میں چند کتابیں ادب سے متعلق بھی تھیں۔ انہیں آخری بار کب کھولا تھا' یہ یاد بھی نہیں۔ اچانک نظر کچھ دور پڑے کوڑے دان پر جا کر رکی۔ چند لمحے پہلے اُس میں ڈالے گئے کاغذ کے ٹکڑے اور اُن پر لکھے آدھے ادھورے الفاظ جو کبھی اُس کاغذ کے ساتھ مکمل تھے' دعوتِ فکر دے رہے تھے۔

چند روز قبل یونیورسٹی میں ایک سیمینار تھا۔ سیمینار کا انعقاد خاصے وسیع پیمانے پر ہوا تھا۔ اس میں نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرون ملک سے بھی کئی نامور سائنسدانوں نے شرکت کی تھی۔ سیمینار کے انعقاد کی ذمہ داری طلبہ کے جس گروہ کو سونپی گئی تھی' اُس میں مَیں بھی شامل تھا۔ کمپئیرنگ کی تیاری سے لے کر سیمینار کے اختتام تک متعدد ذمہ داریاں میرے سپرد تھیں۔ ان چند روز میں جتنی مصروفیت کا عالم میں نے دیکھا'

شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔اُن تمام تر دنوں میں' تمام تر مصروفیات کے باوجود یہ صفحہ ہر وقت میرے ساتھ رہا۔شاید ہی کوئی لمحہ ہو جب میں نے وہ صفحہ خود سے دور رکھا ہو۔ تمام کاموں کی تفصیلات اور معمولات وغیرہ اُس پر درج تھے' جن سے بار بار رہنمائی لینا پڑتی۔ غالباً ایک بار یہ صفحہ کہیں رکھ کر میں بھول بھی گیا تھا' مگر وہ چند لمحے جس پریشانی کے عالم میں گزرے تھے وہ میں ہی جانتا ہوں اور اب وہی صفحہ' جسے غالباً آج صبح ہی میں نے ٹکڑوں کی شکل دی تھی' میرے سامنے کوڑے دان میں پڑا تھا۔بات بہت ہی عجیب سی لگتی ہے مگر سچ ہے' جب تک اُس صفحے کی ضرورت تھی' اُس کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کی گئی اور آج جب اُس کی ضرورت نہ رہی تو وہ کوڑے دان میں پڑا تھا۔ نہ جانے کیوں مگر مجھے اُس کاغذ کے ساتھ پیش آنے والے اس سارے واقعے کی موجودہ دور کی انسانی زندگی سے خاصی مماثلت محسوس ہوئی۔

تین ہزار سال قبلِ مسیح جب چینیوں نے کاغذ کی ایجاد کا ساماں کیا ہوگا' تو یہ بات اُن کے گُماں میں بھی نہ آئی ہوگی کہ اُن کی یہ ایجاد اس قدر پنپے گی کہ اس کا استعمال ایک دن آگے بڑھ کر انسانی زندگی ہی کو خود میں سمو لے گا۔انسانی زندگی کا آغاز' اس کا انجام' اس کی ترقی' اس کی کامیابی' اس کی ناکامی' اس کی دشواریاں' اس کی آسانیاں' سب ہی اس ایجاد کی مرہونِ منت ہوں گی۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ انسانی زندگی اب صرف کاغذ اور اس پر کھینچی گئی چند لکیروں کی اسیر ہے۔ یہ لکیریں کبھی دائیں سے بائیں کھینچی جاتی ہیں' کبھی بائیں سے دائیں اور کبھی اوپر سے نیچے' مگر تمام ہی صورتوں میں یہ ٹیڑھی میڑھی لکیریں انسانی مقدر کا فیصلہ کرتی نظر آتی ہیں۔فرق کبھی کاغذ کے معیار کا ہوتا ہے تو کبھی روشنائی کے رنگ کا' مگر فیصلہ انسان ہی سے متعلق ہوتا ہے۔زندگی کے آغاز سے لے کر اس کے انجام تک مختلف حالات اور مختلف واقعات کسی نہ کسی طرح کاغذ کی شکل میں محفوظ ہوتے ہی رہتے ہیں اور ان پر انسان ہی کی کھینچی ہوئی چند لکیریں ان کی اہمیت کا تعین کرتی ہیں۔مثلاً انسان کی پیدائش کے تحریری ثبوت یعنی برتھ سرٹیفکیٹ پر ناظم اگر دستخط نہ کرے تو ملک کا قانون اُس شخص کی پیدائش کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔کسی انسان کی مرگ کا گواہ یعنی ڈیتھ سرٹیفکیٹ مجسٹریٹ کے دستخطوں اور مُہر سے رہ جائے تو قانون کی نظر میں وہ شخص اُس وقت تک زندہ تصوّر رہوگا جب تک مجسٹریٹ اس کاغذ کے ایک کونے پر دستخط نہ کردے۔اس زیادتی کی ایک ادنیٰ سی مثال ملکِ عزیز کے دیہات میں نظر آتی ہے جہاں زمینداروں کے متوقع بچوں کی متوقع پیدائش کی معلومات کی بناء پر ہی برتھ سرٹیفکیٹ بنا دیے جاتے ہیں اور ناظم محترم خود حاضر ہو کر اُن پر دستخط عنایت کر دیتے ہیں۔ پھر انہی کاغذی ثبوتوں کی بناء پر ملک کی زرخیز زمین کا ایک بڑا ٹکڑا ''کاغذی گواہ'' بنا کر اس برتھ سرٹیفکیٹ کے نام کر دیا جاتا ہے۔اگر وہ کاغذ ہو تو زمین اُس آنے والے بچے کی جاگیر' اور اگر نہ ہو تو

زرعی اصلاحات کی بدولت کسی غریب کسان کی کُل کائنات۔

پیدائش و مرگ کے علاوہ زندگی کے دیگر معاملات کو دیکھا جائے تو یہاں بھی کاغذ کی حکمرانی دکھائی دیتی ہے۔ اگر کسی خاص رنگ کی روشنائی سے کسی بچے کا نام کسی سکول کے رجسٹر پر درج کرلیا جائے تو وہ اس کا طالب علم' نہ کیا جائے تو علم کے تمام دروازوں پر اس کے لیے قفل پڑ جائیں۔ اگر وہ بچہ سکول میں پڑھائے جانے والے سبق کو پنسل سے کاغذ پر چند لکیریں بنا کر محفوظ کرتا رہے تو ایک ذہین طالب علم اور اگر نہ کرے تو کند ذہن' انہی لکیروں کو ہُو بہو امتحانی کاپی پر چھاپ دے تو اوّل درجے کا حقدار اور اگر نہ کر سکے تو نچلے درجے کا سزاوار۔ کئی برس کی محنت کے بعد اگر وہ کاغذ کا ایک نیم رنگین صفحہ پا لے تو میٹرک پاس اور اگر نہ حاصل کر سکے تو مستقبل کی زندگی کا ایندھن۔ کسی کی کھینچی ہوئی چند لکیروں والی پرچی حاصل کر لے تو کسی اچھے کالج کا سٹوڈنٹ اور حاصل نہ کر پائے تو اپنی قسمت کا مرثیہ گو۔ اسی طرح کاغذ کے سمندروں کو پار کرتا ہُوا اگر ایم اے کی ڈگری لے لے تو اپنی زندگی کے کاغذات کو ایک فائل میں سجا کر نمائش کرتا نوکری کا طلب گار نوجوان اور اگر نہ لے پائے تو ''عوام کی مہر'' والے کاغذ کو پا کر اُن کی قسمت کا فیصلہ ساز۔ اگر اُن اونچے ایوانوں کی اُونچائی تک پہنچ جائے جہاں سے دنیا بہت خوبصورت دکھائی دیتی ہے' تو وزارت کا کاغذ اپنے ہاتھوں میں دبائے' قوم کے دیگر کاغذات کی ہیر پھیر کرنے والا کرشمہ ساز اور اگر نہ پہنچ پائے تو کالا کوٹ پہنے مقدس کاغذ پر کھینچی گئی لکیروں کو مختلف زاویوں سے پیش کرتا صاحبِ دلیل۔ اگر مقدر کے کاغذات پر خوش قسمتی کی لکیر ہو تو اونچی کرسی پر بیٹھ کر اوروں کی زندگی اور موت کی لکیریں جاری کرنے اور روکنے کے بعد قلم توڑ دینے کا اہل اور اگر لکیر نہ ہو تو اپنی گزشتہ روز کی گفتگو کو اخبار کے کاغذ میں پڑھ کر عہدے سے مستعفی ہونے والا خادم۔

ان تمام تر عوامل کے باوجود انسان کے فیصلہ ساز یہ تمام کاغذ' ان پر ثبت مختلف انواع اور رنگ کی روشنائی اور ان پر کھینچی گئی بے شمار لکیریں محدود مدت تک ہی ساتھ دیتی ہیں اور وقت ختم ہونے کے ساتھ ہی میرے سامنے کوڑے دان میں پڑے کاغذ کی طرح کبھی نہ کھلنے والی فائلوں کی اسیر یا کچرے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ باقی رہتی ہے تو گُلِ انسانیت کی وہ خوشبو جو بغیر کسی کاغذ' روشنائی اور لکیروں کے باغِ دنیا میں پھیلتی اور شجرِ انسانی کو مہکائے رکھتی ہے۔

پاکستان کا معیاری وقت

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کے معیاری وقت کے طور پر وہی وقت رائج رہا جو بھارت میں تھا۔ یہ گرینج کے معیاری وقت سے ساڑھے پانچ گھنٹے آگے تھا۔ 1951ء میں ماہر ریاضی دان پروفیسر محمد نور نے مختلف اعداد و شمار اور جدولوں سے ثابت کیا کہ پاکستان اور بھارت کا وقت یکساں نہیں بلکہ اس میں نصف گھنٹے کا فرق ہے۔ ان کی تحقیق کو درست مانا گیا۔ چنانچہ نارووال کی تحصیل شکرگڑھ جو طول بلد 75 اور عرض بلد 20 درجے شمال پر واقع ہے' کے مقامی وقت کو جو گرینج کے معیاری وقت سے 5 گھنٹے آگے ہے' پاکستان کا معیاری وقت تسلیم کر لیا گیا۔ اسے یکم اکتوبر 1951ء بروز سوموار نافذ کیا گیا۔

(پروفیسر دین محمد: روزنامہ نوائے وقت' راولپنڈی' 17 مئی 2010ء)

کتنا قیمتی ہُوں مَیں

خرّم مُراد

میں ایک سرسبز و شاداب اور تندرست و توانا مخلوق ہوں۔ مجھ جیسے کروڑوں اربوں دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والی ذات نے زمین کا سینہ چیر کر میری کونپل نکالی تو میں ایک ننھا منا پودا تھا۔ اس نے میری پرورش کی تو مجھے لاکھوں صورتوں اور رنگوں میں پروان چڑھایا۔ چھوٹا بھی بنایا اور بڑا بھی۔ کیلیفورنیا میں صنوبری نسل کے ریڈوڈ کی صورت میں تین سو فٹ سے زیادہ لمبا ہوتا ہوں۔ میری جنس تین ارب سال سے موجود ہے۔ اگرچہ میں ننھا منا سا بھی مرجھا جاتا ہوں' لیکن سب سے زیادہ طویل العمر زندہ مخلوق بھی مَیں ہی ہوں۔ چار ہزار سال تک کی عمر پاتا ہوں۔

زمین سے اُگنے والے میرے ساتھی پودوں کی اقسام و انواع کا کوئی شمار نہیں۔ دس لاکھ سے کم تو کسی صورت بھی نہیں۔ سب تین سو فٹ کے لحیم شحیم ہی نہیں' اتنے چھوٹے بھی ہوتے ہیں جیسے یہ جراثیم اور بیکٹیریا۔ یہ بھی پودے ہیں۔ یہ کائی' یہ بھی پودے ہیں۔ دو لاکھ جراثیم ایک جگہ جمع کریں تو دو انچ جگہ بھی نہ بھرے گی۔ جہاں ذرا نمی ہو' ذرا جڑ پکڑنے کی جگہ اور ذرا گرمی' وہاں مَیں موجود ہوتا ہوں۔ سمندر میں' دریا میں' مٹی پر' چٹانوں میں' ہر جگہ۔ ایک چوتھائی زمین صرف جنگلات سے بھری ہوئی ہے لیکن آج سے دس ہزار سال پہلے یہ رقبہ دوگنا تھا۔ گزشتہ ایک صدی میں بڑی تیزی کے ساتھ مجھے کاٹا گیا۔

بدقسمتی سے حضرتِ انسان کو کچھ پتا ہی نہیں کہ میں اس کی زندگی کے لئے کتنا قیمتی اور ناگزیر ہوں۔ میں نہ ہوتا تو انسان کیا' کوئی حیوان بھی زندہ نہ رہ سکتا۔ انسان ذرا اپنی خوراک کو ہی دیکھ لے! اسے کچھ اندازہ ہوگا کہ اس کے اور میرے خالق نے اسے سامانِ زندگی بہم پہنچانے اور رزق دینے کے کام پر مجھے اور میرے ہم جنس پودوں کو بھی مامور کیا ہے۔ اگر اسے اس کا ذرا بھی احساس ہو جائے کہ اس کی زندگی کی بقا کا سامان کرنے کے لئے میں اپنے خالق کے حکم کی تعمیل کتنے حیرت انگیز طریقے سے کرتا ہوں' تو وہ اس کے سامنے اتنی ناشکری نہ کرے اور میرے ساتھ وہ ظلم نہ کرے جو وہ کر رہا ہے۔

پیدا کرنے والے نے مجھے ایسا بنایا کہ میں صرف پانی' ہوا اور روشنی پر زندہ رہتا ہوں۔ زندہ رہنے کے لئے حکمِ ربی کے

علاوہ میں کسی رزق کا محتاج نہیں۔ میرے سوا کوئی ذی حیات مخلوق اپنی خوراک خود نہیں بناتا' مَیں اپنی خوراک خود بناتا ہوں۔ اس خوراک سے میرے سب تنے' شاخیں' پتے' پھل اور پھول بنتے ہیں۔ میری پرورش ہوتی ہے' تمام حیوانات کی اور انسان کی بھی۔ وہ گوشت کھائیں یا دودھ پئیں' سب کچھ میری مدد سے بنائی ہوئی خوراک سے ہی بنتا ہے۔

میرے ایک ایک پتے میں' جسے انسان بڑا حقیر سمجھتا ہے اور نوچ کے' کچل کے' مسل کے پھینک دیتا ہے' خوراک سازی کا کارخانہ لگا ہوا ہے۔ اسی خوراک سے سارے بندوں کے لئے رزق کا سامان ہوتا ہے۔ انہی کارخانوں سے اسے سانس لینے کے لئے صاف ہوا ملتی ہے۔ میری جڑیں زمین میں ہوتی ہیں' ان جڑوں کے ذریعے مَیں زمین سے پانی لیتا ہوں۔ میرے تنے میں' شاخ میں' ہر پتے کی ڈنٹھل میں' ہر پتے کے جسم میں پائپ لائنوں اور شریانوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ایک پتا ہاتھ میں لیں تو اس کی لکیریں دکھائی دیں گی' جیسے انسان کی کھال پر سے خون کی چھوٹی چھوٹی نالیاں نظر آتی ہیں۔ یہ نالیاں ہر پتے کے کارخانے میں پانی پہنچا دیتی ہیں' ہر پتے کا کنکشن جڑ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ہے واٹر سپلائی کا نظام!

میرے پتے کے جسم میں بے شمار ننھے منے سوراخ ہیں جیسے کھال میں مسام۔ یہ انسان کی آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ سورج نکلتا ہے' روشنی اور حرارت پہنچتی ہے تو یہ سوراخ کُھل جاتے ہیں اور مَیں سانس لینا شروع کر دیتا ہوں۔ رات کی تاریکی چھا جاتی ہے تو یہ سوراخ بند ہو جاتے ہیں۔ میں ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس حاصل کرتا ہوں۔ کلوروفل پتے کے اندر ہوتا ہے جس کا رنگ سبز ہوتا ہے۔ یہ کلوروفل پانی اور گیس کی کاربن کو ضیائی تالیف (Photosynthesis) کے ذریعے سادہ شکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔ شکر سازی کے اس عمل کیلئے (جو ارب ہا ارب کارخانوں میں جاری رہتا ہے) مَیں نہ ایندھن کا محتاج ہوں' نہ بند باندھ کر بجلی بنانے کا' بلکہ ساری توانائی سورج سے حاصل کرتا ہوں۔ اسی شکر سے مَیں نَشاستے (Starch) بناتا ہوں۔

اس شکر سازی کے عمل میں جو آکسیجن بچتی ہے' کچھ خود استعمال کرتا ہوں' باقی میرا ہر پتا ایک امانت کی طرح اپنے سوراخوں سے فضا کو واپس کر دیتا ہے۔ انسان سانس لیتا ہے تو آکسیجن خرچ کر کے کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں پھیلاتا ہے جس سے ماحول آلودہ ہوتا ہے۔ میرے پتے سانس لیتے ہیں تو 3.6 ٹن کاربن کو اپنے اور انسان کے لئے خوراک بنا کر فضا کو 6.4 ٹن آکسیجن واپس کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ہوا کو صاف اور پاک کرتے ہیں۔ جتنی خوراک کی پتے کو ضرورت ہوتی ہے' وہ رکھ لیتا ہے' باقی میرے تنے اور شاخوں کو توانا بنانے اور نئی شاخیں بنانے' پُھول پیدا کرنے' جن سے میری نسل کے تسلسل کا انتظام ہوتا ہے اور پتے' پھل اور دانے بنانے میں استعمال ہوتی ہے جو انسان' پرندے اور جانور کھاتے ہیں۔ میرا پیدا کرنے والا میرے ایک ایک پتے کی

خبر گیری کرتا ہے' بالکل اُسی طرح جیسے وہ انسان کے جسم کے اربوں خلیوں میں سے ایک ایک خلیے کی نگہبانی کرتا ہے۔ میرے خالق کا فرمان ہے:

''اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس (اللہ) کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے' سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہوا۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر' سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔''

(سورۃ الانعام۔ آیت:59)

انسان نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر وہ اپنی ٹیکنالوجی سے ہوا کی صفائی کا پلانٹ لگائے تو میرے برابر کاربن گیس نکالنے پر چار لاکھ اور آکسیجن فراہم کرنے پر تین لاکھ روپے سالانہ خرچ ہوں گے' پلانٹ کی قیمت الگ رہی۔ رزق بنانا' رزق پہنچانا' ماحول صاف رکھنا تاکہ انسان کو غذا اور ہوا ملے' میرا سب سے اہم کام ہے۔ میری ہر چیز انسان کے کام آتی ہے۔ اب مَیں جلدی جلدی اپنی بڑی بڑی خدمات شمار کراتا ہوں۔

یہ کاغذ جس سے آپ پڑھ رہے ہیں' میرے گودے سے بنا ہے۔ یہ میز کرسی جس پر آپ بیٹھے ہیں یا پلنگ جس پر آپ لیٹے ہیں' اس کی لکڑی مَیں نے مہیا کی ہے۔ مَیں تیس کیوبک فٹ کے قریب لکڑی فراہم کرتا ہوں۔ ماضی میں لکھنے کے لئے قلم میری ہی لکڑی سے بنتے تھے۔

مَیں دھوپ میں سایہ اور بارش میں چھتری بن جاتا ہوں۔ میں پارکوں اور تفریح گاہوں میں حُسنِ نظارہ اور تفریح کی لذت فراہم کرتا ہوں۔ مَیں زرعی زمین کو بہتر بناتا ہوں۔ مَیں دوائیں فراہم کرتا ہوں' میری چھال اور پتیوں کا جو کئی کاموں میں استعمال ہوتی ہیں' شمار ممکن ہی نہیں۔ گیس' پٹرول اور آگ بھی مجھ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے انسان ترقی اور دولت کے لالچ میں تیزی سے جنگلوں کا صفایا کر رہا ہے۔ وہ نادان ہے' نہیں جانتا کہ اس کے رب نے اس کی زندگی کو کس طرح میرے ساتھ باندھ دیا ہے۔ مجھے بے دردی سے تلف کرنے والے انسان کو بس مَیں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر اور خود پر رحم کر!

درخت انسان کا صدیوں سے خاموش دوست' جھولے سے لے کر قبر تک کا ساتھی' دستِ فطرت کا شاہکار' زمین کا زیور' سکون کا آنچل اور قدرت کا ایئر کنڈیشنر ہے۔ آیئے اس کے حروف (د' ر' خ' ت) سے مل کر بننے والے لفظ کے اصل روپ پر غور کریں اور فیصلہ کریں کہ درخت لگانا کتنا بڑا کام اور درخت کی حفاظت نہ کرنا کتنا بڑا ظلم ہے:

د: دوا

ر: رحمتِ ربِ کریم

خ: خوراک

ت: توانائی

(پروفیسر محمد سرور شفقت: قدرت کے ثنا خواں)

گوشۂ داستاں

جلاوطن

عثمان خاور

پھاپاں واپس چلی گئی۔اس بار وہ کتنی دیر کے لیے گئی ہے' کوئی نہیں جانتا۔ ہوسکتا ہے وہ اب کبھی نہ آئے' لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ پھر کسی روز چند ہفتوں' چند مہینوں یا چند سالوں کے بعد وہ کرچی کرچی ہمارے دروازے پر بکھری پڑی ہو۔ اندر سے پوچھی جانے والی ''کون ہے؟'' کے جواب میں اپنی کرچیاں سمیٹے اور کہے ''میں پھاپاں ہوں جی! بُوہا کھولو''۔

ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ وہ ہر بار ٹوٹ پھوٹ کر آتی ہے۔ کچھ دن گزرتے ہیں' زخم بھرنے لگتے ہیں تو اُسے پھر گھر اور گاؤں کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے اور مان کے ساتھ اُمید کے چراغوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھتی اور اپنے گھر کے اندھیروں کو لوٹ جاتی ہے۔ مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وہ بجھی ہوئی آنکھیں لیے پھر ہمارے پاس چلی آتی ہے۔

دراصل وہ ایک ساس ہے۔ معاشرے کی آؤٹ کاسٹ' ایک جلاوطن۔ جس کا کوئی گھر' کوئی وطن نہیں۔ وہ کہاں جائے' اپنا دکھ کس سے کہے۔ اُس کی بپتا سننے والا کوئی نہیں۔ کوئی بھی تو نہیں' لہٰذا وہ دنیا کے اس جنگل میں اکیلی رہتی اور اپنی تنہائی کے اندھیروں میں منہ چھپا کر روتی ہے' مبادا لوگ اُس کے رونے سے بیزار ہو جائیں۔

میں ایک روز دفتر سے گھر واپس آیا تو میری چھوٹی بیٹی دروازہ کھولتے ہی بڑے رازدارانہ انداز میں کہنے لگی: ''ابو! مَیں آپ کو بتاؤں آج ہمارے گھر کون آیا ہے... پھاپاں آئی ہے!''

مجھے اس کے آنے کی خبر سن کر کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی' باوجود اُس بات کے کہ اُسے گئے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے' میں جانتا تھا وہ کبھی بھی لوٹ سکتی ہے۔

اُس کا اصل نام فاطمہ تھا۔ میرا چھوٹا بیٹا اپنی توتلی زبان سے اُسے 'پھاپاں' کہہ کر پکارتا تھا۔ پھر سب بچوں نے اُسے اسی نام سے پُکارا اور وہ سارے گھر کے لیے 'پھاپاں' ہو گئی۔ پچھلی بار جب وہ گئی تو یہ کہہ کر گئی تھی کہ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گی' بس کوئی پندرہ بیس دن میں لوٹ آؤں گی' لیکن وہ اُس کے بعد اب آئی تھی اور آنے کے بعد اُس نے کہا تھا کہ وہ چند دنوں کے لیے آئی ہے' ہمیں ملنے کے لیے اور پھر واپس چلی جائے گی۔

چند دن گزر گئے تو ایک روز میری والدہ مجھ سے کہنے لگیں

''بیٹا تم تو جانتے ہو یہ غریب اور بے سہارا عورت ہے۔ اسے یہیں رہنے دو۔''

''مگر وہ تو...''

''نہیں۔'' اُنہوں نے میری بات سمجھتے ہوئے کہا: ''کوئی صورت نہیں فی الحال اُس کی واپسی کی۔ وہ بیٹے کا گھر چھوڑ آئی ہے۔ کہاں جائے گی بے چاری!''

تو یہ بات تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہو اور بیٹے سے لڑ کر آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح آ کر ہمیں یہی کہا تھا کہ چند روز میں واپس چلی جائے گی' ٹھیک ہے یہ اُس کی انا کا تقاضا تھا۔ میں نے بیگم سے بات کی۔ اُس نے انکار تو نہ کیا لیکن کچھ متامل سی تھی۔ کہنے لگی کام تو اچھا کرتی ہے مگر اسے ہر بات میں دخل دینے کی عادت ہے۔ اگر کسی بات پر ٹوکو تو برا مناتی ہے۔ بات درست تھی مگر ہم نے اُسے رکھ لیا۔ جلد ہی اُس نے گھر کا سارا کام کاج سنبھال لیا۔ چُونکہ وہ ایک دیہاتی عورت تھی' اس لیے اسے محنت سے کام کرنے کی عادت تھی۔ وہ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھتی اور اُس کا یہ رویہ عام ملازموں جیسا نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر معاملات میں بڑی بے تکلفی سے اپنی رائے کا اظہار کرتی۔ کوئی بھی عورت اپنے گھر کے معاملات میں دوسروں کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔ میری بیوی کو بھی یہ پسند نہ تھا' لیکن اُس نے اُسے قبول کیے رکھا۔

وہ سارا دن کاموں میں مصروف رہتی اور رات کو ایک کونے میں پڑ کر سو رہتی۔ اُسے ہمارے بچوں سے بہت پیار تھا۔ شائد ان میں اُسے اپنے پوتے پوتیوں کا عکس دکھائی دیتا تھا' جن کی یاد کو اُس نے سینے سے لگا رکھا تھا۔ دادا' دادی کو اپنے بچوں کے بچوں سے کس قدر محبت ہوتی ہے اور اُن کی معصوم رونق کے بغیر وہ اپنے دل کو کتنا ویران محسوس کرتے ہیں، یہ پھاپاں جانتی تھی۔ باتوں باتوں میں وہ اکثر ان کا تذکرہ کرتی۔ بعض اوقات ایسا کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتی اور ہم حتّی الامکان اُس کی دلجوئی کی کوشش کرتے یا بات کا رُخ بدل دیتے۔

بعض معاملات میں وہ بے دھیانی برتتی مثلاً کپڑے یا برتن دھوتے ہوئے پانی کھلا چھوڑ دیتی اور سرف یا صابن بے دریغ استعمال کرتی۔ فریج سے کوئی چیز نکال کر دروازہ اچھی طرح بند نہ کرتی۔ میری بیوی اکثر شکایت کرتی کہ بجلی کا بل بہت زیادہ آ رہا ہے' موٹر بار بار چلانی پڑتی ہے۔ میں اُسے سمجھاتا کہ دیکھو وہ گاؤں میں رہنے کی عادی ہے' آہستہ آہستہ سیکھ جائے گی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ بار بار توجہ دلانے کے باوجود ہم اُس کی عادت بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر وہ گھر کے کسی کونے میں تنہا جا بیٹھتی۔ ایسے میں کبھی کبھی اُس کی تنہائی سے ایک لمبی سی 'ہائے' برآمد ہوتی جو دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہتی۔ شاید یہ وہ لمحہ ہوتا جب اُس کے دکھ کی بلند لہر اُسے زیر کر لیتی اور وہ دیر تک اُس میں ڈوبتی اُبھرتی رہتی۔ یہ لہر اُسے کہاں لے جاتی تھی؟ شاید اُس کے گھر میں جہاں اُس کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ شاید اُن آنکھوں کے پاس جن میں اُس کے انتظار کا کوئی دِیا نہ جلتا تھا۔ اُس کا بیٹا' اُس کا چاند اُس سے کتنی دُور تھا! اُس کی بہو انتہائی بدمزاج اور خود پسند عورت تھی۔ وہ اپنے بچوں تک کو اُس کے قریب نہ پھٹکنے دیتی تھی۔

وہ دل میں مسوس کر رہ جاتی' اُس کی متواتر کھانسی اُس

کے قابو میں نہ تھی۔ وہ اُس کم فہم کو کیسے سمجھاتی کہ کھانسی تو بڑھاپے کی ہم زاد ہے۔ اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے' اور یہ کہ آج تک دادا یا دادی کی کھانسی کی وجہ سے کوئی بچہ تپ دق کا شکار نہیں ہوا' اور یہ بھی کہ بہت جلد اُس پر بھی یہ وقت آنے والا ہے۔ وہ بھی ماں کی محبت سے ساس کی نفرت اور جوانی کے اختیار سے بڑھاپے کی بے اختیاری تک کے سفر میں ہے۔ اور جب وقت کا پہیہ پوری رفتار سے چلے گا تو وہ کسی طور اُسے روک نہ سکے گی۔ وہ اُسے اور بھی بہت کہنا چاہتی مگر کیونکر کہتی! یوں اکثر اوقات وہ بچوں کو گود میں اُٹھانے' اُن کے چھوٹے چھوٹے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے ہاتھوں میں محسوس کرنے اور اُن کے گالوں پر بوسہ دینے کی لذت سے محروم رہتی۔ کبھی کبھی پھٹ پڑتی مگر معاملہ اور زیادہ بگڑ جاتا۔ بیٹا جب کچھ نہ کر سکتا تو تنگ آ کر کہتا: ''امّاں! کیوں میرے گھر کا چولہا ٹھنڈا کرنا چاہتی ہو۔ خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ!''

یہ درست ہے کہ پھاپاں کی زبان بھی غیر محتاط تھی اور وہ دخل در معقولات کی عادی تھی۔ اُس کا رویّہ یقیناً جھگڑے کا باعث بنتا ہوگا اور اپنی رائے پر اصرار بھی کرتی ہوگی' مگر اس سب پر اُسے اختیار ہی کب تھا! ساری عُمر کی بنی ہوئی عادتیں بھی تو بڑھاپے میں خرمنِ مرض کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔ ایسا مرض جس کی تشخیص ہی میں سارا وقت گزر جاتا ہے۔

اس بار جب وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی تو اُس کے پیچھے بھی ایک جھگڑا ہی تھا۔ ایک روز جب کسی بات پر ساس بہو کی تکرار ہوئی تو بیٹے نے غصے میں آ کر بیوی کے گال پر تھپڑ دے مارا۔ بیوی نے حسبِ عادت آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ برادری والے اکھٹے ہوئے اور ماں بیٹے کو جی بھر کر لعن طعن کی گئی۔ اُنہیں بتایا گیا کہ اگر آئندہ اُس پر ہاتھ اُٹھایا گیا تو ساری برادری اُن کا بائیکاٹ کر دے گی۔ بیوی کو صرف ایک بزرگ نے چلتے چلتے اتنا کہا: ''کُڑیے! تُو بھی آپے میں رہا کر۔ روز روز گھر میں جھگڑا اچھا نہیں لگتا۔''

چند دن گزرے تو بیٹے نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ بیوی کی منّت سماجت کر کے اُسے راضی کر چکا تو ایک دن مُنہ دوسری طرف کر کے ماں سے کہنے لگا: ''ٹھیک ہے امّاں! تُو جہاں بھی خوش رہتی ہے بے شک وہاں چلی جا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

کتنی آسانی سے اُس نے یہ بات کہہ دی اور ذرا بھی نہ سوچا تھا کہ بھلا ماں اپنے بیٹے سے دُور رہ کر کیسے خوش رہ سکتی ہے۔ ''ٹھیک ہے پُتّر!'' ماں اُس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی: ''تیری یہی خوشی ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔ خدا تجھے اپنے بال بچوں میں سُکھی رکھے۔''

اور وہ بدنصیب اُجڑے ہوئے دل کے ساتھ ایک بار پھر اُس گھر سے نکل آئی جہاں سے وہ کئی بار نکالی گئی تھی۔

بیٹے کو بیاہ کر عورت کس قدر تنہا اور بے بس ہو جاتی ہے!

کوئی چھ ماہ بعد اُسے بیٹے کا خط موصول ہوا۔ وہ خوشی سے پُھولے نہ سمائی تھی۔ ''میرے انور کا خط آیا ہے جی!'' وہ سب کو بتاتی پھرتی۔ ''حال پوچھا ہے۔ نِکّے بھی سارے خیر سے

ہیں‘‘۔ وہ ہر وقت اسی خیال سے سرشار رہتی کہ بیٹے نے اُسے یاد کیا ہے۔ کبھی کبھی کچھ سوچتے ہوئے مُجھ سے پوچھتی: ’’تو اُس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا جی؟ میرا مطلب ہے یہاں آنے کے بارے میں...‘‘

میں جانتا تھا وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کافی عرصہ اسی سرشاری میں گزر گیا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر انور کا دوسرا خط آیا۔ اس بار اُس نے لکھا تھا: ’’امّاں! تمہاری بھانجی کا ویاہ ہے۔ خالہ نے تمہیں بُلایا ہے۔‘‘

پھاپاں کے دل کی مُراد بَر آئی۔ اگرچہ بیٹے نے اُسے اپنے طور پر گھر واپس آنے کے لیے نہیں کہا تھا‘ لیکن اُسے واپسی کا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اُس کے باوجود وہ کافی دیر تک خود سے لڑتی رہی۔ ہم پوچھتے تو یہی کہتی: ’’مَیں نے جا کے کیا کرنا ہے جی! میرے بغیر کون سا کام رُکا ہوا ہے۔‘‘

لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اب نہیں رُکے گی۔ نہ نہ کرتے ہوئے اُس نے اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کر دی تھیں۔ اُس کی ہمیشہ کہ عادت تھی کہ اُسے جو چیز بھی دی جاتی‘ وہ اپنے بیٹے‘ بہو یا پوتے پوتیوں کے لیے سنبھال کر رکھ لیتی۔ آخر کار جب اُس نے جانے کا فیصلہ کر لیا تو ایک روز میرا بیٹا اُسے سامان سمیت بسوں کے اڈے پر لے گیا اور وہ گاؤں روانہ ہو گئی۔

پھاپاں واپس چلی گئی۔ کتنی دیر کے لیے‘ یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ خود بھی نہیں جانتی۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ جس چاہت کے ساتھ گئی ہے‘ اُس کا جواب دینے والا اُس بھرے گھر میں کوئی ہے یا نہیں۔ شاید اُس کا بیٹا یا میٹھی توتلی باتیں کرنے والے معصوم فرشتے‘ یا شاید کوئی بھی نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے‘ ہو سکتا ہے وہ اب کبھی نہ آئے! ممکن ہے آخر کار وہ جان جائے کہ زندگی کا راز سمجھوتے میں ہے‘ لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی روز ہمارے دروازے پر دستک ہو اور پُوچھے جانے پر باہر سے جواب آئے: ’’مَیں پھاپاں ہُوں جی! بُوہا کھولو...‘‘

مشورہ

کبھی ناراض مت ہونا
محبت سے
محبت کرنے والوں سے
کسی بچّے سے‘ اُس کی رس بھری معصوم باتوں سے
محبت کرنے والے باپ سے
اُس کی ضعیفی سے
جو تم پر بوجھ ہو جائے
محبت کی گھنی چھاؤں سے
ماؤں سے
کبھی ناراض مت ہونا
شریکِ زندگی سے
مونس و دمساز بیوی سے
جب اُس کی عمر ڈھل جائے
ڈھلکتے جسم‘ پھیکے پڑ چکے رنگوں سے
تم ناراض مت ہونا
کبھی ناراض مت ہونا
کہیں ایسا نہ ہو
تم سے خدا ناراض ہو جائے!

— عثمان خاور

پہچان

فرح اسلم

''مَیں نہیں رہ سکتا اب اس مُلک میں۔کیا دیا ہے اس نے مجھے' فرسٹریشن' مایوسی! بس میں نے کہہ دیا ہے آپ سے' مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میرا رزلٹ نکل آیا ہے' اس لئے اب آپ میرا ویزا لگوا دیں۔'' یہ سب باتیں احمد اپنے والد سے کہہ رہا تھا۔اس پر والد نے سمجھایا:'' دیکھو بیٹا! یہاں سب کچھ ہے' عزت کی دال روٹی مل رہی ہے۔اپنی زمین ہے' اپنے لوگ ہیں' باہر ملکوں میں اپنا کچھ بھی تو نہیں۔آزادی کی قدر کرنا سیکھو!''

''عزت؟ سب پیسے کو سلام کرتے ہیں۔یہاں تو کسی کی جان بھی محفوظ نہیں۔راہ چلتے کو گولی مار دیتے ہیں۔پڑھے لکھے ہونے کے باوجود جاب نہیں ملتا۔اور اتنی گرد ہے کہ بندہ کھل کر سانس نہیں لے سکتا' گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر' سڑکوں پر کیچڑ اور گندے نالوں میں ننگ دھڑنگ بچے۔اُف توبہ۔نہیں بابا نہیں' اب مزید اس گندی فضا میں سانس نہیں لے سکتا۔باہر کے ملکوں میں دیکھیں' کوئی گرد نہیں' آزادی سے انصاف ملتا ہے' خوبصورت ملکوں کے خوبصورت لوگ۔'' احمد کسی طور مان ہی نہیں رہا تھا اور پھر بابا کو بھی ہار ماننا پڑی کہ اس وقت احمد کے سر پر باہر جانے کا بھُوت سوار تھا۔انہوں نے تھوڑی بہت زمین بیچی اور ٹکٹ اور ویزے کا انتظام کیا۔احمد کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔امریکہ جیسے ملک میں احمد نے گویا جنت پالی۔ لائق تو تھا ہی' اچھا جاب بھی مل گیا۔

پہلے پہل تو احمد نے گھر والوں کو پیسے بھیجے۔یہ بھی لکھا کہ آپ سب کو میں یہاں بلا لوں گا' لیکن پھر سب کچھ بھُول کر وہیں کا ہو رہا۔وہیں ایک پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی جو سوچ میں ان سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔

''ڈیڈی ہمارا ملک کہاں ہے؟'' ایک روز اپنی بارہ سالہ بیٹی ماریہ کے منہ سے یہ سوال سن کر احمد ٹھٹک گیا۔

''کیوں بیٹا تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔''

ڈیڈی! وہ میری کلاس فیلو کر رہی ہے ناں' وہ کہہ رہی تھی کہ امریکہ تمہارا ملک نہیں ہے۔تم اپنے ملک میں کیوں نہیں رہتی؟''

''نہیں بیٹا یہی ہمارا ملک ہے' تم یہاں پیدا ہوئی' تمہارا

بھائی اور بہن بھی۔ یہی ہمارا ملک ہے۔'' احمد نے گویا اپنی طرف سے اسے سمجھا دیا۔

جُوں جُوں وقت گزرتا گیا' ماریہ کے سوالات میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا: ''ڈیڈی یہ پاکستان کہاں ہے؟ میری ایک نئی دوست بنی ہے' عائشہ۔ وہ کہتی ہے ہمارا ملک پاکستان ہے۔ ڈیڈی وہ ہر سال پاکستان جاتی ہے۔ کہتی ہے کہ پاکستان بہت خوبصورت ہے۔''

''احمد جس بات سے ڈرتا تھا' جس بات کی اس نے اپنے بچوں کو ہوا بھی نہ لگنے دی تھی' آج اس کی بیٹی اُسی پاکستان کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ وہ ماریہ کو بتانے لگا: ''بیٹی یہ سچ ہے کہ میں پاکستان میں پیدا ہوا۔ تمہارے دادا' چچا سب وہیں رہتے ہیں' لیکن تم وہاں نہیں رہ سکو گی۔ تم وہاں اپنی پسند کی جینز' ٹی شرٹ نہیں پہن سکتی۔ اب امریکہ ہی ہمارا ملک ہے۔ میں پاکستان کو بھُول چکا ہوں' اس لئے تم بھی اس کے متعلق مت سوچو۔'' لیکن ماریہ کا اضطراب بڑھتا گیا اور آج تو وہ بہت ڈسٹرب ہوئی جب اس کی ایک کلاس فیلو نے اسے کہا: ''تم جپسی ہو' تمہارا کوئی گھر نہیں اور تم امریکہ کے ٹکڑوں پر پلنے والے غریب ملکوں کے لوگ ہو۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں اور تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم ہماری قومی تقاریب میں شرکت کرو۔''

آج پھر احمد سے اُس کی بیٹی پوچھ رہی تھی: ''ڈیڈی امریکہ میں ہماری حیثیت کیا ہے؟'' آج اس کی ماما بھی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

''ربش! ماریہ تم یہ کیسی باتیں سوچتی رہتی ہو۔ ہم امریکن ہیں اور ہماری حیثیت بھی ایک امریکن کی سی ہے۔''

''نہیں ماما' نہیں نا۔ ہم امریکن نہیں ہیں' ہم جپسی ہیں' یہ ہمارا مستقل گھر نہیں' ماما! جینز' ٹی شرٹ پہن لینے سے کیا ہم امریکن ہو گئے؟''

''میرے خیال میں یہ عائشہ تمہیں الٹی سیدھی باتیں بتاتی رہتی ہے۔ بس تم اس سے دوستی ختم کر دو اور خبردار جو یہ اُلٹی سیدھی باتیں ذہن میں بٹھائیں۔'' ماما نے اسے ڈانٹا۔

ماریہ کیا کرتی۔ عائشہ سے تو اس کی پکی دوستی تھی۔ وہ اس سے کیسے دوستی ختم کرتی۔ وہ ویسے بھی اسے پاکستان کے بارے میں بتاتی تھی۔

دن گزرتے گئے۔ اب وہ کالج میں تھی۔ ماما کے منع کرنے کے باوجود یہاں بھی اس کا زیادہ فارغ وقت عائشہ کے ساتھ گزرتا۔ عائشہ جب بھی موڈ میں ہوتی اسے پاکستان کے بارے میں بتاتی۔ ماریہ بہت دیر تک حیرانی سے اس کی باتیں سنتی۔ وہ ایک عجیب اُلجھن میں تھی۔ ڈیڈی کا کہنا تھا کہ پاکستان اچھا نہیں ہے اور عائشہ اسے پاکستان کے متعلق اچھی باتیں بتاتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جا کر خود دیکھے لیکن کیسے؟ آخر اس کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ ان کا سٹڈی ٹرپ پاکستان جا رہا تھا۔ اس نے ڈیڈی سے بات کی۔

''واٹ! کیا کہا؟ تمہارا ٹرپ جا رہا ہے پاکستان؟ لیکن

وہاں کیا ہے؟''

''ڈیڈی ٹیچر کا کہنا ہے کہ پاکستان میں بہت ورائٹی ہے۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو بھی پاکستان میں ہے۔اس کے علاوہ...''

''مجھے پتہ ہے' لیکن وہاں یہ سب کچھ دیکھ کر تم لوگ کرو گے کیا بھلا؟''

''ڈیڈی ہمیں ریسرچ کرنا ہے وہاں...''

وہ بھی آخر ضدی باپ کی بیٹی تھی۔اجازت لے کر ہی ٹلی'

''اور ہاں ڈیڈی مجھے دادا جان کا ایڈریس بھی دے دیں۔''

سارا سفر اس نے بڑے اشتیاق سے گزارا۔ائر پورٹ سے اُتر کر وہ سب ہوٹل چلے گئے۔وہ راستے میں گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔کتنا مختلف ہے یہاں سب کچھ' وہ سوچ رہی تھی۔اس کی بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی' جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

ہوٹل میں ایک دن آرام کرنے کے بعد اس نے سب سے پہلے اپنے دودھیال جانے کا فیصلہ کیا۔عائشہ کے ساتھ وہ ڈھونڈتے ہوئے ''پپی ہاؤس'' پہنچ ہی گئی۔ جب اس نے سب کو اپنے متعلق بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔دادا' دادی' چچا' چچی سب نے باری باری اسے چوما' سینے سے لگایا۔اسے سب بہت اچھا لگا۔وہ حیران تھی اور خوش بھی۔سب نے اسے ہوٹل سے یہاں شفٹ ہونے کو کہا اور پھر اس نے اپنی کالج فیلوز اور کزن کے ساتھ سارا ملک دیکھ ڈالا۔پاکستان کو اس نے عائشہ کی بتائی باتوں سے بڑھ کر خوبصورت پایا۔اس کی روانگی کے دن نزدیک آ رہے تھے۔اس کا واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ایک مہینہ گزر گیا۔

اس دن وہ اکیلی بیٹھی تھی کہ دادا جان اس کے کمرے میں آ گئے۔''کیا کر رہی ہے ہماری بیٹی؟'' انہوں نے پیار سے اسے قریب کیا۔

''بس جانے کا سوچ رہی تھی۔دادجان! کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم ہمیشہ کے لئے یہاں آ جائیں؟ ڈیڈی آخر پاکستان سے اتنا خائف کیوں ہیں؟''اس نے افسردگی سے پوچھا۔

''بیٹا! بات دراصل یہ ہے کہ وہ ناسمجھ ہے۔اس نے ایک آزاد ملک میں آنکھ کھولی۔اسے آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانی نہیں دینا پڑی۔ بلکہ اُسے آنکھ کھولتے ہی آزاد ملک ملا۔کاش وہ سمجھ سکتا کہ اس کے بزرگوں نے کتنی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا۔اپنے خون سے اس مٹی کی آبیاری کی۔ بیٹا! جس پرندے نے پنجرے کی قید نہ کاٹی ہو' وہ آزادی کی اُڑان کی حقیقت کو کیا سمجھے گا۔اس کو اس ملک میں کچھ نظر نہیں آتا جس کو بنانے کے لئے اس کے بزرگوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اپنا سب کچھ آنے والی نسلوں کے لئے قربان کر دیا' لیکن آنے والی نسلوں نے بزرگوں کی سینچی ہوئی زمین کی قدر نہ کی۔اگر وہ ذرا توجہ کریں تو ہر طرف ہریالی پھیلا سکتے ہیں۔ ماں جو بچے کی ہر تکلیف میں اس کا ساتھ دیتی ہے' کیا ماں کا کوئی حق نہیں بچے پر؟ اتنا حق بھی نہیں کہ بچہ اس کی

عزت ہی کر سکے اور احمد بیٹا شاید یہ بات نہیں جانتا کہ اپنی ماں میں چاہے کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں' وہ اپنی ہی ہوتی ہے' لیکن احمد بیٹے نے ماں کی قدر نہ کی۔ اسے واپس پاکستان آنا ہوگا' کہ ماں کی محبت کبھی نہ کبھی اسے ضرور تڑپائے گی۔''

ماریہ نے دیکھا کہ دادا جان کانپ رہے تھے اور ان کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے فوراً ہی ایک فیصلہ کیا اور یہ خط لکھ کر والد کو بھیج دیا۔

پیارے بابا

السلامُ علیکم!

آپ حیران مت ہوں کہ میں نے آج آپ کو ڈیڈی لکھ کر کیوں مخاطب نہ کیا۔ بابا یہی ہماری زبان ہے۔ آپ کی بتائی ہوئی باتوں کے برعکس پاکستان مجھے بہت اچھا لگا' یہاں سب کچھ ہے۔ میں نے تقریباً پورے ملک کی سیر کی ہے اور مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی شرم نہیں کہ پاکستان پوری دنیا سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں کے تاریخی مقامات کی شان' پہاڑی علاقہ جات کا بے مثال حُسن' چارسُو پھیلے ہرے بھرے کھیت' کھیتوں میں کام کرتے لوگ' ڈوبتے سورج کے بعد پھیلنے والی سرخی میں ملا ہوا' کچے گھروں سے اُٹھنے والا دھواں' کنوؤں سے پانی بھرتی معصوم لڑکیاں اور پیارے پیارے کھیل کھیلتے بچے! بابا سب کچھ بہت اچھا ہے' سب سے بڑھ کر۔ بابا آپ کو یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آیا؟ آپ کہتے ہیں پاکستان نے آپ کو کیا دیا؟ میں پوچھتی ہوں کہ آپ نے پاکستان کو کیا دیا؟ اس ملک کو جہاں آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی' جس ملک نے آپ کو تحفظ دیا' آپ نے اس ملک کے تحفظ کے لئے کیا کیا؟ میں مانتی ہوں آپ کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہوگی' لیکن آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ آئندہ یہ زیادتی کسی کے ساتھ نہ ہو۔ آپ پڑھے لکھے تھے' باشعور تھے' پھر آپ نے اپنی اعلیٰ تعلیم کو اپنے ملک میں استعمال کیوں نہ کیا۔ آپ کہتے ہیں وہاں گرد ہے' کرپشن ہے' سڑکیں ٹوٹی ہوئی ہیں' لیکن آپ نے یہ سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ آپ تو باشعور تھے' اپنے ملک کے مسائل سمجھتے ہوئے بھی آپ نے انہیں حل کرنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ راہِ فرار کیوں اختیار کی؟ مجھے یہ سب باتیں پاکستان نے سکھائیں' آپ کے اور میرے وطن پاکستان نے۔ آپ کہتے ہیں ہم امریکن ہیں۔ بابا! وہاں ہمیں کوئی پوچھتا بھی نہیں' یہاں سب بہت عزت کرتے ہیں۔ وہاں تو آج تک مجھے اپنے پڑوس کا ہی پتہ نہیں چلا' یہاں پورا محلّہ ایک فیملی کی طرح رہتا ہے۔ سب مجھ سے ملنے آئے' پیار کیا۔ بابا! یہاں مجھے کوئی نہیں کہتا کہ تم امریکہ میں پیدا ہوئی ہو' وہیں رہو۔ سب کہتے ہیں ہماری بیٹی آئی ہے اور پوچھتے ہیں کہ اب یہیں رہیں گی ناں؟ بابا کیا امریکہ میں یہ ساری محبتیں ہیں؟ آج آپ خود سے پوچھیں کیا آپ امریکن ہیں؟ بابا ہمارا ملک بہت اچھا ہے' مجھے یہاں کی گندی گلیاں امریکہ کی صاف ستھری سڑکوں سے اچھی لگی ہیں۔ مجھے یہاں کے میلے کچیلے بچے بُرے نہیں لگتے۔ امریکہ

جیسے ٹپ ٹاپ ملک میں لوگ اس محبت سے نا آشنا ہیں جو یہاں کے لوگوں کے خمیر میں رچی بسی ہے۔ بابا! آپ ضرور سوچیں۔ اگر آپ امریکہ میں مجھے یہ ساری خوبیاں ڈھونڈ دیں، تو میں ضرور واپس آجاؤں گی۔ اللہ حافظ! آپ کی بیٹی: ماریہ احمد

احمد بلند آواز سے خط پڑھتا جارہا تھا۔ خط ختم کر کے اپنی بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ ماریہ کے خط نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں آکر اس نے کیا پایا؟ اٹھارہ گھنٹے روزانہ جاب نے اس سے وہ آرام اور سکون چھین لیا جو پاکستان میں اسے میسر تھا۔ اسے بیڈ پر وہ نیند نہیں آتی جو وہاں خالی چارپائی پر آتی تھی اور یہاں کے فاسٹ فوڈز میں وہ مزا کہاں جو ماں کے پاس بیٹھ کر ان کے ہاتھ کے بنے گرم پراٹھے اور چُوری میں تھا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ جتنی عزت اور اپنائیت پاکستان میں تھی، وہ یہاں کہاں۔ پچھلے ہی ہفتے اس کی کمپنی کے مالک نے اپنی پراڈکٹ کے نمونے اس کے زیرِ نگرانی بھجوانے سے محض اس لئے انکار کر دیا کہ احمد غیر ملکی تھا۔ اپنا گھر بار، سب کچھ جس ملک کے لئے چھوڑا، وہ ملک اسے وہاں کے ایک عام شہری کی حیثیت دینے سے انکاری تھا۔ اب اسے وہ سب باتیں سمجھ آرہی تھیں جو ابّا نے آنے سے پہلے کہیں، لیکن کیا اتنے برسوں بعد وہ ملک اور وہاں کے لوگ اسے قبول کر لیں گے؟ اس نے سوچا، تو بابا کی آواز اس کے دماغ میں گونجنے لگی: ''اپنا وطن ماں کی آغوش کی طرح ہے۔ جب تم بہت تھک جاؤ تو ماں کی آغوش میں پناہ لے لینا۔''

احمد اب واقعی تھک چکا تھا۔ اپنا باقی وقت اپنے وطن اور اپنے لوگوں میں گزارنا چاہتا تھا اور اب ہی تو اسے یہ احساس ہوا تھا کہ اپنا ملک اپنا ہوتا ہے، جہاں اس کے ماں باپ اور سب اپنے اس کے منتظر تھے۔

پاکستان ہی اس کی اصل پہچان تھا!

یہ ارضِ پاک ہماری، نشانِ عزّت ہے
شناخت ہے یہ ہماری حِصارِ وحدت کی
شبِ مبارکۂ قدر میں مِلی ہے ہمیں
بہ فیضِ ختمِ رسالتﷺ خدا کی رحمت ہے
یہ میرا مُلک، مِری سرزمین، میرا وطن
مِرے خدا کا کرم ہے، اُسی کی قدرت ہے
مہِ صیام بھی ہے، قدر والی رات بھی ہے
قیامِ ارضِ وطن رحمتوں کی کثرت ہے
یہ مُلک، مُلکِ خداداد ہے خُدا کی قسم!
وجود اِس کا بہر طور اِک عنایت ہے
جو اِس کو خواب سمجھتے تھے، اُن کو جتلا دو!
کہ آج اِس کا قیام و بقا حقیقت ہے
مزاج اِس کے جوانوں کا خوب پہچانو!
کہ ہر جوان کو اِس سرزمیں سے اُلفت ہے
دُعا کرو کہ خدا ہم کو سرفراز کرے
اَدائے فرض کی تاریخ ہم پہ ناز کرے!

— سید محمود احمد

مولا تیرا شُکر ہے

اختر جمال

شیخ صاحب محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو انہوں نے اعلان سنا کہ زکوٰۃ لینے والوں کی فہرست بن رہی ہے اس کے لیے مستحق افراد کے نام دیے جائیں۔ شیخ صاحب نے جب یہ اعلان سنا تو انہیں فوراً بیوہ سرداراں کا خیال آیا۔ سرداراں ان کے ہاں دس سال سے برتن مانجھنے اور کپڑے دھونے آتی تھی۔ اب وہ بیمار رہنے لگی تھی۔ کئی بچے تھے۔ شیخ صاحب کی اہلیہ تنخواہ کے علاوہ بھی اس کی مدد کرتی رہتیں مگر حدیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں اس بات کی قائل تھیں کہ ایک ہاتھ دے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ شیخ صاحب کو آج تک معلوم نہ ہوسکا کہ ان کی بیوی سرداراں کی مدد کیسے کرتی ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ انہیں سرداراں کا دُکھڑا سناتے پایا۔

شیخ صاحب ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد آبائی گھر میں آ گئے جو شہر کے گنجان آباد علاقے میں ایک پرانی طرز کا پختہ مکان تھا۔ اگرچہ انہوں نے عمر بھر محکمہ تعلیم میں باعزت ملازمت کی لیکن ان کے پاس کبھی اتنا روپیہ جمع نہ ہوسکا کہ وہ پرانے آبائی مکان کی مرمت کرا سکتے۔ محنتی اور وضعدار آدمی تھے۔ بڑا کنبہ اور خاندان، کھلا ہاتھ، لین دین، بچوں کی تعلیم، شادیاں اور دوسرے اخراجات کی وجہ سے آخر کتنا کچھ بچا سکتے۔ اس کے باوجود وہ ہر ایک کی مدد کو تیار رہتے۔ اپنے پیشے کی وجہ سے ان کی ذات میں شفقت اور محبت جمع تھی۔ جب تک ملازمت میں رہے، سارا سکول انہیں ایک کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ شیخ صاحب کی بیوی بہوؤں کو گھر بار سونپ کر اللہ اللہ کرتیں۔ کسی کی مصیبت ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ ان کے دل میں ایسی تڑپ اٹھتی کہ اگر وہ کسی کی پریشانی دور نہ کرتیں تو عبادت میں بھی سرور محسوس نہ ہوتا۔ محلے کی غریب عورتیں ان کے پاس آتی جاتی رہتیں۔ وہ گھر میں بیٹھ کر بھی اہلِ وطن کی غربت کا حال اتنا زیادہ جانتی تھیں کہ این جی او بیگمات کی اکثریت کو بھی اتنا علم نہ ہوگا۔

سرداراں کے مسائل شیخ صاحب کی بیوی کے نوکِ زباں رہتے۔ جوان لڑکیوں کا بیاہ کرنا ہے، چھوٹے تین بچے پڑھ

رہے ہیں' کبھی کام مل جاتا ہے تو بڑا بیٹا اقبال مزدوری کر لیتا ہے' بارش ہو تو دیہاڑی بھی ماری جاتی ہے۔ سرداراں کی تمنا ہے کہ اسے ملازمت مل جائے تو پھر بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول دیکھے۔ اقبال کی پڑھائی باپ کی اچانک موت کے سبب چھوٹ گئی مگر وہ دونوں چھوٹے بھائیوں کو تعلیم دلانا چاہتا ہے اور ہر طرف نوکری کی کوشش کر کے اب ہمت ہار چکا ہے۔

سرداراں پہلے کئی گھروں کا کام کر لیتی تھی مگر جب سے صحت خراب ہوئی' دو ہی گھر رہ گئے تھے۔ اس کے شوہر نے بیٹیوں کے بیاہ کی خاطر ڈاک خانے میں پیسے جمع کرانے شروع کئے اور بیوی سے کہا تھا کہ یہ روپے بس ان کے بیاہ پر نکلوانے ہیں۔ اس کی موت کے بعد کبھی کبھی گھر میں پیسے کی بہت پریشانی ہوتی۔ چائے' دودھ' آٹا' دال' چھوٹے چھوٹے خرچ بھی بہت ہوتے' پھر بچوں کی پڑھائی لکھائی الگ تھی۔ کتابیں' کاپیاں' دوا علاج — کپڑے لتّے کی تو نوبت ہی نہ آتی' لیکن ان سب ضرورتوں کے باوجود سرداراں نے وہ پیسے نہیں نکلوائے جو اس کے خاوند نے لڑکیوں کے خیال سے جوڑنا شروع کئے تھے۔ وہ اگر ساٹھ روپے ماہوار جمع کراتا تھا' تو اب سرداراں تیس چالیس روپے ہی جمع کرا سکتی تھی۔ اس کے حساب سے ڈاک خانے میں بیس ہزار سے کچھ زیادہ ہی ہوں گے روپے۔

پڑوس کی عورتیں کہتیں سرداراں' ڈاک خانے سے پیسے نکلوا کر بیٹیوں کے لیے چیزیں خرید لے' مگر وہ ڈرتی تھی کہیں نکالتے ہی خرچ نہ ہو جائیں۔ وہ تب ہی نکلوائے گی جب دونوں کی بات پکی ہو جائے گی' آخر پرائے گھر کیا خالی ہاتھ جائیں گی۔ شیخ صاحب نے جب اپنی بیوی سے تذکرہ کیا کہ انہوں نے سرداراں کا نام زکوٰۃ کے مستحقین میں لکھوا دیا ہے تو وہ بولیں کہ یہ تو بڑا نیک کام کیا۔ بس اب اس غریب کی سب پریشانیاں دُور ہو جائیں گی۔

دوسرے دن جب سرداراں آئی تو شیخ صاحب نے اس کے کوائف قلم بند کیے۔ سرداراں کی آنکھوں سے پانی کا جھرنا یوں پھوٹا جیسے دس سال بعد ایک بار پھر بیوہ ہوگئی ہو۔ اسے تو کبھی کسی سے کچھ مانگنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اپنے اللہ اور اس کے دیئے ہوئے ہاتھ پاؤں پر اعتماد تھا اور اللہ کا شکر ادا کرتی تھی کہ حلال کی روٹی کھلا کر اپنے بچے پالے ہیں۔

شیخ صاحب کی بیوی بولیں: ''ارے یہ بھیک کے پیسے نہیں۔ یہ تو تیرا حق ہے۔''

''حق.....تو پھر ان لوگوں سے کہیں میرے بیٹے کو کام دلا دیں۔ اسے نوکری مل جائے تو میری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ میرا بچہ کسی بری عادت کا شکار نہیں۔ کبھی سگریٹ بھی نہیں پی مگر آج کل کی مہنگائی! کسی دن مزدوری ملتی ہے کسی روز نہیں' آپ کو تو پتہ ہے پانچ چھ آدمیوں کے کنبے کی دو وقت کی روٹی کا کتنا خرچہ ہے۔ ساجدہ اور حمیدہ سارا دن مشین چلاتی ہیں' تب گزر بسر ہوتی ہے۔ ان کی آمدنی میں بمشکل سَو

ڈیڑھ سَو روپے جمع ہوتے ہیں۔کل کو ان کا بیاہ بھی کرنا ہے۔''

''سرداراں! اب تُو کوئی فکر نہ کر۔ تیرا نام سرکار میں لکھا جائے گا تو سب پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔'' شیخ صاحب کی بیوی اسے دلاسا دیتی رہیں۔

وہ کہتی: ''بی بی! جن گھروں میں کام کرتی ہوں' انہوں نے خود محبت سے بچوں کو کچھ دے دیا تو دے دیا مگر میں نے آج تک بھیک نہیں مانگی۔ اب آخر میں خیرات لے کر مرنے والے کی روح کو دکھ دوں؟''

''اری نہیں' تیری عقل الٹی ہے۔ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی پریشانیاں اور مصیبتیں دور کرے۔ دوا' علاج اور روزگار فراہم کرے۔ یہ خیرات نہیں' تیرا حق ہے اور اب حکومت غریبوں کو ان کا حق دینا چاہتی ہے۔''

سمجھانے بجھانے کے بعد آخر کار سرداراں نام لکھوانے پر تیار ہوگئی۔ ''اچھا بی بی! لکھوا دو نام' اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

گنجان آباد محلے کی ایک چھوٹی سی گلی اِدھر اُدھر مڑ کر شہر کے اُس محلے میں نکلتی تھی جہاں سبزی اور پھلوں کی دکانیں تھیں۔ اندھیری گلی میں کیچڑ' پھسلن ہوتی' اور نالی کھلی رہتی۔ وہیں ایک چھوٹے سے گھر کی دو سیلی کوٹھریاں سرداراں نے کرائے پر لے رکھی تھیں۔ بیٹے نے کئی بار کہا کہ ہمیشہ سیل میں رہنے کی وجہ سے تجھے کھانسی رہتی ہے' کوئی دوسرا گھر بدل لیں' مگر سرداراں کو نو سو روپے ماہوار پر اس سے اچھا ٹھکانہ اور کہاں ملتا۔ وہ بیٹے سے کہتی: ''اب دیکھ' شیخ صاحب کتنے بڑے آدمی ہیں' ہر طرف ان کی عزت' مگر گھر کے اندر کا جو حال ہو رہا ہے' وہ مَیں ہی جانتی ہوں۔ اندر کے دو کمرے اتنے ٹپکتے ہیں کہ برسات میں کوئی سو نہیں سکتا۔ بیٹے! جب ایسے لوگ گھر نہیں بدلتے تو ہم کیسے اچھا مکان ڈھونڈ سکتے ہیں۔ پکے فرش کا دو کمروں والا اچھا مکان آج کل دو ہزار روپے سے کم کرائے کا نہیں ملے گا۔''

اس پر سب بچے چپ ہو جاتے۔

سرداراں اپنی اولاد کو ہمیشہ صبر اور شکر کی تلقین کرتی رہتی۔ جب گھر میں داخل ہوتی' تو تھک کر چارپائی پر ڈھیر ہو جاتی۔ پھر بیٹی گرم گرم روٹیاں اور اچار کی پھانک آگے رکھ کر گھڑے سے ٹھنڈے پانی کی بٹھلی بھر کر دیتی تو سرداراں پیار سے ان دونوں کو بلاتی۔ ماں بیٹیاں ہنسی خوشی کھانا کھاتیں۔ سرداراں پانی کا گھونٹ گھونٹ پیتی اور کہتی جاتی: ''مولا تیرا شکر ہے! ٹھنڈا میٹھا پانی تیری کتنی بڑی نعمت ہے' دھوپ کے بعد گھر کا سایہ کتنا اچھا لگتا ہے' سیل کی بو اور مسلسل نمی کے باوجود کوٹھریاں دھوپ سے آ کر کیسی اچھی لگتی ہیں۔ پھر اپنے بچوں کی صورتیں دیکھ کر کیسی راحت ہوتی ہے' ساری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ مولا تیرا شکر ہے!''

بیٹی کپڑے دکھاتی: ''دیکھو ماں یہ شیخ صاحب کی بچی کی شلوار کے پائنچے کیسے بنائے ہیں۔''

''اچھے ہیں بیٹی۔'' وہ حوصلہ بڑھاتی۔ اس نے سوچا

اب سلائی کے جو پیسے آئیں گے‘ وہ ڈاک خانے میں جمع کرادے گی۔ اسے حکومت کی طرف سے امداد ملنے والی ہے‘ لہٰذا لڑکیوں کی کمائی ان کے جہیز کے لیے جمع کرے گی۔ اس وقت بیس ہزار کے قریب جمع ہیں‘ دونوں کے لیے سونا بھی آ سکے گا کیا؟ سونا! چلو چاندی ہی کی دو دو بالیاں دونوں کے لیے بن جائیں‘ برتن پلنگ وغیرہ ضرورت کی چیزیں بھی تو خریدنا ہوں گی۔

شیخ صاحب کی بیگم کی باتیں یاد کر کے وہ بڑا سکون محسوس کرتی۔ اب تو سرکار میں نام لکھا گیا ہے۔ بس اب سب پریشانیاں دُور ہو جائیں گی‘ بیٹیوں کی شادی‘ بچوں کی تعلیم... آخر شیخ صاحب نے ساری باتیں ہی لکھی ہیں۔ پہلے کوئی ہمارا حال سرکار میں کہنے والا نہ تھا مگر اب سب کے نام لکھے جا رہے ہیں۔

اقبال شام کو گھر آیا تو اس نے ماں کے ہاتھ پر دو سو روپے رکھے۔ ”آج دھوپ اچھی تھی‘ ایک ٹھیکیدار کے ساتھ کام مل گیا۔ دھوپ رہی تو کل بھی کام ہوگا۔“ سرداراں بولی: ”بیٹے! اب تجھے نوکری مل جائے گی۔ ہماری مشکلیں دُور ہو جائیں گی۔ شیخ صاحب نے میرا نام سرکار کے پاس لکھوا دیا ہے۔“

”ماں تُو نے خیرات کے لیے نام کیوں لکھوایا؟ تجھے چاہئے تھا بس میری نوکری کی بات کرتی۔“

”ہاں بیٹے! مَیں نے تو نوکری کے لیے ہی کہا تھا‘ مگر شیخ صاحب نے کہا کہ نوکری دلانا میرے اختیار میں نہیں‘ نام ہی لکھوا سکتا ہوں۔ بیٹے! محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی سفارش کی ہے‘ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے اب نوکری نہ دیں۔ میں نے ساری عمر محنت مشقت کی ہے‘ میں کیوں خیرات لینے لگی...؟ حکومت تو میرا حق دینا چاہتی ہے۔ شیخ صاحب کی بیگم کہہ رہی تھیں کہ یہ خیرات نہیں‘ حکومت کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کو روزگار‘ تعلیم اور علاج کی سہولتیں دے... بیٹے! تجھے نہیں معلوم اب اچھے دن آ رہے ہیں۔“

اقبال نے حیرت سے ماں کی صورت دیکھ کر کہا: ”ماں اللہ تیری زبان مبارک کرے!“

سرداراں نے چھوٹے بیٹے کو آواز دے کر دو سو روپے کا سودا بتایا۔ چائے کی پڑیا‘ کھلا گھی‘ کپڑے دھونے کا صابن اور چینی... بغیر سفارش کون دے گا ہمیں چینی اور کون لے اتنی مہنگی چینی۔ بیٹے نے آ کر بتایا کہ ماں چینی کے علاوہ سارا سودا لے آیا ہوں‘ لیکن دکاندار نے پچاس روپے لکھ لئے ہیں۔ پیسے کم پڑ گئے تھے۔ ”اچھا کل دے آنا۔ پائنچوں کی بنوائی بھی آئے گی اور کل دھوپ بھی ضرور نکلے گی... ہاں‘ ضرور نکلے گی۔“ سرداراں نے آسمان کو دیکھ کر کہا۔

جب یہ بات طے ہو گئی کہ سرداراں کو حکومت کی طرف سے امداد ملے گی تو اس نے عید پر سارے بچوں کے نئے کپڑے بنانے کا ارادہ کر لیا مگر عید کے دن قریب آ رہے تھے۔ شاید امداد کے روپے بعد میں ملیں... سرداراں نے

سوچا کہ وہ ڈاک خانے سے روپے نکلوا لیتی ہے' جب امداد ملے گی تو پھر بچیوں کے پیسے جمع کروا دے گی۔

دوسرے ہی دن وہ ڈاک خانے گئی۔ انگوٹھا لگا کر جمع پونجی میں سے دو ہزار روپے نکلوائے ... اور پھر پچاس روپے زکوٰۃ کے کٹ گئے' دو ہزار روپے نکلوا لئے' اب اٹھارہ ہزار روپے جمع ہیں۔

زکوٰۃ کے پچاس روپے کٹنے پر سرداراں خوش ہوگئی۔ مولا تیرا شکر ہے! میں بھی کسی کی مدد کے قابل ہوگئی۔''

دو ہزار روپے میں سب کے لئے نئے کپڑے تو نہ آ سکے مگر بہنوں نے اصرار کر کے بھائیوں کے لئے نئے کپڑے سی دیئے۔ کئی دن دھوپ رہی' اقبال کام پر جاتا رہا اور اتنی مزدوری جمع ہوگئی کہ بہنوں کے لئے نئے دوپٹے اور ماں کے لئے نئی چادر خرید لایا۔ اس عید پر وہ سارے بہت خوش تھے۔ شیخ صاحب کی بیگم نے پہلے کی طرح اس عید پر بھی اچھی خاصی رقم دی۔ اس سے سب کے لئے چپل آ گئے۔ سویّاں اور میدہ بھی لے کر رکھ لیا۔ سرداراں نے سوچا اب کے وہ بھی اپنے ہمسایوں کو سویّاں بھیجے گی۔

رمضان کے آخری ہفتے میں سرداراں کو امداد ملنی تھی۔ شیخ صاحب کی بیوی کا جملہ اسے یاد آتا: ''سرداراں! تجھے تیرا حق ملے گا۔'' جب بھی تھک کر لیٹتی' اسے یہ جملہ یاد آتا۔ ہمسائی نے بھی بتایا کچھ لوگ اس کی بابت معلومات کرنے آئے تھے اور سب نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔

وہ سب سرداراں کی طرح غریب اور پریشان حال تھیں' مگر ان کے سر پر خاوندوں کا سایہ تھا۔ دکھ درد اپنے مردوں سے کہہ سکتی تھیں۔ لڑ جھگڑ کر چھوٹی موٹی فرمائشیں بھی پوری کرا لیا کرتی تھیں مگر غریب سرداراں کا کون تھا جو اس کے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھے۔ اب اقبال خیر سے ہوشیار ہوگیا تھا' اس لیے ان سب نے سرداراں کو امداد دینے کی پُرزور سفارش کی تھی۔ وہ ان سب کی شکر گزار تھی جنہوں نے سرکار سے اس کا حق دلانے کی کوشش کی۔ وہ ہر وقت سب کے لیے دعائیں کرتی رہتی۔

جوزف سرداراں کا پڑوسی اور کمیٹی میں نوکر تھا۔ ایک صاحب کے ساتھ ولایت چلا گیا۔ پھر وہیں رہ گیا۔ اب کی بار جو وہ اپنے رشتے داروں سے ملنے آیا تو اس نے ولایت کی نئی بات سنائی۔'' وہاں تو بے روزگاری کی بھی تنخواہ ملتی ہے۔ علاج دوا سب سرکار کے ذمے ہوتا ہے۔'' جب سے سرداراں کا نام لکھا گیا تھا' محلے کے لوگ جوزف سے کہہ رہے تھے کہ اب پاکستانیوں کے دن بھی بدل جائیں گے۔ اب یہاں بھی سب کو حق ملے گا۔ روزگار کا حق' تعلیم کا حق' دوا اور علاج کا حق... آخر لوگ گلیوں گلیوں گھوم کر نام جو لکھ رہے ہیں تو کوئی نتیجہ ضرور نکلے گا۔ ہر سیلی کوٹھری میں رہنے والی کمزور بیمار اور غم زدہ عورت جو کہیں نہ کہیں برتن صاف کرتی' جھاڑو دیتی یا پھر سارا دن روئی کی مشین چلاتی' اب اپنے حق اور ایک خوبصورت' صاف ستھری زندگی کا خواب دیکھ رہی

تھی۔ صاف ستھرا گھر، روزگار، علاج، بچوں کی تعلیم یہ سب چیزیں شہریوں کا حق ہیں۔ یہ حق دینا حکومت کی ذمے داری ہے۔ اب ان سب کو حق ملنے والا ہے۔ ہر ہر گلی اور کوچے میں نام لکھنے کی مہم چل رہی تھی۔

پھر ایک دن سرداراں محلّہ زکوٰۃ کمیٹی کے ارکان کی سفارش پر لفافہ لینے گئی، اپنے حق کا لفافہ۔ شیخ صاحب، پڑوسیوں اور ان سب لوگوں کو اس نے دعائیں دیں جنہوں نے اس کا نام لکھوانے اور حق دلانے میں مدد کی تھی۔ جب وہ لفافہ لینے قطار میں کھڑی ہوئی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے ایسی تھکن محسوس ہو رہی تھی جیسی دس میل چل کر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس نے پرانا بوسیدہ برقع اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا، نئی چپل اور چادر لی تو سب نے کہا کہ اب برقع رہنے دو، مگر اسے اتنے بڑے بڑے لوگوں میں کھلے منہ جانا اچھا نہ لگا۔ محلے پڑوس میں تو وہ چادر ہی میں چلی جاتی تھی۔

جب قطار میں کھڑی ہو کر اس نے لفافہ لیا تو ہر طرف تیز روشنی پھیل گئی۔ جیسے بجلی چمکتی ہے۔ کسی نے بتایا کہ ٹی وی والے تصویر اتار رہے ہیں۔ اس تصویر سے ساری دنیا جان جائے گی کہ سرداراں کو اس کا حق مل گیا ہے۔

سرداراں جب لفافہ لے کر لوٹی تو اس کے صحن میں محلے کی سب عورتیں جمع تھیں۔ آخر اتنے دن لکھت پڑھت ہوتی رہی، سب پوچھنے آ رہے تھے۔ محلے کی جن جن عورتوں نے اس کے حق میں گواہی دی تھی، وہ سب آگے آگے تھیں، دیکھیں

> حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوش ہو کر فرمایا کہ جبریلؑ نے ابھی ابھی مجھے میری اُمت کے لیے اللہ کی جانب سے یہ خوشخبری دی ہے کہ ''اے ابنِ آدم! تُو میرے تھوڑے دیئے ہوئے سے خوش ہو جا، قیامت کے دن میں تیرے تھوڑے کئے ہوئے سے راضی ہو جاؤں گا۔'' (صحیح مسلم۔ صحیح بخاری)

اب سرداراں کو سرکار سے کیا مدد ملتی ہے۔ اقبال کی نوکری کی بات تو اس نے ضرور کی ہوگی۔

اچھا ہے بیچاری کا کچھ تو بھلا ہُوا۔

سرداراں نے واپس آتے ہی پانی کی بٹھلی پی اور کہا:

''مولا تیرا شکر ہے!''

سب کی نظریں لفافے پر تھیں۔ ٹھنڈا پانی پی کر جب ذرا سانس لی تو سرداراں نے سب کے سامنے لفافہ کھولا۔

لفافے میں چار سو روپے تھے!

سرداراں نے کچھ سوچ کر کہا: ''ڈاک خانے والوں نے پچاس روپے کاٹے تھے، وہ سرکار نے لوٹا دیئے، تین سو پچاس اور دے دیئے ہیں، چلو اچھا ہے میرے پچاس کسی غریب کے کام آ جائیں گے۔ مولا! تیرا شکر ہے!''

''ٹھنڈا میٹھا پانی تیری کتنی بڑی نعمت ہے۔'' وہ دوسری بٹھلی خالی کر کے بولی:

''مولا تیرا شکر ہے!''

ماں

ابیہا مسعود

ماں کی میّت میرے سامنے رکھی ہے' اسے ہسپتال سے لے کر سرد خانے تک جانا ہے۔ سرد خانے تک لے جانے کے لیے ایمبولنس چاہیے۔ ایمبولینس کا کرایہ ادا کرنا ہوگا' پھر غسل وکفن اور اس کے بعد تجہیز وتکفین تک ایک لمبا سلسلہ ہے جبکہ میری جیب میں بمشکل ہزار بارہ سو روپے ہیں..... کیسے ہوں گے یہ سارے انتظامات؟ کہاں سے پورے ہوں گے یہ سارے اخراجات؟

ماں کا جنازہ سرکاری ہسپتال کے بستر پر پڑا ہے' بالکل ساکن۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ماں بول رہی تھی۔ اسے گھر جانے کی جلدی تھی' مگر گھر جانے سے قبل ہی وہ سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئی۔ شاید ماں کو میرے حالات کا اندازہ تھا۔ جبھی تو اس نے ڈاکٹروں تک کو کوئی موقعہ نہیں دیا۔ ایمبولینس کو دو سو روپے دے کر میں ماں کی میّت کو سرد خانے رکھوا آیا۔ سرد خانے میں میّت رکھوانا اس لیے ضروری تھا کہ ماں کے دو بڑے بیٹے شہر سے باہر تھے۔ سرد خانے سے میں سیدھا قبرستان پہنچا' گورکن سے قبر تیار کروانے کے تین ہزار روپے کا تقاضا سن کر مجھے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ تین ہزار روپے کہاں سے لاؤں گا۔

گورکن نے مجھ سے قبر تیار کرنے کے لیے پوچھا لیکن میں کوئی جواب نہ دے سکا بلکہ میرے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ چھ سو روپے میری جیب میں پڑے تھے اور لمبے چوڑے اخراجات منہ کھولے میری طرف بڑھ رہے تھے۔

قبرستان سے گھر پہنچا' تو دروازے پر ہی صابرہ کھڑی تھی۔ ماں کے بارے میں پتہ چلا تو ایسے روئی کہ میری نہیں' اس کی ماں مری ہو۔ جب خوب رو چکی تو سب سے پہلا سوال یہی کیا کہ اب آگے کیا ہوگا؟ ماں کو ملا کر ہم چار ہی افراد تھے گھر میں۔ ماں' مَیں' صابرہ اور میری بیٹی ہاجرہ..... ماں جی میری سگی ماں نہیں تھیں۔ میں صرف چار سال کی عمر میں ماں کی شفقت اور محبت سے محروم ہوگیا تھا۔ ماں کے انتقال کے دو سال بعد ہی ابا جی نے ماں جی سے شادی کر لی تھی۔ ماں جی اپنے ساتھ اپنے دو بیٹے بھی ہمارے گھر لائی تھیں۔ وہ جو

ایک خلا اور محرومی کا احساس تھا' ماں جی کے آنے کے بعد پُر ہوگیا۔ ماں جی نے کبھی بچوں کے درمیان تفریق نہیں کی۔ ابا شہر کے ایک بینک میں معمولی ملازم تھے۔ ماں جی بھی پڑھی لکھی نہیں تھیں' لیکن وہ چاہتی تھیں کہ ہم تینوں پڑھ لکھ جائیں۔ ابا جان کی جتنی تنخواہ آتی' اس میں سے زیادہ ہماری پڑھائی لکھائی پر اُٹھ جاتی۔ بہت برے حالات تھے' مگر ماں جی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ لاتی تھیں۔ ماں جی کے دونوں بیٹے مجھ سے بڑے تھے۔ دونوں نے میٹرک کیا اور قصبہ چھوڑ شہر کا رخ کرلیا۔

میری پڑھائی کے دوران ہی ابا جان کا انتقال ہوگیا' اس لیے میں میٹرک نہ کرسکا۔ ماں نے بہت کہا' بہت واسطے دیئے'' پتر تو پڑھ لکھ لے' میں کام کروں گی' لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھا کر کے تجھے پڑھاؤں گی'' لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس لیے مڈل کے امتحانات سے پہلے ہی میں ابا جان کے ٹیلر دوست رشید چچا سے ٹیلرنگ سیکھ چکا تھا اور دکان پر بھی باقاعدگی کے ساتھ بیٹھنے لگا تھا۔ وقت بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھا۔ ماں جی کے دونوں بیٹے پڑھ لکھ گئے تھے۔ وہ شہر سے آکر ماں جی کو اپنی شکل دکھلا جاتے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے آنے کا دورانیہ بھی کم ہونے لگا۔ دونوں نے شہر میں ہی شادی کرلی' ماں جی کو بھی بلوایا مگر ماں جی نہیں گئیں۔ ''نہیں پتر منصورا کیلا ہوجائے گا۔ میرے علاوہ ہے ہی کون اس کا خیال رکھنے والا۔'' اُن کا جواب ہوتا۔

ماں جی کی محبتیں انمول تھیں۔ اپنے سگے بیٹوں کا سہرا تو وہ باندھ نہ سکیں لیکن جلد ہی میرا سہرا باندھنے کی خواہش ان میں زور پکڑنے لگی اور بالآخر صابرہ کی صورت میں انہوں نے اپنی خواہش پوری کرلی۔ صابرہ میں ماں جی نے شاید اپنا عکس دیکھ لیا تھا' اس لیے پہلی ہی نظر میں صابرہ کو فوراً پسند کرلیا۔ میری قلیل آمدنی میں جس طرح وہ گھر چلاتی تھی' وہی جانتی ہے۔ شادی کے دو سال بعد ہاجرہ آگئی۔ ماں جی کی تو گویا من کی مراد پوری ہوگئی۔ ہاجرہ کی تمام ناز برداریاں ماں جی ہی اٹھاتیں۔

ساری زندگی ماں جی نے میرے لیے وقف کردی تھی۔ اپنے سگے بیٹوں سے بڑھ کر چاہا تھا مجھے' اور اب میرا فرض تھا کہ میں ان کے لیے کچھ کروں' لیکن کتنا مجبور تھا میں کہ ماں کو ان کی آخری منزل پر بھی نہیں بھیج پا رہا تھا۔ ابا جی کے انتقال کے بعد سے وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھی تھیں' جب تک میں روزگار پر لگ نہ گیا تھا۔ اب کچھ عرصہ قبل ہی تو تھوڑا چین نصیب ہوا تھا لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ ماں سنبھل نہ سکیں۔ رہ رہ کر ماں کا خیال' ان کی باتیں میرے ذہن میں گردش کررہی تھیں۔ صابرہ مجھے چھوڑ کر اندر جاچکی تھی۔ ہاجرہ بھی ماں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ اسی لمحے ماں جی کی سہیلی پڑوسن نے آکر بتایا کہ اُن کی وصیت تھی کہ مجھے دفن کرنے سے پہلے میرا بیٹا اور بہو میرا صندوق ضرور کھولیں۔

یہ ایک چھوٹا سا صندوق تھا جو ماں جی شادی کے وقت

اپنے ساتھ لائیں تھیں ۔ محلے کی عورتوں کے اصرار پر ہاجرہ بیٹی نے صندوق کھولا اور چلّانے لگی: ''ابا جی ادھر آیئے امی جی ادھر آیئے''۔ مَیں اور صابرہ ایک ساتھ ہی کمرے کی طرف بھاگے۔ ہاجرہ ماں جی کا صندوق کھولے کھڑی تھی اور اس کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی تھی۔ اس نے پوٹلی فوراً اپنی ماں کے حوالے کردی اور میرے گلے لگ کر رونے لگی۔ صابرہ نے پوٹلی کھولی تو اس کے ساتھ میں بھی حیران رہ گیا۔ پوٹلی میں پیسے تھے اور ان کے ساتھ چٹھی بھی۔ ماں جی چٹی اَن پڑھ تھیں، انہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا پھر یہ چٹھی کہاں سے آئی؟ میں نے صابرہ کے ہاتھ سے پوٹلی لے کر اس میں سے چٹھی نکالی، چٹھی کافی پرانی تھی کیونکہ جس کاغذ پر لکھی گئی تھی، وہ کافی بوسیدہ ہوگیا تھا۔ اس چٹھی میں لکھا تھا کہ ''منصور میری وصیت کے مطابق آج نہیں تو کل تُو اس صندوق کو کھولے گا ضرور اور یہ چٹھی تیرے ہاتھ لگے گی۔ تُو جانتا ہے تیری ماں کوری اَن پڑھ ہے اس لیے ماں کی خواہش تھی کہ تم تینوں بھائی پڑھ لکھ جاؤ۔ ماں تجھ پر واری کہ تو نے ماں کا خیال کیا اور لکھنے پڑھنے کی عمر میں ہی کام دھندے پر لگ گیا۔ مجھے لوگوں کے برتن دھونے سے بچانے کے لیے۔ تُو میری سگی اولاد نہیں لیکن اللہ گواہ ہے میں نے تجھے اپنے سگوں سے بڑھ کر پایا۔ وہ دونوں ایسے گئے کہ پلٹ کر ماں کی خبر ہی نہ لی اور تُو نے جو کہ میرا سگا بھی نہ تھا، تو نے اپنوں سے بڑھ کر خدمت کی میری ..... پتر میں راضی تجھ سے، میرا اللہ راضی

> بدنصیب ہے وہ شخص جس نے اپنے ماں باپ یا ان میں سے کسی کو بھی زندہ دیکھا اور ان کی خدمت نہ کی کہ ماں ٹھنڈی چھاؤں اور باپ اپنی اولاد کی مصیبتوں کے سیلاب کے آگے آہنی دیوار ہے۔
> (روایت: حضرت ابو ہریرہؓ۔ صحیح مسلم)

رہے تجھ پر۔ ماں کی دعائیں ہمیشہ تیرے ساتھ۔ پتر چٹھی اس لیے لکھوا رہی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تجھے کوئی پریشانی نہ ہو۔ یہ پیسے میری حق حلال کی کمائی کے ہیں۔ پتر تیرے کام پر لگ جانے کے بعد تو نے مجھے لوگوں کے گھروں میں کام کاج سے منع کر دیا تھا، پر پتر میں اکیلی رہتی تھی دن بھر، اس لیے تیری شادی سے پہلے تیرے کام پر جانے کے بعد محلے کے بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی تھی، وہ لوگ منع کرنے کے باوجود پیسے ہدیہ دیتے تھے۔ وہ پیسہ جمع ہوتا رہا کہ ضرورت کے وقت کام آئے گا مگر میرا مولا صبر کا پھل دے گا اور اچھے دن دکھائے گا۔ مجھے پتہ ہے میرا پیسہ تو لے گا نہیں۔ اس لیے ان پیسوں کو صندق میں ہی رکھ رہی ہوں کہ بوقت ضرورت کام آئے، بلکہ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ان پیسوں میں سے تُو میرے کفن دفن میں خرچ کرے۔ پتر ماں کی یہ خواہش پوری کرنا .....''

چٹھی میرے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

مَیں، صابرہ اور ہاجرہ بلک بلک کر رو رہے تھے۔

ماں نے مجھے شرمندگی سے بچالیا!

گوشۂ ظرافت

مشاعرہ آن لائن

قندیل رحمٰن

امتحان سے فارغ ہوتے ہی ہم بندوق سے نکلی گولی کی طرح پہلی گاڑی پکڑ کر گھر پہنچے اور کمپیوٹر پر جا جھپٹے۔ ایک زمانہ گزر چکا تھا انٹرنیٹ استعمال کئے ہوئے' مگر وہ ہمارے تابش بھائی ہی کیا ہوئے جو ہمیں دو منٹ خوش دیکھ لیں۔ نہایت بدذوقی سے ہم سے کی بورڈ چھیننے لگے تاکہ اپنی ای میل چیک کرسکیں۔ اسی چھینا جھپٹی میں نجانے کون سا بٹن دب گیا کہ ایک ویب سائٹ کھُل گئی جس کا نام تھا:

www.shuara.com (شعرا' ڈاٹ کام)

ہم نے بھائی جان کو امی جان کے ذریعے کمرے سے باہر نکلوایا اور لگے سائٹ دیکھنے۔ تعارف میں لکھا تھا: ''یہ ویب سائٹ پاکستان کے شاعروں نے بنائی ہے تاکہ عام لوگ ان سے رابطہ کرسکیں۔ آپ ایک چیٹ روم میں اینٹر ہوکر آن لائن شاعروں سے بات کرسکتے ہیں۔'' ہم نے اینٹر کے آپشن پر کلک کیا۔ چیٹ روم میں داخل ہوتے ہی ہم نے ٹائپ کیا: السّلامُ علیکم۔ سکرین پر وعلیکم السّلام لکھا نظر آیا۔

ہم:

کیا آپ سب شاعر ہیں؟

احمق پھپھوندوی:

احمق مَیں ہوں اور یقین آپ کو نہیں آ رہا!

ہم:

جی... دراصل وی آئی پی لوگ عام بندے کی پہنچ میں نہیں ہوتے ناں...

انور مسعود:

ارے ہم کہاں کے وی آئی پی ٹھہرے— ہم تو عاجز سے بندے ہیں' آپ کو یقین دلانے کے لئے ایک ہلکا پھلکا' نمکین سا مشاعرہ نہ ہوجائے!

ہم:

نیکی اور پوچھ پوچھ— مَیں آپ سے حالاتِ حاضرہ کے بارے میں بھی بات کرسکوں گی کیا؟

فاخرہ بتول:

ضرور ضرور' بسم اللہ کیجئے۔

ہم:

آج کی بجٹ تقریر پر کوئی تبصرہ؟

ڈاکٹر فرخ سلطان:

آمدن پر، سیلز پر، دولت پہ، جائیداد پر
ہر طرف خنجر نظر آیا ہے لٹکا ٹیکس کا
سانس تک لینے کی نوبت آ گئی ہے ٹیکس کی
پھر بھی ظالم بھر نہیں پایا ہے مٹکا ٹیکس کا

ہم:

یہ سارا معاملہ آپ پر کیسے اثر انداز ہُوا؟

انور مسعود:

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلے سے بڑھ کے ہے
ہر ضربِ کربناک پہ مَیں تِلملا اُٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بِل اتنے مل گئے ہیں کہ مَیں بِلبِلا اُٹھا

ہم:

نئی کابینہ میں کیا کوئی شاعر بھی وزیر بنے ہیں؟

سعید آغا:

یار جو بھی مل گیا اُس پر وزارت لاد دی
جانے کیا تعبیر نکلے، ذہن میں خنّاس ہے
رات مَیں نے خواب دیکھا ہے وِفاقی قِسم کا
میں وزیرِ باجرہ ہوں، تُو وزیرِ گھاس ہے

ہم:

بہت شکریہ! ہمیں وزیرِ گھاس بنانے کا، گو خوابوں کے دیس کی وزیر.....لیکن یہ کیا کہ وزارتیں بقول آپ کے یاروں میں بٹ گئیں اور تعلیم یافتہ افراد یعنی شعراء کو نو لفٹ!!

پاپولر میرٹھی:

اس مرتبہ بھی آئے ہیں نمبر تیرے تو کم
رُسوائیوں کا کیا مِری دفتر بنے گا تُو؟
بیٹے کے سر پہ دے کے چپت باپ نے کہا
پھر فیل ہو گیا ہے! منسٹر بنے گا تُو؟

ہم:

جی قدوائی صاحب! آپ عینی شاہد ہیں، تو ضرور بتائیے کہ چپت کھانے کے بعد بیٹے نے کیا کہا والد صاحب سے؟

ناظر قدوائی:

قوم کے درد میں مَیں قوم کا لیڈر ہوتا
یا تمنا ہے کہ چھوٹا سا منسٹر ہوتا
اور یہ بھی جو نہ ہوتا تو کم از کم والد
ایک اچھی سی منسٹر کا ہی شوہر ہوتا

ہم:

علامہ پاکٹ مار نے ہمارے کالج میں اسی موضوع پر چند اشعار سنائے تھے اور اس کی قیمت بھی ادا کرنا پڑی تھی اُن کو۔ کیا وہ شعر...

علامہ پاکٹ مار:

ایک بنگلہ ہو ایک پاکٹ ہو
پَل کی پَل میں امیر ہوجاؤں
دستخط تو مجھے بھی آتا ہے
کاش! مَیں بھی وزیر ہو جاؤں

ہم:

بطور وزیرِ گھاس سوچ رہی ہوں کہ ہماری زِراعت بھی گھاٹے کا سودا بن گئی۔ کیا وزیرِ باجرہ اس کی وجہ بتائیں گے؟

سعید آغا:

تشویش و اضطراب سے کہتا تھا اِک کساں
امریکی سُنڈیاں مِرے کھیتوں میں آ گئیں
مَیں نے کہا میاں تجھے کھیتوں کی فکر ہے
کم بخت سُنڈیاں تو ترا مُلک کھا گئیں

ہم:

شاید یہ فیشن بھی سُنڈیوں کے ساتھ آیا ہے کہ صرف خواتین ہی نہیں، حضرات نے بھی عجیب حُلیے بنا لئے ہیں۔ آپ میں سے بزرگ حضرات انہیں سمجھاتے کیوں نہیں؟

اطہر شیرکوٹی:

فیشن ایبل لڑکیاں جو بال کٹوانے لگیں
اُن کی ضد میں ڈسکو دیوانوں نے رکھ لیں چوٹیاں
اُن کو اطہر شیر کوٹی کس طرح سمجھائے گا
جن کو لگتی ہوں بڑے بوڑھوں کی گالاں کھوٹیاں

ہم:

فیشن زدہ نوجوان غلَط مَلَط انگریزی بول کر اپنا اور اپنے اِدارے کا مذاق اُڑوا رہے ہیں، چلئے اس حوالے سے تو کچھ کہہ دیجئے اُن سے!

مرزا محمود سرحدی:

ہم غریبوں سے آپ کیوں صاحب
مفت کے جھگڑے مول لیتے ہیں
آپ کی طرح سے تو انگریزی
خانسامے بھی بول لیتے ہیں

ہم:

شاید ہمارے کچھ لوگ غلَط فہمی کا شکار ہیں!

عبدالباری آسی:

غلَط فہمی کا فیشن سے اِزالہ ہو نہیں سکتا
کوئی گورا کسی کالے کا سالا ہو نہیں سکتا
جنابِ شیخ بھی ہنس ہنس کے بولے چپکے چپکے سے
پُڈنگ اچھا ہے، حلوہ اس سے اعلیٰ ہو نہیں سکتا

ہم:

کھوکھلے علم کا رعب جمانے والوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

علم کا رعب ٹھیک ہے لیکن
ڈگریوں کا بھی کچھ اثر ڈالو

کر لیا ہے جو تم نے ایم اے تو
ساتھ ہی میٹرک بھی کر ڈالو

ہم:

ڈاکٹر صاحب! بڑی کھری نصیحت کی ہے آپ نے کھوکھلا پارٹی کو۔ سنا ہے گزشتہ دنوں آپ نے اپنے صاحبزادے کو بھی بڑی کلاسک نصیحت کی تھی۔ بھلا کیا تھی وہ نصیحت!

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

تِری شادی کی باتیں چل رہی ہیں آج کل بیٹا
سو تیرا صاف ستھرا ہر گھڑی رہنا ضروری ہے
مِرا مطلب، مہینوں تک نہانے کی نہ ہو فرصت
تو پھر ہفتے کے ہفتے ہاتھ منہ دھونا ضروری ہے

ہم:

بلبل صاحب! میٹرک کے حوالے سے یاد آ گیا، آپ کے شعر تو کابل سے کشمیر تک مشہور ہیں، میٹرک کا امتحان کیوں پاس نہ کر سکے آپ؟

بلبل کاشمیری:

لڑکا بیٹھا تھا جو مِرے آگے
اپنے پرچے چُھپا کے لکھتا تھا
پاس کرتا مَیں امتحاں کیسے
پیچھے والا بھی میرے جیسا تھا

ہم:

کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے طالب علموں کا کتاب سے رابطہ ختم کر دیا ہے، اب وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ کوئی ماہرِ تعلیم اس پر روشنی ڈالیں گے کیا؟

انور مسعود:

کتاب سے ہے عزیزوں کا رابطہ قائم
وہ اس سے اب بھی بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں
کبھی کلاس میں آتے تھے ساتھ لے کے اسے
اب امتحان کے کمرے میں لے کے جاتے ہیں

ہم:

آپ حضرات نئی نسل سے اتنے مایوس کیوں ہیں؟

اطہر شاہ خان جیدی:

یوں ہی نسلِ نو سے کچھ مایوس ہیں اہلِ قلم
جب کہ میرا مشورہ اِک نوجواں کو بھا گیا
یہ کہا تھا، اب قلم پر بھی توجہ دیجئے
اگلے ہفتے نوجواں قلمیں بڑھا کر آ گیا

ہم:

جی دیوانہ جی! آپ کیا فرمائیں گے، بیچ اس مسئلے کے؟

فواد تابش دیوانہ:

ناز تقوے پہ ہے جن کو وہ بزرگانِ کرام
نوجوانوں پہ ہی تنقید کیا کرتے ہیں
اور کچھ بَن نہیں پڑتا تو یہ محرومِ شباب
چُھپ کے ''اخبارِ خواتین'' پڑھا کرتے ہیں

ہم:

اس معاشی بدحالی اور مہنگائی کے دور میں یہاں کوئی آسودہ حال بھی ہے کیا؟

سید مسعود ہاشمی:

ایک کے قبضے میں سارا مُلک ہے
ایک کے قبضے میں جسم وجان ہیں
بس نہیں کوہاٹ یا ملتان پر
متفق سب اہلِ پاکستان ہیں
دو ہی طبقے ہیں یہاں آسودہ حال
ڈاکٹر ہیں اور سیاستدان ہیں

ہم:

ڈاکٹر صاحبان کی آسودہ حالی کا راز؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

اِک ڈاکٹر مریض کو سمجھا رہا تھا یہ
کرتا ہے میرے کام کو دشوار کس لئے
پیسے نہ تھے علاج کے گر تیری جیب میں
پھر یہ بتا' ہُوا ہے تُو بیمار کس لئے

ہم:

اور سیاستدانوں کی خوشحالی کا بھید؟

مرزا محمود سرحدی:

کہہ رہے تھے ایک جلسے میں کوئی سابق وزیر
کوٹھیاں تک ہم نے بنوائی تھیں اپنے واسطے
باوجود اس کے بھی سنتا ہوں کہ کچھ کج فہم لوگ
کہتے پھرتے ہیں ہمارے کام تعمیری نہ تھے

ہم:

سابق وزیر کیا اپنے ووٹروں کو کج فہم کہہ رہے تھے؟ وہ تو ان کے پکے یار ہوتے ہیں!

نیاز سواتی:

الیکشن میں یہ کینڈیڈیٹ نے ووٹر سے فرمایا
اگر تم ووٹ دو تو یار پھر کہلائیں ہم دونوں
مگر جب ووٹ اُس کا لے لیا تو یوں کہا اُس سے
''چلو اِک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں''

ہم:

اطہر راز صاحب! آپ لندن میں مقیم ہیں' وہاں علاج معالجے کی کیا صورتِ احوال ہے؟

اطہر راز:

لندن میں بھی علاج کا ڈھانچہ بدل گیا
اِک ڈاکٹر کے پاس مِرا دوست کل گیا
دل کے مریض کو ملی اُمّید سے نجات
بِل ڈاکٹر کا دیکھتے ہی دم نکل گیا

ہم:

جی جی خاور صاحب! ضرور بتائیے اپنے پڑوسی حکیم جی کے بارے میں۔

خاور نقوی:

وہ جب بیمار کو چمچہ دوائی کا پلاتے ہیں
بدن میں اُن کے ہوتے ہیں شرر اندر شرر پیدا
سمندر میں انہیں غوطہ لگانے کی نہیں حاجت
وہ پانی بیچ کے کر لیتے ہیں لعل و گُہر پیدا

مریضوں کو مسلسل مار کے یہ مجھ سے فرمایا
''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

ہم:

برسوں کے مسلسل وعدوں کے بعد عوامی مسائل کی کیا صورت ہے آپ کے خیال میں؟

عرفان احمد:

مسائل اب تلک ویسے ہیں لیکن
جو لڑکی تھی وہ نانی ہو رہی ہے

ہم:

فاخرہ بتول صاحبہ! ملاوٹ بھی عوامی مسئلہ ہے۔ اب تو اُردو شاعری میں بھی انگریزی کی ملاوٹ عام ہے۔ ملاوٹ کے کسی نئے پہلو پر روشنی ڈالئے۔

فاخرہ بتول:

شیمپو خریدا مَیں نے تو بولا دکاندار
کنڈیشنر بھی اس میں ہے شامل، کمال ہے
پہلی ہی بار سر پہ لگایا تو یہ کُھلا
سب بال گِر چکے ہیں، فقط سر پہ کھال ہے

ہم:

سمگلنگ بھی یقیناً عوامی مسئلہ ہے۔ سمگلر حضرات کے خلاف حکومتی مہم کے کیا نتائج نکلے؟

شاہد الوری:

حکومت نے بہت چاہا کہ اسمگلرز کو دھر لے
مگر جو اصل اسمگلر تھے، وہ عیار تر نکلے
دعا دیتے ہیں کسٹم افسروں کو جن سے اسمگلر
''اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے''

ہم:

یہ سب رشوت ستانی کی وجہ سے ہے۔ دلاور فگار صاحب کی اس پر گہری نظر ہے۔ ان سے پوچھتے ہیں آخر یہ چور سمگلر کیسے چھوٹ جاتے ہیں؟

دلاور فگار:

حاکمِ رشوت سِتاں! فکرِ گرفتاری نہ کر
کر رہائی کی کوئی آسان صورت چُھوٹ جا
مَیں بتاؤں تجھ کو تدبیرِ رہائی مجھ سے پوچھ
لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چُھوٹ جا

ہم:

رشوت اور جرائم کی بیخ کنی کے لئے پولیس کو فعال کیا گیا ہے۔ یہ جو ویمن پولیس سٹیشن بن گئے ہیں، عنایت صاحب سے پوچھتے ہیں، وہاں جھگڑے کیسے نمٹائے جاتے ہیں؟

عنایت علی خان:

ساس بہو کا جھگڑا جب ویمن تھانے میں آیا ہے
تفتیشی خاتون نے بس دو فقروں میں نمٹایا ہے
اللہ! ایسی نائس میچنگ تُو نے کس سے سیکھی ہے
اللہ! یہ جوڑا تم نے کس درزی سے سلوایا ہے

ہم:

مجھے تو جی یہ عورتوں کے خلاف پروپیگنڈہ لگتا ہے...

پروفیسر شاہین خان:

پرو پیگنڈہ کیسا ؟وہ تو تھانے میں تفتیش کی بات تھی،مَیں بتاتا ہوں ریسرچ لیبارٹری میں تحقیق کا حال:

''خوب صورت تھی مگر میری پہنچ سے دُور تھی
ہائے اُس ساڑھی کو مُڑمُڑ کر دوبارہ دیکھنا!
سوٹ مَیں نے دیکھا ہے کل بشریٰ خالص سلک کا
سلمیٰ تم اُس شاپ پر جا کر غرارہ دیکھنا!''

ہم:

توبہ، اتنا غصہ خواتین پر! ادبی دنیا میں بھی تو خواتین متحرک ہیں، معلوم نہیں کیسے لگتا ہوگا آپ حضرات کو؟

سرفراز شاہد:

دَر آئی ہیں جس دن سے خواتین ادب میں
حالات بہت ہوگئے سنگین ادب میں
گھر اِس نے سنبھالا تو سُخن اُس نے سنبھالا
نُورا جو کچن میں ہے تو نورین ادب میں

ہم:

سرفراز شاہد صاحب! تھوڑی دیر کے لئے کچن سے باہر آجایئے آپ ڈائریکٹر موسمیات رہے ہیں، ذرا بتایئے موسم کی پیشگی خبر کس میکانزم کے تحت دیتے ہیں آپ لوگ؟

فاخرہ بتول:

مَیں بتائے دیتی ہوں آپ کو۔ اتنی دیر میں سرفراز شاہد صاحب کو خواتین کے خلاف کوئی ''شعری چوکہ'' تراشنے دیں...

ہم:

ارشاد!

فاخرہ بتول:

پوچھا یہ نجومی سے کسی نے کہ اے بھائی!
بارش کا ہے امکان تو ہم کو بھی بتادو
پوچھا جو نجومی نے کہ ہیں آپ بھلا کون؟
بولے کہ خبر دیتے ہیں موسم کی ہمی تو

ہم:

دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل...

فرحانہ سحاب:

ہر قدم پر اِک نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ
باپ کی دولت کے بَل بوتے پہ پَل جاتے ہیں لوگ
وہ نہ سُدھریں تو ہے یہ اُن کی حماقت کا قصور
جوتیاں کھا کر تو سنتے ہیں، سنبھل جاتے ہیں لوگ

ہم:

بہت شکریہ فرحانہ صاحبہ! دراصل مَیں ''دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ'' کا پہلا مصرعہ جاننا چاہ رہی تھی۔

عذرا وقار:

سبزیاں پیتے ہیں دیکھو، شوربہ کھاتے ہیں لوگ
دیکھتے ہی دیکھتے کتنے بدل جاتے ہیں لوگ

ہم:

مَرد و زن کے حوالے سے بتایئے مردوں کی عمر زیادہ ہوتی ہے یا عورتوں کی اور اس کا سبب کیا ہے بھلا؟

امیرالاسلام ہاشمی:

کہا اِک فلسفی سے ایک زندہ دل سی عورت نے
ہماری طرح لمبی عمر مَردوں کی نہیں ہوتی
یہ سُن کر فلسفی کچھ مسکرایا اور پھر بولا
سبب یہ ہے کہ عورت کی کوئی بیوی نہیں ہوتی

ہم:

کیا کوئی صاحب یا صاحبہ جواب دینا چاہیں گے؟

ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

کڑی پابندیوں نے ہر سہولت ہی دبا ڈالی
وگرنہ عورتوں میں کون سا جوہر نہیں ہوتا
سدا بے فکر پھرتے ہیں اگر یہ مَرد تو اس کا
سبب یہ ہے کہ مَردوں کا کوئی شوہر نہیں ہوتا

ہم:

جیدی صاحب سنا ہے ماشاء اللہ! آپ نے شادی دفتر کھول لیا ہے۔ رسمِ افتتاح کے فوراً بعد آپ کے دفتر میں ہنگامہ کیوں ہوگیا؟

اطہر شاہ خان جیدی:

''جب دیکھو فارغ پھرتے ہیں، یا پیتے تمباکو ہیں
صاحب زادے کیا کرتے ہیں''؟ لڑکی والوں نے پوچھا
لڑکے کی امّاں یہ بولیں: ''کام کرے اس کی جوتی
دو بھائی بھتّہ لیتے ہیں، ابّا خیر سے ڈاکو ہیں''

ہم:

گُل زیب صاحبہ! اچانک بجلی چلی جانے کی وجہ سے پرسوں آپ کے پروگرام ''کامیاب لوگ'' کا کچھ حصہ نہ دیکھ سکے نہ سُن سکے۔ آپ نے ایسا کیا سوال کیا اور کیا جواب آیا کہ قہقہوں کی بارش برسنے لگی؟

گُل زیب زیبا:

چار زوجاؤں کے شوہر سے کِیا مَیں نے سوال
کیسے ہوتا ہے گزارا، بولے کہ ''سب ٹھیک ہے
دو کے تو گُل زیب! انگلش میڈیم اسکول ہیں
ایک کا بیوٹی کلینک، ایک کا بوتیک ہے''

ہم

بجلی کے بحران نے آپ لوگوں کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا ہے؟

عنایت علی خان: یہ آپ نے کس دُکھتی رگ پر ہاتھ بلکہ پاؤں رکھ دیا...

دل کا کنول نہ ہو سکا روشن کسی طرح
آیا وہ گُل عِذار تو بجلی چلی گئی
''عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن''
باقی تھے پونے چار تو بجلی چلی گئی

اچانک کمپیوٹر کی سکرین تاریک ہوگئی — حسبِ معمول بجلی جا چکی تھی اور ہم چیخ اٹھے: یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

حوالہ

ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے مرتب کردہ تین سو سالہ مزاحیہ شاعری کے انتخاب ''منظوم قہقہے'' سے ترتیب دیا گیا

بجلی سے ملاقات

امجد انصاری

❖: آپ کو بجلی کیوں کہا جاتا ہے؟

ﷺ: کیوں کہ مَیں آتی کم اور جاتی زیادہ ہوں، اس لئے لوگ مجھے بی چلی کہہ کر پکارتے تھے، جو بگڑ کر بجلی بن گیا ہے۔

❖: آپ کو کون سا کھیل سب سے زیادہ پسند ہے؟

ﷺ: آنکھ مچولی... جو بچپن سے اب تک لوگوں کے ساتھ کھیلتی چلی آ رہی ہوں۔

❖: بار بار آنے جانے سے آپ کو کبھی تھکاوٹ یا تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی؟

ﷺ: مَیں ایسے ہی نہیں چلی جاتی، کئی سو میگاواٹ کے کیپسول اپنے ساتھ لے کر جاتی ہوں۔ مجھے کمزوری اور تھکاوٹ کیوں محسوس ہوگی؟

❖: آپ کا پسندیدہ رنگ؟

ﷺ: چونکہ مَیں زیادہ تر اندھیروں میں رہنا پسند کرتی ہوں اس لئے سیاہ رنگ مجھے بے حد پسند ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں سے چُھپنے میں بھی آسانی رہتی ہے۔

❖: کیا انسانوں کی طرح آپ کو بھی اندھیرے میں مچھر کاٹتے ہیں؟

ﷺ: مچھر مجھے کیسے کاٹیں گے؟؟ میں تو خود ساری رات باہر نکل کر اندھیروں میں مچھروں کو کاٹتی پھرتی ہوں، جس کی وجہ سے وہ مجھ سے بچنے کے لئے بھنبھناتے ہوئے گھروں کے اندر چلے جاتے اور لوگوں کو کاٹنا شروع کر دیتے ہیں۔

❖: آپ کا پسندیدہ نعرہ؟

ﷺ: جب لوگ میرے واپس آ جانے کے بعد ''آ گئی'' کہتے ہیں، تو یہ نعرہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔

❖: کیا کبھی آپ کو بھی کرنٹ لگا؟

ﷺ: بھلا مجھے کرنٹ کیوں لگے گا، میرا کام تو خود دوسروں کو کرنٹ لگانا اور مارنا ہے۔ ہاں البتہ ایک بار ہلکا سا جھٹکا ضرور محسوس ہوا تھا جب سُنا کہ مجھے پرائیویٹائز کیا جا رہا ہے۔

❖: یعنی آپ پرائیویٹائزیشن سے ڈرتی ہیں!

ﷺ: ہاں ہاں! بہت ڈرتی ہوں۔ کیونکہ اُس وقت میرے بار بار اور اپنی مرضی سے جانے آنے کے مزے ختم ہو جائیں گے۔

❖: ہماری طرح آپ کو بھی پسینہ آتا ہے کیا؟

ﷺ: جی ہاں! مَیں بھی مارے شرم کے اس وقت پسینہ پسینہ ہو جاتی ہوں جب لوگ میرے آنے کا انتظار کرتے رہتے ہیں لیکن مَیں پھر بھی واپس نہیں آتی۔

❖: آپ اکثر وعدہ کرتی ہیں کہ آئندہ کبھی نہیں جائیں گی' پھر اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ آپ اپنی باتوں اور وعدوں میں اس قدر ڈنڈی کیوں مارتی ہیں؟

ﷺ: عوام کے ساتھ میرا رشتہ بہت پرانا ہے۔ مَیں بار بار آتی اور بار بار جاتی رہتی ہوں تاکہ میرا رابطہ بحال رہے' لوگ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں اور بھول نہ جائیں۔

❖: آپ عوام کو کوئی تحفہ' میرا مطلب ہے پیغام دینا پسند کریں گی؟

ﷺ: مَیں عوام کو لوڈ شیڈنگ کی شکل میں تحفہ دیتی رہتی ہوں اور جہاں تک آپ نے پیغام کے بارے میں پوچھا تو میرا پیغام ہے کہ میرے غیر ضروری استعمال سے پرہیز کریں' مجھے سنبھال کر اور بچا بچا کر استعمال کریں تاکہ بجلی کا بل دیکھ کر آپ کو نہ کرنٹ لگے' نہ غش پڑے۔

❖: اور ہاں! لوڈ شیڈنگ کا تحفہ کب بند کریں گی؟

ﷺ: یہ راز کی بات ہے۔

❖: کیا دسمبر میں؟

ﷺ: مَیں نے بھی سُنا تو تھا۔

❖: سنا تو تھا؟ گویا دسمبر کی بات پرانی ہوگئی!

ﷺ: جولائی میں.....

❖: اُف اللہ! ۔ جولائی کہہ رہی ہیں آپ' یعنی جولائی کا مہینہ ختم ہوگا' تو لوڈ شیڈنگ بھی ختم...

ﷺ: میری پوری بات تو سن لیں۔ میں کہہ رہی ہوں کہ جولائی مَیں خبر دو.....

❖: اچھا اچھا! اب سمجھ آئی' آپ کہہ رہی ہیں کہ دوسرے مہینے میں لوڈ شیڈنگ سے نجات مل جائے گی۔

ﷺ: پیوستہ رہِ شجر سے امیدِ بہار رکھ!

❖: کہیں ایسا تو نہیں کہ 28 فروری 2011ء کو لوڈ شیڈنگ ختم اور یکم مارچ 2011ء کو دوبارہ شروع کر دیں گی؟

ﷺ: مَیں نے سَن نہیں بتایا۔

❖: اچھا تو آپ کہنا چاہتی ہیں کہ فروری 2011ء تو چھوڑیں اگلے کئی سالوں تک جا سکتا ہے یہ معاملہ!

ﷺ: نو کمنٹس!

❖: چلیں نہ دیں کمنٹس' بس واپس ہی آجائیں۔ گھپ اندھیرا پھیلا کر کیوں پریشان کر دیا ہے آپ نے؟

ﷺ: جہاں اندھیر مچا ہو' وہاں اندھیرے سے کیوں پریشان ہو رہے ہیں آپ؟

❖: واہ! آپ تو شاعرانہ بلکہ عارفانہ باتیں کرتی ہیں' ذرا بتائیے اندھیر سے نکلنے کا کوئی طریقہ!

ﷺ: ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

بہن بھائیوں کی باتیں

مدیحہ بشیر۔ عطیہ شاہین

بھائی کا لفظ ہمارے لیے اجنبی نہیں۔ یہ وہی لفظ ہے جو ضرورت پڑنے پر بھیّا جانی' پیارے بھائی اور بھائی جان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔آیئے زمینی حقائق کی رُو سے ذرا بھائیوں کی اقسام اور صفاتِ مبارکہ پر نظر ڈالیں:

خونی بھائی

یہ وہ بھائی ہیں جن سے بہنوں کا خونی رشتہ ہوتا ہے۔خونخوار نظروں سے گھورنے اور خون خشک کرنے کا فرض انجام دیتے ہیں۔ان کی آنکھوں میں ہر وقت خون اُترا رہتا ہے۔ان میں غیرت کا مادہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔اگر یہ بہن کو اپنے گھر کے دروازے یا کھڑکی سے جھانکتا ہُوا دیکھ لیں تو خون سُکھا کر رکھ دیتے ہیں۔البتہ ان سے یہ پوچھنے کی غلطی نہ کریں کہ خود سارا وقت گھر کی چھت پر کیا کرتے رہتے ہیں؟

فونی بھائی

یہ وہ بھائی ہوتے ہیں جو اپنی بہنوں کو بوریت سے بچانے کے لئے ان سے ہر وقت فون پر باتیں کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ اپنی بہنوں کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کی خاطر رات کے دو بجے بھی فون کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔شرم کے ساتھ ساتھ حیا کا مادہ بھی ان میں کثرت سے پایا جاتا ہے' چنانچہ ان کو بھائی کہہ کر پکارا جائے تو شرما کر فوراً فون رکھ دیتے ہیں۔فون پر بہنوں کے ابا جان یا خونی بھائی کی آواز سُن کر بولنے اور سننے کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جنونی بھائی

یہ بھائی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے جنونی بن جاتے ہیں۔کالج کے گیٹ پر اور چاند رات کو مہندی اور چوڑیوں کے سٹال پر اپنی گمشدہ بہنوں کو تلاش کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ راہ چلتے اگر ان سے کوئی بہن لفٹ مانگے تو سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے شہر کے دوسرے کونے تک چھوڑ آنے پر تیار رہتے ہیں' مگر بہنیں یہ غلطی بہت کم کرتی ہیں۔انہیں بہنوں کا اس قدر خیال ہوتا ہے کہ راہ چلتے ہوئے

انہیں اپنی سریلی آواز سنانا نہیں بھولتے۔تو آؤ بہنو! اپنے بھائیوں کو نصیحت کریں کہ یہ سب کچھ مسلمان بھائی کو زیب نہیں دیتا۔

بہن بھائی

یہ تو ذکر تھا بھائیوں کا۔اب بہن بھائیوں کی کچھ ملی جلی باتیں' عطیہ شاہین کی زبانی:

علامہ اقبالؒ نئی نسل کے بارے میں کہتے ہیں:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

آیئے درج ذیل شعبوں کے حوالے سے جائزہ لیتے ہیں کہ نوجوان (طالب علم اور طالبات) کن ستاروں پر کمند ڈالنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

ڈریسنگ

کپڑے ایسے ہونے چاہئیں کہ پہن کر سلوائے گئے معلوم ہوں اور شخصیت کو باوقار بنائیں' مگر باوا آدم ہی نرالا ہے آج کل۔خواتین کے آدھے بازو گھٹتے گھٹتے اب بالکل ہی ختم ہو چکے ہیں اور دوپٹہ بھی برائے نام رہ چکا ہے۔یہ بیماری عموماً کالج میں داخل ہوتے ہی سٹوڈنٹ کو گرفت میں لے لیتی ہے۔گرمیوں میں اس کا وائرس زیادہ پھیلتا ہے جبکہ سردیوں میں مجبوری کے باعث یہ بیماری قدرے کم دیکھنے کو ملتی ہے۔اسی طرح بھائی لوگوں میں ٹائٹ شرٹس اور جینز کا شوق اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کیکڑا نما جسامت کے باوجود دماغ میں آباد اور ٹی شرٹس پر بنی باکسرز کی تصاویر ان کی شخصیت کے نکھار میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔

میک اپ

ڈریسنگ کے ساتھ اس بیماری کا آنا بھی لازم ہے جیسے فلُو کے ساتھ بخار کا ہونا ضروری ہے۔چہرے پر طرح طرح کی کریموں اور لوشن کی اتنی تہیں جمائی جاتی ہیں کہ اصل چہرے کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک رات فنکشن میں بہن کی سہیلی کو دیکھا' کچھ دنوں بعد ان سے ملاقات پر اپنے آپ کو یہ یقین دلانے میں بہت دشواری پیش آئی کہ یہی شامہ ہیں۔یہ کرتب دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے تجویز کیا ہے کہ اگر مریض کو بے ہوش کرنے کے لیے مشہور و معروف نیوز کاسٹرز بغیر میک اپ کے دکھائی جائیں تو کارگر ثابت ہوگا' آزمائش شرط ہے۔یہ بیماری سردیوں اور گرمیوں میں یکساں شدت سے پائی جاتی ہے۔اس کے باعث اب بہنوں کا زیادہ خرچ کا سمیٹکس پر اُٹھنے لگا ہے۔

بہن بھائی پارلر

بہنوں کی دیکھا دیکھی بھائی لوگوں میں بھی بیوٹی پارلر جانے کا چلن عام ہو چلا ہے یعنی بھائیوں نے حسین بننے کا راز دریافت کر لیا ہے۔آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور بالوں میں gel لگانا ان کے خیال میں شخصیت کے نکھار میں اضافہ کرتے ہیں۔

جیب خرچ میں لمبی کٹوتی اور کاسمیٹکس کی قیمتوں میں بے رحمانہ اضافہ اس مہلک بیماری کا بہترین علاج ہے۔

سمارٹنیس

اس مرض میں مبتلا بہنوں اور بھائیوں پر ترس کھانا بے جا نہ ہوگا۔اس بیماری میں کھانا پینا اس حد تک کم کر دیا جاتا ہے کہ وہ سبزیاں جن کو کل تک کوئی منہ نہیں لگاتا تھا' آج رغبت سے کھائی جاتی ہیں اور زیادہ تر سبزی خور ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔کچھ بھائی صبح سویرے بلکہ فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتے ہیں۔آپ کو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ یہ عادتِ ایمانی نماز اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کے لیے ہے' بلکہ یہ سحر خیزی تو کانوں پر واک مین لگائے چھت کے پچاس چکر لگانے میں صرف ہوتی ہے۔دوسری جانب اُن سلمنگ سینٹرز کی جانب جو''مسز نصرت کا حجم پہلے اور بعد میں'' تصویر کی مدد سے دکھاتے ہیں' بہنوں کا رجحان بڑھ رہا ہے کیونکہ''تیس پونڈ وزن تیس دنوں میں کم ہو جائے گا'' اور''ساٹھ کے بجائے شیما تیس پونڈ کی رہ جائے گی'' واقعتاً بڑے جاذو واثر دعوے ہیں۔کئی پہلوؤں سے اس بیماری کو نہایت مفید قرار دیا گیا ہے' البتہ احتیاط یہ برتی جائے کہ اس قدر ہی سمارٹ ہُوا جائے کہ دُور بین کے بغیر یعنی کھلی آنکھوں سے دیکھنے میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے اور ہاں' تیز ہوا کا بھی خیال رہے' کیونکہ:

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لئے!

جدید علمی و عملی ڈکشنری۔جلد اول

سکول: مشکلاتِ زندگی کا آغاز

کالج: بے فکروں کے لئے تفریح گاہ

یونیورسٹی: زندہ آرٹ کا عجائب گھر

ڈگری: تعلیمی اخراجات کی رسید

جرمانے: جیب خرچ کا بہانہ

گھنٹی: دنیا کی واحد طاقت جو اساتذہ کو کمرے سے نکال دیتی ہے

بل: کیفے کی سب سے بدمزہ چیز

چھاپہ: پکڑا جائے تو جرم' نہ پکڑا جائے تو آؤٹ سٹینڈنگ

ڈرامہ: بہانے سکھانے کی ڈائریکٹری

جوڈو کراٹے: ڈانس کرنے کا ٹیکنیکل طریقہ

جوتے: جنہیں کنوارے کھائیں اور شادی شدہ پہنیں

ڈسٹر: سینڈل اور جوتے صاف کرنے کا آلہ

سیمینار: جس کے دوران نیند پوری کی جاتی ہے

افسری: ایک بے وفا جس کو نہ قیام' نہ دوام

آنکھ: آنسو بہانے کی فیکٹری

دفتر: آرام کرنے کی جگہ

وین: غبارہ جس میں بے حساب طلبہ بند کئے جاتے ہیں

کنسرٹ: کان کو دوسری جانب سے پکڑنا

لائبریری: نوٹس ملانے/تبدیل کرنے کی ورکشاپ

سمیسٹر سسٹم: بگڑے بچوں کو سیدھا کرنے کا نسخہ

کربنگ: آگے نکل جانے والوں پر تنقید کی نان اسٹاپ مشین

ری یونین: فیشن شو

— کنیز فاطمہ

انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اہلِ دل

گُل بہادر یوسفزئی

سو سال بعد کا زمانہ کیسا ہوگا' یہ ابھی صرف سائنس فکشن کے طور پر بھی سوچا نہیں جا سکتا کیونکہ ترقی کی موجودہ رفتار تصور سے بھی تیز تر ہے۔ حواسِ خمسہ معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور شاعری انہی احساسات کے اظہار کا نام ہے۔ غالب نے کہا تھا کہ:

قاصد کے آتے آتے خط اِک اور لکھ رکھوں
مَیں جانتا ہُوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مرزا غالب نے یہ شعر اس وقت کہا تھا جب مواصلات کا ذریعہ قاصد ہوا کرتے تھے۔ اس قاصد کا جس شدت سے انتظار رہتا تھا' وہ اردو شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ اسی طرح جب کبوتروں سے پیغام رسانی کا کام لیا جانے لگا تو شاعروں نے اسے موضوعِ سخن بنایا' کیونکہ اس میں تھوڑی سی رازداری بھی میّسر آ گئی۔ بقولِ شاعر:

ہوئی تکرار جانے میں کیا کیا جب لکھا نامہ
صبا سے نامہ بر اُلجھا' لڑا ہُدہُد کبوتر سے

حالات بدلتے رہے' وقت کا پہیہ تیزی سے گھومتا رہا اور معاشرے میں بھی تغیّر پر تغیّر آتے رہے' کیونکہ بقولِ اقبالؒ:

ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

اور یوں آخرکار 1876ء میں ٹیلی فون ایجاد ہوا۔ ساری دنیا میں' بشمول برِّصغیر' اس کا استعمال عام ہُوا۔ شاعروں نے اسے موضوعِ سخن بنایا۔ منیبہ زہرا نقوی نے موبائل فون کا تذکرہ کچھ یوں کیا:

لیا جب فون موبائل تو دل کا گھر بدل ڈالا
پھر اس کے بعد نامہ بَر کا ہم نے دَر بدل ڈالا
نہ اب قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھتے ہیں
موبائل فون سنتے ہیں، اسی پر بات کرتے ہیں
پیامِ دوست لاتے لاتے اب قاصد نہیں مرتے
ہاں! سروس جیم ہونے سے کئی میسج نہیں ملتے
مگر صد شکر دل کی بات اب ہم روز کرتے ہیں
موبائل فون کی گھنٹی سے دل کے تار بجتے ہیں

پھر انٹرنیٹ — ایسا نیٹ جس سے نکلنا مشکل' اب نہ ہجر کا

صدمہ، نہ وصل کی خواہش، گویا:

عشق بھی محدود ہے اب کھیل تک
میرا اُس کا میل ہے ای میل تک

اعجاز کنور راجہ نے کہا:

نہ کوئی فون کی گھنٹی، نہ خط، نہ خواب کوئی
ملا وہ شخص تو ٹوٹے ہیں رابطے کتنے

بات شاعروں تک محدود نہیں رہی، نثر نگاروں نے بھی اسے موضوعِ سخن بنایا، حتیٰ کہ سیاست دانوں نے بھی۔ ''اور لائن کٹ گئی'' جیسے موضوعات کا استعمال ہُوا۔ پھر زمانے نے کروٹ لی اور موبائل فون کا دَور آ گیا۔ ہر ایک کے پاس اپنا ایک ذاتی آلہ — بس ڈائل کریں اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہو جائے یا لفظوں کے لیے میسجنگ سمائل موبائل۔ شاعری نے اسے بھی اپنے دامن میں سمویا اور اب پوچھا جاتا ہے؟

What is your smile number?

What is your mobile number?

اور اس کے بعد زمانہ ویڈیو فون کا۔ دوست دُور ہوتے ہوئے بھی آپ کے بالکل سامنے — روبرو گفتگو، اظہار کا جدید ترین ذریعہ۔

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا!

گشتی فون کالز

اور اب تذکرہ موبائل یا گشتی فون کالز اور ادب میں ان کے حصے کا۔ رانا عبداللہ نے موبائل کالز کی ایک قسم کو سوشل کالز کا نام دیا ہے اور پھر طبعی خصوصیات کے حوالے سے ان کی مزید خانہ بندی کی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

سوشل کالز تین اقسام کی ہوتی ہیں: ضروری، غیر ضروری اور مجبوری۔ ضروری کالز ہر وہ رابطہ ہے جس سے چشم پوشی باعثِ نقصان یا وجہِ شکر رنجی ہوسکتی ہے۔ اس میں پیشہ ورانہ، سماجی تقاضے اور اخلاقی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ یہ وہ تقاضے ہیں جو SMS سے پورے نہیں ہوتے۔ یہ کالز انتہائی شائستہ اور حتی الوسع مختصر ہوتی ہیں۔

غیر ضروری کالز میں ''اور کیا حال ہے'' یا ''اور سناؤ'' بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ بات کرنے اور سننے والے کے چہرے کے ناگوار تاثرات یا مزاحیہ حرکات سے اس مکالمے کے غیر ضروری ہونے کا برملا اظہار ہوتا ہے۔

مجبوری کالز وہ ہیں جو جبراً کی جاتی ہیں۔ جیسے نئے شادی زدہ خاوند کا دفتر پہنچ کر بیوی کو بتانا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے یا دن میں کئی مرتبہ محبت اور وفاداری کا یقین دلانا، وغیرہ وغیرہ۔

ایسی کالوں میں وہ کالز بھی شامل ہیں جو حاملِ موبائل اپنا سٹیٹس ظاہر کرنے اور اپنے قیمتی موبائل سیٹ کی نمائش کے لئے دوسروں کی موجودگی میں کرتے ہیں۔

طبعی خصوصیات یعنی طوالت کی بناء پر موبائل کالز کو تین نسلوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(1) عشقیہ کالز (2) نان عشقیہ کالز (3) مسڈ کالز

پہلی نسل کی کالیں یعنی عشقیہ کالیں طوالت کے لحاظ سے لیلیٰ کی ''بے نور'' زلفِ دراز کی طرح اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ پیسے ختم ہونے کی صورت میں ہی ختم ہوتی ہیں۔اس قسم کی کالز میں جس بات کا پہلے سے بھی پتہ ہو وہ بھی بار بار پوچھی جاتی ہے۔ کوئی لفظ زیادہ ہی اچھا لگے تو یہ کہہ کر دوبارہ سنا جاتا ہے کہ ''کیا کیا کیا' آواز صاف نہیں آ رہی' شاید نیٹ ورک میں کوئی مسئلہ ہے' ذرا پھر سے کہنا'' ایسی کالیں کرنے والے چونکہ دنیا سے بیزار اور اپنی ہی دنیا میں سرشار ہوتے ہیں' لہٰذا ''بے ضرر'' بھی ہوتے ہیں۔ایسی کالوں کے دوران ٹھنڈی آہیں بھر کر فاصلوں کی دُوری کا رونا بھی کثرت سے رویا جاتا ہے۔ایسی کالیں کرنے والے کال کرتے وقت چھت پر اور کال کر لینے کے بعد کمرے میں غزلیں سنتے یا گاتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کا زیادہ تر وقت یہ جاننے میں گزرتا ہے کہ کونسی کمپنی کا پیکج نسبتاً سستا جا رہا ہے۔اس طرح کی کوششوں میں یہ اکثر گاڑیوں' موٹر سائیکلوں اور رکشوں وغیرہ سے ٹکراتے پھرتے ہیں کیونکہ ان کی نظریں سڑک پر لگی موبائل کمپنیوں کی بڑی بڑی ہورڈنگز پر مرکوز ہوتی ہیں۔

دوسری نسل نان عشقیہ کالز یعنی معمول کی کالیں ہوتی ہیں' جو اُنتیس یا اُنسٹھ پر بند کر دی جاتی ہیں۔چاہے بات مکمل ہوئی ہو یا نہیں۔ان میں عمومی طور پر خیر خیریت دریافت کی جاتی ہے۔کاروباری باتیں' رانگ نمبرز' ٹرینوں کے اوقات' فائر بریگیڈ یا پھر ہیلپ لائن پر باتیں وغیرہ۔چونکہ ان کے اندر ''خاص'' بات نہیں ہوتی لہٰذا انہیں چھوڑیں اور آگے چلیں۔

تیسری نسل میں شامل ہونے والی وہ کال ہے جسے کال بننے سے پہلے ہی کاٹنے کا بٹن دبا کر مسڈ کال بنا دیا جاتا ہے اور یہ اپنی تکمیل کی حسرت پر آنسو بہاتی نظر آتی ہے۔موبائل فون پر سی ایل آئی کی سہولت ہوتی ہے' لہٰذا مسڈ کال آتے ہی نظریں سکرین پر اور انگلیاں بٹنوں سے کھیلنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔مسڈ کالز کا مقصد دوسروں کو یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ بھئی ہم بھی تمہیں یاد کرنے والوں میں سے ہیں۔مسڈ کال کے کوڈ بھی بنا لئے جاتے ہیں۔مثلاً ہمارے ایک دوست شام کو مسڈ کال کریں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ کینٹین پر چائے پینے کا موڈ لے کر آن پہنچو۔مسڈ کالز کے لئے صرف معمولی سے بیلنس اور مسڈ کال کو کال میں بدلنے سے بچاؤ کے لئے ذرا سی پھرتی کی ضرورت ہوتی ہے' لہٰذا مسڈ کالز کثرت سے کی جاتی ہیں۔مسڈ کالز کے لئے ''مطلوبہ معیار'' انتہائی کم ہے' اس لئے ایسے لوگ دوسروں کو تنگ کرنے کے لئے بھی مسڈ کالز کرتے ہیں۔ایسی کالز کا علاج جوابی کال کر کے اور دو چار سنا کر کیا جا سکتا ہے' البتہ پھر بھی کوئی باز نہ آئے تو صبر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔آخر میں عرض ہے کہ اگر کسی بات کو پڑھ کر عشقیہ کالز کرنے والوں کی طبع نازک پر بوجھ پڑا ہو' تو وہ براہِ کرم ٹھنڈا پانی پی لیں اور ٹھنڈے ہو جائیں' لیکن خدانخواستہ وہ والے ''ٹھنڈے'' نہیں' جن میں بندہ ہمیشہ کے لئے دوسری دنیا کی طرف کُوچ کر جاتا ہے۔

گوشۂ نسٹیات

نسٹیئن پول

● آپ کو یونیورسٹی میں کیا پسند ہے؟

☆ سگریٹ نوشی پر پابندی

(تابش فواد - SEECS)

☆ فیکلٹی

(سدرہ سلطان - NBS)

☆ ماحول دوست کیمپس

(سیمل مشتاق - IESE)

☆ استاد

(عمر - NBS)

☆ کلاس بعد کلاس، پھر کلاس

(جہانگیر ملک - SCEE)

☆ صفائی ستھرائی

(داؤد ظفر - SCME)

☆ جدید ترین کلاس روم

(اقراء طاہر - SADA)

☆ دوست ... کیونکہ جیل میں رہنا مشکل ہے

(منیب عمران - SCME)

☆ کھانا لینے کے لئے قطار میں لگنا

(بلال احسن - SCME)

☆ ڈسپلن

(ذکی کاظمی - SCEE)

☆ ہوسٹل

(مہتاب علی - SCME)

☆ خاموشی

(سید عالم - NCVI)

☆ SADA

(زارا شفیق - SADA)

☆ گرمیوں میں چلنے والے گیزر

(عاصم رضا - SEECS)

☆ کیا کیا بتائیں!

(عمر عبدالرحمٰن - SMME)

● کوئی مسئلہ؟

☆ برگر (روٹی)، جینز (کپڑا) اور ہوسٹل (مکان)

(عماد اللہ رمیض - SEECS)

☆موبائل سگنلز

(خالد - SEECS)

☆'ہوسٹل میں پڑنا'

(زینب چیمہ - SCME)

☆لائق طلبہ

(اُسامہ ملک - SMME)

☆یونیورسٹی شاپس میں اشیاء کی قیمتیں

(طلحہ ہمایوں - NBS)

☆اچھا سستا نہیں اور سستا اچھا نہیں

(سید فخر عالم - SCME)

☆Thermodynamics کا لیکچر

(محمد احمد - SCME)

☆ہوسٹل کا ٹی وی جو کبھی کبھی چلتا ہے

(مہتاب علی - SCME)

☆یونیفارم کا نہ ہونا

(طُوبیٰ شعیب - SCEE)

☆سکول میں گرلز کامن روم نہ ہونا

(جویریہ نصیر - SEECS)

☆ کیفے پر مہنگائی

(صبا اقبال - IESE)

☆عجیب وغریب لباس کی بڑھتی ہوئی بیماری

(علی رضا - SEECS)

☆لائبریری میں سائرہ بی بی

(تیمور احمد - SCME)

☆کھیل کے میدان

(عمر - NBS)

☆ لمبے فاصلے

(عمیرہ رفیق - SCEE)

☆ پانچ والا سموسہ دس میں

(یعقوب - SEECS)

☆پڑھائی... خصوصاً C++

(عمار حسین - SCME)

☆ کیفے کے کھانے میں خوشبودار گھی

(احمد عثمان - NCVI)

☆ ہوسٹل میں ہیٹر کا مرضی سے جلنا

(انعم فرحان - NCVI)

●اگر آپ ریکٹر ہوتے تو؟

☆تو آپ کی خبر لیتا

(فاروق چوہدری - SEECS)

☆ بے ہنگم لباس پر سخت پابندی لگاتا

(احسن علی - NBS)

☆اور بھی سختی ہوتی

(شعیب فضل - SEECS)

☆نسٹ میں خوب شجر کاری کرواتی
(انعم فرحان - NCVI)

☆گرلز ہوسٹل میں میڈ سرونٹس تعینات کرتی
(صالحہ اکرم - IESE)

☆اپنے صاحب کا طلبہ کے ساتھ رویہ تبدیل کرواتا
(جواد - SEECS)

☆Co-education ختم کرادیتی
(اقصیٰ خورشید - NCVI)

☆مختصر پوشوں میں مفت کپڑے تقسیم کرتا
(حسیب لطیف - SEECS)

☆ہمیشہ ٹینشن ہی رہتی
(زاہد - NCVI)

☆بہت بڑی مسجد بنواتا
(محمد شاہد بشیر - SCME)

☆BBA کے بعد MBA ایک سال میں کرواتی
(سدرہ سلطان - NBS)

☆کیمپس میں فری شٹل بس چلواتی
(عائشہ خالد - SCEE)

☆جلد از جلد سپورٹس کمپلیکس بنواتا
(عبدالمنان اختر - SEECS)

☆Average پر A کی پالیسی منظور کرتا
(ذکی کاظمی - SCEE)

☆یونیفارم لازمی قرار دیتی
(سیمل مشتاق - IESE)

☆تمام گرلز ہوسٹل میں باجماعت نماز کا اہتمام
(کنزیٰ وقار - NCVI)

☆بے لگام طلبہ کو لگام چڑھاتا
(محمد طٰہٰ - SCME)

☆مزید سخت نظم وضبط رائج کرتا
(مِنام ولیم - SCME)

☆سگریٹ نوشی پر پابندی پر بلا امتیاز عمل کرواتا
(عبدالماجد - NCVI)

☆یونیفارم کی پابندی کرواتا
(غفران الرحمٰن - SCME)

☆Late Commers کا سختی سے محاسبہ کرتا
(وجاہت اللہ - SEECS)

●یونیورسٹی/کالج میں آنے کی وجہ؟

☆رب نے سبب بنادیا
(خادم یعقوب - NBS)

☆عالمی شہرت
(ثاقب احمد - SCEE)

☆نسٹ میرا خواب تھا
(عدنان - NBS)

☆میرٹ کی پابندی

(موبل مشتاق - NBS)

☆کوالٹی ایجوکیشن

(محمد ارسلان - SCME)

☆اعمال کا انعام

(عماد اللہ رمیض - SEECS)

☆اچھا معیارِ تعلیم

(علی رضا - SCEE)

☆والدین کی دعائیں

(سعد - CAMP)

☆دنیا میں نسٹ کی تیزی سے اُبھرتی رینکنگ

(شان نثار - SCME)

☆ٹاپ کلاس انجینئر بننے کی خواہش

(مِنام ولیم - SCME)

☆یونیورسٹی کا نام روشن کرنا

(قندیل رحمٰن - SEECS)

نسٹ کے لڑکے؟

☆نسٹ کی لڑکیوں سے ہزار گنا اچھے

(احسن - SEECS)

☆کوئی جواب نہیں

(یعقوب - NBS)

☆لڑکے! لڑکوں کے سوا ہے ہی کیا

(عظمت - NCVI)

☆Funny

(ربیعہ ریاض - SADA)

☆اپنی مثال آپ

(سمیع افتخار - SMME)

☆بہت دھانسُو

(سوار خان - SEECS)

☆قسم قسم کے ہیں

(عمر شریف - SMME)

☆نام ہی کافی ہے

(منیب عمران - SCME)

☆واہ! واہ! بہت اعلیٰ

(محمد علی - SCEE)

☆میری کاپی کرتے ہیں

(ارمغان - SEECS)

☆عجیب و غریب

(عمران خان - NCVI)

☆ملنسار اور ساتھ دینے والے

(زید طیب - CAMP)

☆لڑکے! Definitely

(زین خان - NBS)

☆ہمارے بھائی

(رملہ قریشی - SCEE)

● کچھ کہیں گے اربابِ اختیار سے؟

☆خدارا یونیفارم رائج کرائیے

(عنیق احمد - SCME)

☆موبائل سگنلز کا مسئلہ حل کیجئے

(نوید حسین - IESE)

☆ کیفے میں کھانا لینے کیلئے طالبات کا الگ کاؤنٹر بنوائیے

(زینب طلعت - NBS)

☆مشاعروں کا اہتمام کیجیے

(اسجد نعیم - SCME)

☆نسٹ کی پہاڑیوں پر شجر کاری کیجیے

(مہوش بخاری - IESE)

☆ کیفے میں طالبات کے کھانے کی الگ جگہ بنائیے

(فاطمہ عقیل - SCEE)

☆کبھی کیفے کے باتھ روم میں جائیے

(علی ہاشمی - SCME)

☆جشنِ عید میلاد النبی ﷺ کیا صرف ایک ہی بار؟

(اسد نذیر - SCME)

☆نسٹ کی ڈیموگرافی نہ بدلیں

(شاہ زیب فرخ - NBS)

☆ سائنس میوزیم بنوائیے

(محمد طٰہٰ - SCME)

☆نسٹ میں آرٹ گیلری بنائی جائے

(زارہ فاروق - SADA)

☆مزاحیہ مشاعرہ ہونا چاہیے

(کمال مصطفیٰ - SCME)

☆ کلائمبنگ وال بنوائیے

(ولید وارث - CAMP)

☆نسٹ کلین اپ مشن سٹارٹ کریں

(انعم راٹھور - IESE)

☆ مقابلۂ حُسنِ قرأت ونعت خوانی ہونا چاہیے

(ماریہ بتول - SCME)

☆نسٹ کی ہر خالی جگہ پر پھل دار پودے لگائیے

(اقراء طاہر - SADA)

☆ بہت بڑا آڈیٹوریم اور کانفرنس رومز بنوائیے

(طیبہ افتخار - NBS)

☆Student Centre میں دفترِ تجاویز قائم کیجیے

(عمران خان - SEECS)

☆ سینٹرل لائبریری نسٹ کے شایانِ شان ہونی چاہیے

(جلال - NBS)

☆پریکٹیکل 75 فیصد اور تھیوری 25 فیصد ہونی چاہیے

(سدرہ مرزا - NBS)

☆ششماہی سینٹرل جاب فیئر کا اہتمام کیجیے

(فرحان شہزاد - SEECS)

☆انٹرنیٹ رات 12 سے صبح 5 تک چپ چپ کیوں؟

(شعیب فضل - SEECS)

☆Relative Grading ختم کرائیے

(سارہ ملک - NBS)

☆معیار برقرار رکھنے کے لیے طلبہ کی تعداد کنٹرول کیجیے

(عاصم رضا - SEECS)

☆کبھی سکولوں کے باتھ رومز میں جائیے

(سارہ ملک - NBS)

☆ڈھابوں پر سگریٹ فروخت ہو رہے ہیں جناب!

(حامد افتخار - SCME)

☆کوریئر سروس کا دفتر تو کھلوا دیجیے

(سید فخر عالم - SCME)

☆پروگرامز کے ساتھ ساتھ کلاس رومز بھی بڑھنے چاہیں

(ظفر علی شاہ - SEECS)

☆دیر تک کلاسز طلبہ اور والدین کے لیے پریشانی کا باعث ہیں

(مہتاب علی - SCME)

☆امی ابو سے مل بیٹھنے کیلئے ہوسٹلز میں وزیٹنگ ایریا ہونا چاہیے

(ماریہ بتول - SCME)

☆شام کو کیمپس میں آنے جانے کے لیے ٹرانسپورٹ ہونی چاہیے

(شاہ شمس - SADA)

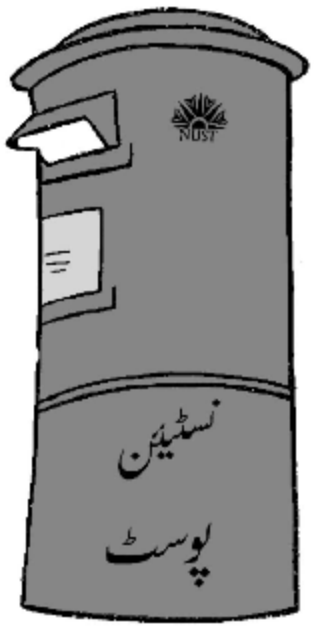

نسٹیئن کے حوالے سے اپنے تاثرات جی بھر کر اور
نسٹ کے کسی بھی شعبے کے متعلق تجاویز آنکھیں کھول کر
ہمیں دیں یا اس پتے پر بھجوائیں،
یہ سب کچھ آئندہ شمارے میں شاملِ اشاعت ہوگا۔

ای میل: nustian@nust.edu.pk

studentaffairs@nust.edu.pk

☆حدیں قائم کی جائیں اور ان پر سختی سے عمل کرایا جائے

(ربیعہ قاضی - IESE)

☆سب کچھ بتا دیں، کچھ کہیں گے تو نہیں؟

(حذیفہ نجیب - SCME)

نسٹیئن قاعدہ

اِس کو پڑھنے سے نئے آنے والوں کو خصوصی فائدہ ہوگا

عون حسن سید

ا اُمید، جس پر دنیا قائم ہے

ب بجلی، جو کسی وقت بھی گر سکتی ہے

پ پانی، جو کبھی کبھی بے وفائی کر سکتا ہے

ت تارے، جو امتحانی پرچے ملنے کے بعد نظر آتے ہیں

ٹ ٹونٹیاں، جو باتھ روم میں سیٹیاں بجاتی ہیں

ث ثمر، جو محنت پر ضرور ملتا ہے

ج جوتا، جو ہتھیار کے طور پر بھی استعمال ہو سکتا ہے

چ چوکیدار، جن سے اچھے تعلقات بے حد فائدہ مند ہیں

ح حقوق، جو صرف لڑکیوں کے ہوتے ہیں

خ خواب، جو انتظامیہ دکھاتی ہے

د دال، اُن کے میس کی جس میں چلاؤ کشتی

ڈ ڈر، جو کوئز کی صورت میں سر پر سوار رہتا ہے

ذ ذہانت، جو لڑکوں سے دور بھاگتی ہے

ر رٹا، جو سیشنلز میں اچھے نمبر لینے کا گُر ہے

ز زندگی، جو اوپر والوں کی پیاری، طلبہ کی خواری ہے

ژ ژالہ باری، جو کمرۂ امتحان میں بھی ہوتی ہے

س سیڑھیاں، جن پر سانپ پہرا دیتے ہیں

ش شرم، جو صرف مجھ میں ہے

ص صندوق، جس میں چندہ بھی جمع ہو سکتا ہے

ض ضروری، جو سَر کے کمرے کے گرد چکر لگانا ہوتا ہے

ط طبیعت، جو پڑھائی کے علاوہ ہر چیز پر مائل ہوتی ہے

ظ ظلم، جو کورس کی شکل میں ڈھایا جاتا ہے

ع عہدہ، جو اچانک تبدیل ہو سکتا ہے

غ غربت، جو مہینے کے آخر پہ چھا جاتی ہے

ف فٹ بال، جو نسٹ کا قومی کھیل ہے

ق قطاریں، جو اسائنمنٹس کی ہوتی ہیں

ک کچن، جسے نہ دیکھنے میں ہی بھلائی ہے

گ گاڑی، جو چھوٹ جائے تو نہیں ملتی

ل لائبریری، ہے خبر گرم جس کے بننے کی

م موج میلہ، جس کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں

ن نوکری، جو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی

و واٹر کولر، جو ہمیشہ بغیر گلاس کے ہوتے ہیں

ہ ہدایات، جن پر عمل نہ کرنا کئی طلبہ فرض سمجھتے ہیں

ی یادِ ماضی، جو عذاب ہے!

جہاں میرے نبیؐ کا آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے
(امام دین گجراتی)

اے رات! مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے
(تنویر سپرا)

ایک مدّت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
مَیں نے اِک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے
(عباس تابش)

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دُور
اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا
(عبث چنگیزی)

ایک معصوم سا پرندہ بھی
اپنی جاگیر میں شکاری ہے
(انجم خیالی)

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام میں وہ ہیں جو تکلف نہیں کرتے
(ذوق)

اتفاق اپنی جگہ، خوش قسمتی اپنی جگہ
خود بناتا ہے جہاں میں آدمی اپنی جگہ
(انور شعور)

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ مَیں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے
(چکبست)

کچھ لوگ جو سوار ہیں کاغذ کی ناؤ پر
تہمت تراشتے ہیں، ہوا کے دباؤ پر
(احسان دانش)

بات کردار کی ہوتی ہے وگرنہ عارف
قد میں انسان سے سایہ بھی بڑا ہوتا ہے
(راشد عارف)

بھیجتا رہتا ہوں اخباروں میں اکثر اشعار
کوئی تو شعر مرا تیری نظر سے گزرے
(ارشد ساحل)

مرے نطق کی جب چلی آندھیاں
سماعت کے خیمے اُکھڑ جائیں گے
(شورعلیگ)

تم آتشِ نمرود سے واقف نہیں سعدی
اس آگ میں کھلتے ہیں گلاب اورطرح کے
(ڈاکٹر سعید اقبال سعدی)

جو ہاتھ جوڑ کر، جھک کر سلام کرتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں جو قتلِ عام کرتے ہیں
(ذرّہ حیدآبادی)

خدائے ارض! مَیں بیٹی کے خواب کات سکوں
تُو میرے کھیت میں اتنی کپاس رہنے دے
(شہزادنیّر)

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طولِ شَبِ فراق ذرا ناپ دیجئے
(اکبرالٰہ آبادی)

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لئے
(صادق حسین کاظمی)

میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشہ نہ بنے
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں
(اختر شمار)

رنگوں کے اہتمام میں صورت بگڑ گئی
لفظوں کی دُھن میں ہاتھ سے معنی نکل گئے
(کمار پاشی)

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا
(احمد ندیم قاسمی)

اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگِ مرمر پر چلو گے تو پھسل جاؤ گے
(اقبال عظیم)

ساحل کی بشارت ہے اُسی شخص کے لب پر
کشتی کو جو طوفاں سے نکلنے نہیں دیتا
(ڈاکٹر انعام الحق جاوید)

سیرت نہ ہو تو عارض و رخسار سب غلَط
خوشبو اُڑی تو پھول فقط رنگ رہ گیا
(ظہیر کاشمیری)

شہر میں آکر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا
(اسلم کولسری)

شہر میں وہ معتبر میری گواہی سے ہُوا
پھر مجھے اس شہر میں نا معتبر اس نے کیا
(منیر نیازی)

خواہشیں دل کا ساتھ چھوڑ گئیں
یہ اذیت بڑی اذیت ہے
(جون عیلیا)

ایک ایسا شخص دائم سفر میں رہتا ہے
جو قید اپنے ہی دیوار و در میں رہتا ہے
(مشفق خواجہ)

غموں کی دھوپ میں برگد کی چھاؤں جیسی ہے
مرے لئے میری ہمشیر ماؤں جیسی ہے
(احمد ندیم اویس)

فصیلِ شہر میں پیدا کیا ہے درمَیں نے
کسی بھی بابِ رعایت سے مَیں نہیں آیا
(سحر انصاری)

قیس جنگل میں اکیلا ہے، مجھے جانے دو
خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو
(میاں داد خان سیاح)

کہنے کو یوں جہاں میں ہزاروں ہیں یار دوست
مشکل کے وقت ایک ہے پروردگار دوست
(مظفر علی اسیر)

کچھ نہ کچھ سچائی ہوتی ہے نہاں ہر بات میں
کہنے والے ٹھیک کہتے ہیں سبھی اپنی جگہ
(نسیم دہلوی)

کون سی بات کہاں کیسے کہی جاتی ہے
یہ سلیقہ ہو تو ہر بات سنی جاتی ہے
(وسیم بریلوی)

لڑکے ہیں اپنے باپ کی جاگیر کے رقیب
وہ گھر بھی کوئی گھر ہے، جہاں لڑکیاں نہ ہوں
(بشیر بدر)

مٹھیوں میں خاک لے کر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے
(ثاقب لکھنوی)

بھائی! خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند چاٹ لی تیری بیاض نے
(سخن نافہم)

n-mail

n-mail (نسٹیئن میل) مستقل سلسلہ ہے
اِس میں آپ بھی میل کر سکتے ہیں مگر بلیک میل نہیں

فاطمہ ہوسٹل میں آنکھوں دیکھی

محاورہ لڑائی

الف: تم یہاں بیٹھی کیا مکھیاں مار رہی ہو؟

ب: بیٹھی ہوں، تمہاری طرح آفت کا پرکالا بن کر گھوم تو نہیں رہی ؟

الف: بس بس اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو!

ب: جاؤ جاؤ ! یہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔

الف: اور تم اندھوں میں کانا راجہ بننے کے خواب نہ دیکھو۔

ب: بھئی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ تم سے تو آنکھ بچانا ہی بہتر ہے!

الف: اچھا اچھا! اوروں کو نصیحت، اپنے تئیں فضیحت۔

ب: ارے! یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

الف: بالکل! اگر مَیں نے تمہیں چھٹی کا دودھ نہ یاد دلایا تو کہنا!

ب: میں نے بھی تمہارے چھکے نہ چھڑا دئے تو میرا نام بدل دینا۔

الف: ارے! تم نے تو بات کا بتنگڑ بنا لیا۔

ب: لیکن بُھس میں انگاری تو تم نے ڈالی تھی۔

الف: میں نے؟ کیا بے پر کی اُڑا رہی ہو! پہلے تم نے ہی بات بڑھائی ہے۔ بادلِ نخواستہ مجھے بھی بہادری کے جوہر دکھانا پڑے کیونکہ بھیگی بلی بننا میری شان کے خلاف ہے۔

ب: ارے میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ فساد کی جڑ فقط تم ہو۔

الف: تم سفید جھوٹ بول کر میری چھاتی پر مونگ دل رہی ہو کیا ؟

ب: پہلے تو تُرکی بہ تُرکی جواب دئے اور اب ٹسوے بہا رہی ہو!

الف: اچھا میں ہاری تم جیتیں۔

اتنے میں ''ریکٹر'' کچھا پیکی افواہ پھیلی، تو سب نو دو گیارہ ہو گئے !

رپورٹ: سٹاف رپورٹر

آپ بیتی

اپنے دفتر کی میز سے مَیں نے
سخت مصروفیت کے عالَم میں
سر اٹھا کر جب اس کے چہرے پر
سرسری سی نگاہ دوڑائی
ایک ''روشن خیال'' سی لڑکی
لمبے لمبے سے بال تھے جس کے
اور آنکھوں پہ کالا چشمہ تھا
بس! عجیب و غریب صورت تھی
اس عزیزہ سے باادب ہو کر
میں نے پوچھا کہ آپ کی تعریف؟
اس سے پہلے بھی آپ کو شاید
ویسے دیکھا تو ہے یہیں مَیں نے
آپ کا نام شاہدہ تو نہیں؟
کچھ جھجک کر یہ مجھ سے فرمایا
انٹروڈکشن میرا نہیں یہ جناب!
رانگ نمبر ملا رہے ہیں آپ
شاہدہ تو نہیں، مَیں شاہد ہوں
ڈسکو سوسائٹی کا قائد ہوں

کانوں سُنی

نوجواں آفس میں اک دِن آ گئے
مجلسِ جغرافیہ کی عہدہ داری کے لیے
دے رہے تھے وہ سوالوں کے جو ماشاء اللہ جواب
باقی آئندہ سہی، سن لیجئے دو انکشاف
مارکو پولو کی بابت تم کو کیا معلوم ہے؟
''کھیل پولو کا اسی کے نام سے موسوم ہے!''
ہے رواں دنیا کے کس خطے میں دریائے مَرے؟
''پیارے پاکستان میں کوہِ مری سے کچھ پرے!''

ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

ایک استادِ محترم نے نام نہ چھاپنے کی شرط پر یو ای ٹی لاہور میں
اپنے زمانۂ طالب علمی کی منظوم خواہش بیان کی

کدھر ہیں بے سہاروں کے ٹھکانے، ہم بھی دیکھیں گے
ہوئے ہیں لوگ آخر کیوں دوانے، ہم بھی دیکھیں گے

کہاں تک سچ نکلتے ہیں فسانے، ہم بھی دیکھیں گے
ترے کوچے کو ''سروے'' کے بہانے، ہم بھی دیکھیں گے

رعایت بجلی والے کو ہے ''میٹر'' دیکھنے آئے
نجومی کو بھی ''پرمٹ'' ہے، مقدّر دیکھنے آئے

''مکینک'' کو اجازت ہے کہ موٹر دیکھنے آئے
خطا کیا ہم نے کی ظالم نہ جانے! ہم بھی دیکھیں گے

ترے کوچے کو ''سروے'' کے بہانے ہم بھی دیکھیں گے
''فرنٹیئر'' میں بجلی گھر ہیں جو پانی سے چلتے ہیں

''مغل پورہ'' سے لوکو ''انجن'' اب بن کر نکلتے ہیں
سُنا ہے تیرے کوچے میں نئے فرہاد ڈھلتے ہیں

اگر سچ ہے تو ایسے ''کارخانے'' ہم بھی دیکھیں گے
ترے کوچے کو ''سروے'' کے بہانے ہم بھی دیکھیں گے

''پولس'' بھی ان کے ''فے ور'' میں ہے دنیا کا چلن دیکھو
لگا ہے بورڈ اک یہ خطۂ خاموش ہے لوگو!

ترے کوچے کو ''سروے'' کے بہانے ہم بھی دیکھیں گے
کدھر ہیں بے سہاروں کے ٹھکانے، ہم بھی دیکھیں گے

شاعروں کی عدالت میں

◄ شیخِ جامعہ: ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
◄ فیکلٹی: کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
◄ شاگرد: ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
◄ نصاب: شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
◄ پہلا سمسٹر: ہم سا ہو تو سامنے آئے
◄ آخری سمسٹر: وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی
◄ امتحان: کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور
◄ رزلٹ: خوب آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
◄ فیسٹیول: ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
◄ نوٹس بورڈ: اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
◄ جرمانہ: اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں
◄ شفا خانہ: کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا
◄ دفترِ خزانہ: مشکلیں ''سب'' پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں
◄ آڈٹ: کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
◄ امیرِ انتظامیہ: ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے
◄ نائب امیر: عمر گزری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
◄ معاون امیر: نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
◄ ایم ٹی او: اپنے بھی خفا مجھ سے، بیگانے بھی ناخوش
◄ دفترِ روزگار: جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار
◄ تنظیمِ نَو: مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا
◄ سیکیورٹی: راستے بند کئے دیتے ہو دیوانوں کے
دیکھنا ڈھیر نہ لگ جائیں گریبانوں کے

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے